MAUR403CCT

مطالعاتِ مولانا ابوالکلام آزاد

ایم۔اے۔اردو

(چوتھا سمسٹر)

پندرہواں پرچہ

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔500032، تلنگانہ، بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course : Mutalaat-e-Maulana Abul Kalam Azad

ISBN: 978-81-975411-1-7

First Edition : **June, 2024**

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2024
Copies	:	3500
Price	:	300/- (The price of the book is included in admission fees of distance mode students)
Copy Editing	:	Dr. Md Nehal Afroz, DDE, MANUU
Cover Designing	:	Dr. Mohd. Akmal Khan, DDE, MANUU
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Mutalaat-e-Maulana Abul Kalam Azad

Paper XV

For M.A. Urdu 4th Semester

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Distance Education

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), India

Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in

Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission from the publisher (registrar@manuu.edu.in)

مدیر و پروگرام کوآرڈی نیٹر

پروفیسر نکہت جہاں

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مجلس اِدارت

پروفیسر نکہت جہاں

پروفیسر، اردو

نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس

سابق صدر، شعبہ اردو

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین

سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر محمد نہال افروز

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد اکمل خان

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد جعفر

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

کورس کوآرڈی نیٹر

پروفیسر نکہت جہاں، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر احمد، پی۔جی۔ٹی۔ مانوماڈل اسکول، فلک نما، حیدرآباد	اکائی 1,3
پروفیسر اے۔جی۔ خان، سابق صدر شعبہ انگریزی، باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑا یونیورسٹی، اورنگ آباد	اکائی 2
ڈاکٹر محمد جعفر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 4
ڈاکٹر محمد نہال افروز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 5
ڈاکٹر شکیل احمد، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، سری نگر کیمپس	اکائی 6
پروفیسر طلعت عزیز، سابق صدر، شعبہ تعلیم وتربیت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	اکائی 7
ڈاکٹر محمد اختر، شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 8
جناب محمد عاصم، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 9
پروفیسر شہزاد انجم، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	اکائی 10 , 11
ڈاکٹر شمس الحق، شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس	اکائی 12
ڈاکٹر فیضان احمد، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی	اکائی 13
پروفیسر علاالدین خان، شعبہ تاریخ، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ، اترپردیش	اکائی 14
پروفیسر روحی فاطمہ، شعبہ تعلیم وتربیت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	اکائی 15
پروفیسر نکہت جہاں، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 16

فہرست

پیغام	وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	07
پیغام	ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو	08
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	09

بلاک I : مولانا آزاد: سوانح اور شخصیت

اکائی1۔ مولانا آزاد کے حالات زندگی	11
اکائی2۔ تذکرہ کا مطالعہ	33
اکائی3۔ مولانا آزاد معاصرین کی نظر میں	57
اکائی4۔ مولانا آزاد کا عہد	76

بلاکII : مولانا آزاد کے افکار

اکائی5۔ مولانا آزاد کے سیاسی تصورات	92
اکائی6۔ مولانا آزاد کے مذہبی تصورات (ترجمان القرآن کے حوالے سے)	109
اکائی7۔ مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات	127
اکائی8۔ مولانا آزاد کے فنون لطیفہ سے متعلق تصورات	144

بلاک III : مولانا آزاد کی صحافتی وادبی خدمات

اکائی9۔ مولانا آزاد کی صحافتی خدمات (الہلال، البلاغ کے حوالے سے)	166
اکائی10۔ مولانا آزاد کی ادبی خدمات (غبار خاطر کے حوالے سے)	182
اکائی11۔ مولانا آزاد کی شاعری	199

اکائی12۔ مولانا آزاد کی خطابت (قول فیصل کے حوالے سے) 213

بلاک IV : مولانا آزاد کی سیاسی خدمات: آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد

اکائی13۔ جدوجہد آزادی میں مولانا آزاد کا حصہ 234

اکائی14۔ مولانا آزاد اور متحدہ قومیت 252

اکائی15۔ مولانا آزاد بحیثیت وزیر تعلیم 267

اکائی16۔ مولانا آزاد کے قائم کردہ ادارے 281

نمونہ امتحانی پرچہ 297

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔(1)اردو زبان کی ترویج و ترقی(2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی(3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور(4)تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرداور ممتازبناتے ہیں۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کاواحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کادامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کردیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند "ادبی" اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔یہی کیفیت اکثررسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اُردو قاری اور اُردو سماج دورحاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے ،یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کردی ہے۔یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پرشروع ہو چکاہے۔ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی پچیسویں سالگرہ منا رہی ہے مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامت فاصلاتی تعلیم از سر نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامت فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہورہے ہیں۔گر چہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورت حال کے باعث انتظامی امو راورترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامت فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر،مانو

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہورہے ہیں۔مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈِویژن سے ہوا اوراس کے بعد 2004میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈِویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔اس وقت کے اربابِ مجازکے بھر پور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ڈی ای بی UGC-DEBاس بات پر زور دیتارہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کما حقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیاجائے۔چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے ،لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یوجی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی موادSLMاز سرِ نوبالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جارہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یوجی،پی جی،بی ایڈ،ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلارہا ہے۔بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔متعلمین کی سہولت کے لیے 9علاقائی مراکزبنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگراور 6ذیلی علاقائی مراکزحیدرآباد، لکھنؤ، جموں ، نوح، وارانسی اور امراوتی کاایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ان مراکز کے تحت سرِ دست144 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centers) نیز 20پروگرام سنٹرس (Programme Centers)کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کردیا ہے ،نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ویڈیو ریکارڈنگ کالنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس(SMS) کی سہولت فراہم کی جارہی ہے ،جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوئوں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات ،کونسلنگ ،امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتاہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اورمعاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہو گا۔

پروفیسر محمد رضاء اللہ خان
ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم،مانو

کورس کا تعارف

زبان انسانی خیالات وجذبات کے اظہار کا موثر وسیلہ اور معاشرتی عمل ہے۔اس کے ذریعے انسان اپنا مافی الضمیر واضح کرتا ہے اوریہی انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔زندگی کی دلکشی اور رنگینی زبان کی بدولت ہے۔ہندوستانی زبانوں کی فہرست میں اردو کا نمایاں اور تاریخی مقام ہے۔اگر چہ اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی تاہم اس کی وسعت اور بین الاقوامی حیثیت کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں اسے بولا اور سمجھا جا رہا ہے اور کئی یونیورسٹیوں میں باقاعدہ اسے پڑھایا جارہا ہے۔عالمی سطح پر اردو گیارہویں نمبر پر بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔اردو کا پیرایہ اظہار خوش گوار نزاکت کا آئینہ دار ہے۔اردو کا لہجہ دل آویز اور شیرینی کا شاہ کار ہے۔یہ زبان ان چند زبانوں میں سے ایک ہے ،جو اپنے اندر تمام انسانی آوازوں کی بہ خوبی ادائیگی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بھی زبان کو روزمرہ کے کام تک ہی محدود رکھنا کافی نہیں ہوتا۔بول چال کے علاوہ اس کا لکھنا، پڑھنا اور اس میں موجود ادب سے واقف ہونا بھی از حد ضروری ہے۔ تخلیقی اعتبار سے ادب کی مختلف نوعیتیں ہیں،جہاں ادب شخصیت کو سنوارنے اور نکھارنے کا فریضہ انجام دیتا ہے وہیں اپنے قاری کو مسرت سے بصیرت تک پہنچانے کا سامان بھی مہیا کرتا ہے اور سب سے اہم درس وتدریس کی دنیا میں طلبا کی تربیت اور معلومات کی ترسیل کا بھی اہم وسیلہ ہے۔اسی مقصدکے تحت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کی تعلیمی ضرورت کو پورا نے کے لیے نصابی کتابوں کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن(UGC) کی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے تا کہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبا کا تعلیمی معیار یکساں ہو بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں طلبہ کے لیے دوران تعلیم ایک نظامِ تعلیم سے دوسرے نظامِ تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

یوجی سی کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نظامت فاصلاتی تعلیم ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے تمام مضامین میں نصابی کتابوں کی تخلیق و اشاعت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ان کتابوں کی تیاری میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ یہ اکتسابی مواد نہ صرف معیاری اور ہمہ گیر ہو بلکہ مضمون کے تمام اہم موضوعات کی نمائندگی بھی کرتا ہو اور مسابقتی امتحانات کی تیاری کے لیے معاون و مددگار بھی ہو سکے۔

ایم۔اے اردو کا یہ کورس چار سمسٹرز پر محیط ہے۔ہر سمسٹر میں چار، چار پرچے ہیں۔سب ہی پرچوں میں چار بلاک ہیں ،جنہیں سولہ اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے تحت موضوع سے متعلق تمام ضروری معلومات آپ تک پہنچانے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔ہر سمسٹر میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے طلبا کو چاروں پرچوں کے امتحانات دینے کے علاوہ تفویضات کی تکمیل بھی لازمی طور پر کرنا ہے، تبھی وہ اس کورس میں کامیاب قرار دیے جائیں گے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم ایم۔اے اردو کے پندرہویں پرچے کی یہ کتاب پیش کر رہے ہیں، جس کا عنوان"مطالعاتِ مولانا ابوالکلام آزاد" ہے۔طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ فراہم کردہ نصابی کتابوں کے علاوہ جہاں تک ممکن ہو سکے تجویز کردہ کتابوں اور مشاورتی جماعتوں سے بھی بھرپور استفادہ کریں گے۔

پروفیسر نکہت جہاں
کورس کو آرڈی نیٹر

مطالعاتِ مولانا ابوالکلام آزاد

بلاک I : مولانا آزاد: سوانح اور شخصیت

اکائی 1 :مولانا آزاد کے حالاتِ زندگی

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 مولانا ابولکلام آزاد کا خاندانی پس منظر

1.2.1 مولانا آزاد کا خاندان

1.2.2 مولانا آزاد کے والدین

1.3 مولانا آزاد کی ولادت اور ابتدائی حالات

1.3.1 مولانا آزاد کی پیدائش

1.3.2 مولانا آزاد کا بچپن

1.3.3 تعلیم وتربیت

1.3.4 انگریزی فرنچ اور ترکی کی تعلیم

1.3.5 مولانا آزاد کے عزیز واقارب

1.4 مولانا آزاد کی ازدواجی زندگی

1.4.1 مولانا آزاد کی اہلیہ

1.4.2 مولانا آزاد کی اولاد

1.5 مولانا ابوالکلام آزاد کے شوق

1.5.1 چائے نوشی

1.6 مولانا آزاد کی خودداری اور قناعت پسندی

1.7 مولانا آزاد کی ادبی اور صحافتی زندگی

1.7.1		مولانا آزاد کی صحافت
1.7.2		مولانا آزاد کی مکتوب نگاری
1.8		مولانا آزاد کی سیاسی زندگی
1.8.1		مولانا آزاد کی انقلابی سیاست
1.8.2		مولانا آزاد کی قومی سیاست میں شرکت اور نظر بندی
1.8.3		مولانا آزاداور گاندھی جی
1.8.4		مولانا آزاد اور متحدہ قومیت
1.10		مولانا آزاد کی علالت اور وفات
1.11		اکتسابی نتائج
1.12		کلیدی الفاظ
1.13		نمونہ امتحانی سوالات
1.13.1		معروضی جوابات کے حامل سوالات
1.13.2		مختصر جوابات کے حامل سوالات
1.13.3		طویل جوابات کے حامل سوالات
1.14		تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار ہندوستان کی ان چند نامور شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے افکار و نظریات اور سیاسی، سماجی اور معاشرتی خدمات سے ہماری قومی تحریک کو مہمیز کیا۔ وہ ایک جید عالم، شعلہ بیان مقرر، بے باک صحافی، صاحب نظر مجتہد، اعلیٰ مفسر، بلند پایہ مفکر، کہنہ مشق مدبر، دور اندیش سیاست داں، بہترین فلسفی، صاحبِ فکر انشاپرداز، عمدہ ادیب، اچھے مدبر، بہترین ماہرِ تعلیم و قومی یکجہتی کے علمبردار اور کئی خداداد صلاحیتوں کے حامل عظیم قومی رہنما تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی سیاسی، سماجی، قومی اور ملکی سرگرمیوں پر اپنی قائدانہ صلاحیتوں کے انمٹ نقوش مرتب کیے ہیں۔ ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے انہوں نے ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی، قومی اتحاد، حب الوطنی، انسان دوستی، وطن پرستی اور ملکی تعمیر و ترقی میں اتنا اہم اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے جس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ آغاز شباب سے آخری لمحات تک وہ ملک کی تعمیر و ترقی اور قومی جدوجہد میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ اپنے ملکی، ملی اور قومی مشن کی خاطر اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ اگر یہ کہا جائے کہ مولانا آزاد کی داستانِ حیات ہماری قومی زندگی کی داستان اور ان کے افکار و خیالات کی ترجمان اور ان کے جذبات و احساسات کی آئینہ دار ہے تو بلاشبہ غلط نہیں ہوگا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے انگریزوں کی جابرانہ پالیسوں کے خلاف محاذ آرائی کی۔ ان کے ظلم وجور کے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک میں شامل رہے۔ قومی اور انقلابی سرگرمیوں کی پاداش میں وقفے وقفے سے قید میں ڈالے گئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کئی سال قید وبند کی صعوبتوں میں گزارے، مگر ان کے ہمت وحوصلے اور پایہ استقامت میں لغزش نہیں آئی اور بالآخر انھوں نے جنگ آزادی کے سالار بن کر انگریزوں کو ملک سے بے دخل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آزاد ہندوستان میں انھیں وزارتِ تعلیم کا شعبہ عطا کیا گیا۔ انہوں نے اپنے دورِ وزارت میں کئی اہم قومی اداروں کی بنیاد ڈالی۔ تہذیبی اور ثقافتی تعلقات کی راہیں استوار کرتے ہوئے قومی معمار کا فریضہ انجام دیا۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مولانا آزاد کے خاندانی پس منظر سے واقف ہو سکیں۔
- مولانا آزاد کے حالاتِ زندگی کو بیان کر سکیں۔
- مولانا آزاد کی علمی کاوشوں کا جائزہ لے سکیں۔
- مولانا آزاد کے افکار وخیالات سے روشناس ہو سکیں۔
- مولانا آزاد کے صحافتی کردار کو جان سکیں۔
- مولانا آزاد کی سیاسی زندگی پر روشنی ڈال سکیں۔
- مولانا ابوالکلام آزاد کی ملکی، ملی اور قومی خدمات کا جائزہ لے سکیں۔

1.2 مولانا آزاد کا خاندانی پس منظر

1.2.1 مولانا آزاد کا خاندان:

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے آبا و اجداد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے اجداد مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر کے دور (1526-1530) میں ہرات سے ہندوستان تشریف لائے۔ کچھ دنوں تک ان کے اجداد نے آگرہ میں قیام کیا اور پھر یہاں سے دہلی منتقل ہو گئے اور یہیں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کی۔ مولانا نے اپنے بزرگوں میں اکبر کے زمانے میں مولانا جمال الدین اور شاہ جہان کے زمانے میں محمد ہادی کا ذکر کیا ہے۔ مولانا آزاد کے دادا مولانا محمد ہادی ابنِ شاہ محمد افضل ابن مولانا محمد حسن ابنِ محمد حسن کا سلسلۂ نسب مولانا جمال الدین جو شیخ بہلول دہلوی کے نام سے مشہور تھے ملتا ہے۔ مولانا جمال الدین کے فرزند شیخ محمد حضرت شیخ احمد سرہندی کے مرید تھے۔ یہ مغل بادشاہ اکبر کے ہم عصر تھے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے عہد کے ان منفرد علما میں سے تھے جنھوں نے بادشاہ اکبر کے دینِ الٰہی کی مخالفت کی تھی اور اکبر کے امامِ وقت ہونے کے محضر نامہ پر دستخط نہیں کیے تھے۔ انھوں نے اپنے والد کی طرح ہی مغل بادشاہ جہانگیر کے دربار مین حاضری بھی نہیں دی تھی۔ چناں چہ شہنشاہ کے فرمان کی حکم عدولی کی پاداش میں انہیں گوالیر کے قلعہ میں قید کر

دیا گیا تھا۔ مولانا آزاد نے اپنے ننہالی خانوادے کے بارے میں لکھا ہے کہ مولانا منور الدین اُن کے والد کے نانا تھے جو مغل دربار سے وابستہ تھے۔ انہیں دربار سے "رکن المدرسین" کا خطاب ملا تھا۔ مولانا منور الدین ضلع لاہور کے قصبہ قصور کے رہنے والے تھے۔ مولانا آزاد کے مطابق حصول علم کے جذبے اور شاہ عبدالعزیز کی شاگردی کے شوق نے مولانا منور الدین کو گھر بار چھوڑ کر دہلی کا رخ کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ انہوں نے قصور سے دہلی تک کا سفر پیدل طے کیا۔ دہلی پہنچ کر شاہ عبدالعزیز صاحب کے تلامذہ مفتی صدرالدین اور مولوی رشید الدین کے ساتھ حلقہ درس میں شامل ہوگئے۔ چند سالوں بعد انھوں نے اپنے مربی کے ایما پر دہلی میں شادی کرلی اور یہیں مقیم ہوگئے۔

حصولِ تعلیم کے بعد وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ جانا چاہتے تھے۔ 1855 میں وہ دہلی سے حجازِ مقدس کے لیے روانہ بھی ہوئے، لیکن والیٔ بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم نے انہیں روک لیا چناں چہ وہ دربارِ عالیہ سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے وقت مولانا منور الدین بھوپال کی نواب سلطان جہاں بیگم کے دربار سے وابستہ تھے۔ 1859ء میں بیگم بھوپال سے اجازت لے کر ارض مقدس کی زیارت کے ارادے سے بھوپال سے بمبئ (موجودہ ممبئ) کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ ان کے کچھ ارادت مند بھی تھے۔ وہاں پہنچتے ہی سخت بیمار پڑ گئے۔ اپنے مریدوں اور مداحوں کے اصرار پر وہیں ٹھہر گئے اور کچھ ہی دنوں بعد 1858-1859 عیسوی میں بمبئ میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

1.2.2 مولانا آزاد کے والدین:

مولانا آزاد کے والد کا نام مولانا خیر الدین تھا۔ وہ 1831ء میں دلی میں پیدا ہوئے ان کی کمسنی میں ہی اُن کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ چنانچہ مولانا خیر الدین کے نانا مولانا منور الدین نے اُن کی دیکھ ریکھ اور پرورش کی اور ان کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھا۔ وہ ہمیشہ انہیں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ارضِ مقدس کی طرف ہجرت کے وقت بھی مولانا خیر الدین ان کے ساتھ تھے۔ اس وقت ان کی عمر تقریبا پچیس سال تھی۔ بمبئ میں نانا کے انتقال کے باوجود انھوں نے اپنا ارادہ نہیں بدلا اور بالآخر 1860 میں وہ مکہ پہنچ گئے۔ وہیں پر انہوں نے مستقل سکونت اختیار کی۔ ارضِ حجاز میں ان کا قیام 29 سال رہا۔ انہوں نے مکہ مکرمہ میں اپنے لیے ایک مکان بنوایا اور درس و تدریس، تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ان کے احباب اور مریدین کا حلقہ وسیع ہوتا گیا۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ "میرے والد پوری اسلامی دنیا میں معروف ہو گئے جب مصر سے ان کی ایک کتاب شائع ہوئی جو عربی زبان میں تھی اور دس جلدوں میں لکھی گئی تھی۔" مولانا خیر الدین صاحبِ تصنیف عالم تھے۔ شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کا تخلص خیوریؔ تھا۔ مولانا خیر الدین نے کئی ممالک کے سفر کیے۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ ان کے والد "کئی بار بمبئ اور ایک مرتبہ کلکتہ آئے۔۔۔ عراق، ترکی اور شام کے بھی انہوں نے کئی دورے کیے" دوبارہ جب کلکتے آئے تو پھر واپس نہیں گئے۔ کلکتہ آنے کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن مولانا خیر الدین مکہ میں گر پڑے اور بائیں ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس وقت مکہ میں علاج و معالجہ کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ ڈاکر نے ہڈی جوڑی لیکن اس کی بندش ٹھیک نہیں ہوئی سخت تکلیف کا شکار رہے چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد 1887 میں وہ ہندوستان لوٹ آئے اور مستقل طور پر کلکتہ میں مقیم ہوگئے۔ یہاں علاج کرایا درد تو جاتا رہا، لیکن پاؤں پر زور نہیں دے سکتے تھے۔ بیساکھیوں کے سہارے چلتے تھے۔ بالآخر دہلی کے ایک ماہر جراح سے رابطہ کیا اس نے فصد

کھولی تب جا کر مکمل آرام ملا لیکن آخر عمر تک خفیف سا لنگ بر قرار رہا اور لکڑی کا سہارا لے کر چلنا پڑا۔ مولانا خیر الدین پیر تھے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ان کے بے شمار مرید تھے۔ 15 اگست 1908 کو مولوی خیر الدین کا کلکتہ میں انتقال ہو گیا۔ اس وقت مرحوم کی عمر تقریبا 74 برس تھی۔ مرحوم کو کلکتہ میں واقع مانک تلہ کے قبرستان میں اُن کی بیوی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

1.2.3 مولانا آزاد کی والدہ:

مولانا ابو الکلام آزاد کی والدہ عرب نژاد مذہبی خاتون تھیں۔ ان کے والدین صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے اور ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ مولانا آزاد کی والدہ نے وہاں رہتے ہوئے اتنی اردو سیکھ لی تھی کہ بات چیت کر سکیں۔ اُن کے ماموں شیخ محمد ظاہر وتری پایہ کے عالم تھے اور عرب دنیا میں اُن کی بہت شہرت تھی۔ مولانا آزاد کی والدہ 1887 میں اپنے شوہر کے ہمراہ ہندوستان آئیں اور ان کے ساتھ کلکتہ میں مقیم ہوئیں۔ 1899ء میں کلکتے میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ مانک تلہ کے قبرستان میں مدفون ہوئیں۔ مولانا خیر الدین نے ان کے مدفن پر ایک مقبرہ تعمیر کروایا تھا۔ اس مقبرے کا گنبد سنگ مرمر کا ہے، لیکن نیچے نہ کوئی بنیاد ہے اور نہ کوئی عمارت محض لوہے کی جالیوں کا گھیرا لگا ہے۔ اس مقبرے میں ایک اور قبر کی گنجائش رکھی گئی تھی جس میں بعد کو مولانا خیر الدین کو دفن کیا گیا تھا۔

1.3 مولانا آزاد کی ولادت اور ابتدائی حالات

1.3.1 مولانا آزاد کی پیدائش:

مولانا ابولکلام آزاد کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ اس وقت مولانا کے والد مکہ کے مشہور محلہ دار السلام میں قدوہ کے علاقہ میں رہائش پذیر تھے۔ مولانا آزاد نے اپنا سنہ ولادت 1888 مطابق ذوالحجہ 1305 ہجری بتایا ہے اور یہ بھی بتایا کہ ان کے والد نے ان کا نام "فیروز بخت" رکھا تھا۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے التذکرہ کے انگریزی ترجمہ میں جس کا اردو ترجمہ میر ولی الدین نے کیا ہے ان کی تاریخ پیدائش 11، نومبر 1888 درج کیا ہے۔ تمام سرکاری کاغذات میں یہی تاریخ رائج ہے۔

گرچہ مولانا کے والد نے ان کا تاریخی نام فیروز بخت رکھا تھا، لیکن انہوں نے اپنا یہ نام غالباً کبھی استعمال نہیں کیا۔ مختلف موقعوں پر انہوں نے اپنا نام مختلف انداز میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کیا ہے کہ مولانا نے 1900 میں اپنے دوست عبد الرزاق کانپوری کو خط لکھا اور اس میں اپنا نام غلام محی الدین آزاد لکھا۔ جنوری 1900ء کے خدنگ نظر لکھنو میں بھی ان کا یہی نام چھپا ہے۔ دو سال بعد مخزن میں ان کا نام "ابو الکلام محی الدین احمد آزاد چھپا۔ نومبر 1903ء میں مولانا نے ماہانہ "لسان الصدق" جاری کیا تو اس پر ایڈیٹر کی حیثیت سے اُن کا نام ابو الکلام آزاد دہلوی چھپا۔ 13 جولائی 1913ء کو ہفت روزہ الہلال" جاری ہوا تو اس پر مدیر مسئول اور محرر خصوص کے طور پر مولانا کا نام احمد المکی بابی الکلام آزاد الدہلوی چھپا پانچ سال بعد تذکرہ" میں احمد" ملتا ہے۔ مولانا کی ایک تصنیف رسالہ مسئلہ خلافت و جزیرہ عرب مطبوع ابلاغ پریس کلکتہ میں ان کا نام ابو الکام دیا گیا ہے نقش آزاد میں شامل خط 117 میں مولانا لکھتے ہیں۔ نام ابو الکلام آزاد... احمد سے لوگ آشنا نہیں گو نام وہی ہے" 1903ء میں جب مولانا کی ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی تو اس پر ان کا نام

ابوالکلام احمد چھپا تھا۔ غبار خاطر میں شامل خطوط مولانا نے 1932ء سے 1946ء کے درمیان لکھے ہیں۔ ان میں مکتوب نگار کی حیثیت سے مولانا نے اپنا نام "ابوالکلام لکھا ہے۔ مولانا مختلف اوقات میں اپنا نام مختلف طریقوں سے لکھتے رہے۔ لیکن ہندوستانی سیاست اور اردو ادب میں وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ہی سے مشہور ہوئے۔ یہی نام عرفِ عام میں مشہور ہے۔

1.3.2 مولانا آزاد کا بچپن:

مولانا کا لڑکپن یا یوں کہیں کہ ان کا بچپن عام بچوں سے یکسر مختلف تھا۔ جس عمر میں بچے کھیل کود اور تفریح میں لگے رہتے ہیں مولانا بڑی سنجیدگی سے تعلیم میں منہمک تھے۔ ان کو بچوں کے کھیل کود اور تفریحات سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ کلکتہ میں جنرل پوسٹ آفس کے سامنے جو ڈلہوزی اسکوائر تھا اور جسے لال ڈوگی کہا کرتے تھے، وہاں درختوں کا ایک ایسا جھنڈ تھا کہ باہر سے معلوم ہوتا ہے کہ بس درخت ہی درخت ہیں لیکن اندر کافی جگہ تھی۔ وہاں ایک بنچ تھی مولانا اتنے کم عمر تھے کہ جب سیر کو نکلتے تو ایک ملازم حافظ ولی اللہ ساتھ ہو جاتے۔ مولانا سیر کو جاتے ہوئے کتاب ساتھ لے لیتے اور ڈلہوزی اسکوائر کے درختوں کے اس جھنڈ میں بیٹھ کر کتاب کا مطالعہ کرتے۔ ملازم خاص حافظ ولی اللہ باہر پھرتے رہتے اور جھنجھلا جھنجھلا کر کہتے کہ اگر کتاب ہی پڑھنی تھی تو گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔

1.3.3 تعلیم و تربیت:

مولانا کی عمر تقریباً پانچ سال تھی، جب شیخ عبداللہ نامی ایک بزرگ نے حرم شریف میں ان کی بسم اللہ کی رسم ادا کی۔ ایک دو سال میں انھوں نے قرآن شریف ختم کر لیا تھا اور سورۃ یسین اور سورۂ قاف وغیرہ زبانی حفظ کر لیا۔ مولانا خیر الدین اپنے چاروں بچوں کو ایک ساتھ فارسی اور عربی پڑھاتے تھے۔ جب مولانا صاحب بہت مصروف ہو گئے تو دہلی کے ایک بزرگ مولوی محمد یعقوب نے مولانا آزاد اور اُن کے بھائی کو عربی اور منطق پڑھائی۔ فارسی اور فقہ بدستور والد پڑھاتے رہے۔ کچھ عرصے بعد مولانا خیر الدین اتنے بیمار ہوئے کہ بچوں کی تعلیم میں حرج ہونے لگا۔ انھوں نے مولوی عبدالحق خیر آبادی کے ایک شاگرد مولوی نذیر الحسن ایٹھوی کو بچوں کی تعلیم پر مقرر کیا، جنہوں نے مطول، شمس بازغہ اور رشیدیہ کی تعلیم دلوائی مولوی محمد ابراہیم، مولوی محمد عمر اور شمس العلما مولانا سعادت حسین نے بھی ان دونوں بھائیوں کو مختلف علوم کی تعلیم دی۔ درسِ نظامیہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔

مولانا کے والد نے فارسی اور عربی پر اتنی زیادہ توجہ دی کہ اُردو بالکل نظر انداز ہو گئی۔ مولانا نے اردو کی تعلیم حاصل کرنے کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مولانا کو اردو پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ مولانا کی اردو زبان کی تعلیم کا آغاز مکہ معظمہ میں ہو گیا تھا۔ کلکتہ پہنچنے پر انھوں نے اردو اپنی بڑی بہن آبرو بیگم سے گھر میں اور باہر حافظ بخاری سے پڑھی۔ ابتدا میں مولانا نے فسانہ عجائب باغ و بہار اور قصہ حاتم طائی جیسی داستانیں پڑھیں۔ مولانا کے ایک مرید محمد امین کو داستانوں کا بہت شوق تھا۔ وہ مولانا کو اُن کی فرمائش پر قصے سناتے۔ جب ان کا زبانی قصہ خوانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو انہوں نے چند قصے خرید کر لا دیے۔ کلکتہ کے رہنے والے محمد اکرام اللہ مولانا کے گھر آتے تھے، انھوں نے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول ملک العزیز ورجینا اور دیگر ناول لا کر دیے۔

1.3.4 انگریزی، فرنچ اور ترکی کی تعلیم:

مولانا آزاد کو 16 برس کی عمر میں سر سید کے مضامین پڑھنے کا موقع ملا۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں: اُس کے تھوڑے ہی دن بعد سر سید احمد خاں کے مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ جدید تعلیم کے بارے میں اُن کے خیالات کا میرے اوپر بہت اثر ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ جب تک کوئی شخص جدید سائنس، فلسفہ اور ادب کا اچھا مطالعہ نہ کرے وہ صحیح معنوں میں تعلیم حاصل نہیں کرتا۔ میں نے طے کیا کہ میرے لیے انگریزی پڑھنا ضروری ہے۔ مولوی محمد یوسف جعفری سے میں نے اس کا ذکر کیا. وہ اس زمانے میں مشرقی علوم کے صدر ممتحن تھے۔ انھوں نے مجھے انگریزی کی ابجد سکھائی اور پیارے چند سرکار کی پہلی کتاب پڑھنے کو دی۔ جیسے ہی مجھے زبان کی کچھ شدبدھ ہو گئی، میں نے انجیل پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے اُس کے انگریزی فارسی اور اُردو کے نسخے حاصل کیے اور تینوں کو سامنے رکھ کر پڑھتا تھا، اس سے مجھے عبارت کو سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ میں نے انگریزی لغت کی مدد سے اخبار (انگریزی) پڑھنا بھی شروع کر دیا اور بہت جلد اس قابل ہو گیا کہ انگریزی کتابیں پڑھ سکوں'' مولانا آزاد کو تاریخ اور فلسفہ جیسے مضامین سے خاص دلچسپی تھی۔ وہ بڑی محنت اور لگن سے انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔

مولانا آزاد کے انگریزی سیکھنے کے بارے میں چراغ حسن حسرت نے لکھا ہے: انگریزی انھوں نے علی پور جیل میں پڑھی تھی اور ان کے انگریزی پڑھنے کا بھی یہ حال تھا کہ کنگ پرائم کے چند صفحات سبقاً پڑھے اور چھوٹی موٹی کتابیں اور اخبار دیکھنے لگے تھوڑے عرصے میں ہی یہ کیفیت ہو گئی کہ انگریزی کی بڑی دقیق کتابیں پڑھنے اور اُن کا مطلب سمجھنے لگے تھے۔ مولانا آزاد کی انگریزی دانی کے بارے میں مہاد یو ڈیسائی نے لکھا ہے: اگرچہ آپ انگریزی کم بولتے ہیں، مگر آپ کی لائبریری انگریزی اور فرانسیسی کتابوں سے بھری ہوئی ہے۔ آپ نے کئی انگریزی شعرا جیسے ورڈزورتھ، شیلی گویٹے کے علاوہ اسپونوزا، روسو، مارکس، ہیولاک، ریلیس، ہیوگو، ٹالسٹائی اور رسکن وغیرہ کو بھی پڑھا تھا۔

مولانا 1908ء میں مصر اور وہاں سے ترکی اور فرانس گئے، وہاں انھوں نے دیکھا کہ ان تمام ملکوں میں لوگ فرانسیسی زبان زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھنی شروع کی۔ مولانا بلا کے ذہین تھے بہت جلد ہی اس قابل ہو گئے کہ فرانسیسی زبان کی کتابیں آسانی سے پڑھ سکیں۔ ان کی لائبریری میں ففرانسیسی زبان میں کئی کتابیں موجود تھیں۔

مولانا آزاد کو ترکی زبان کی شدبدھ تھی۔ طاہر بک نامی ایک ترک بمبئی آئے۔ ایک دن مسجد میں مولانا کی اُن سے ملاقات ہو گئی۔ انھیں اپنے گھر لے آئے۔ طاہر بک نے ساتھ آٹھ مہینے مولانا کے یہاں قیام کیا۔ اس دوران میں مولانا اور ان کے بھائی نے طاہر بک سے ترکی زبان سیکھنی شروع کر دی ۔ ان کے بھائی بڑی مستعدی سے پڑھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ترکی میں خاصی استعداد پیدا کر لی لیکن مولانا بہت زیادہ نہ پڑھ سکے۔

مولانا کا لڑکپن تھا۔ بارہ تیرہ سال عمر تھی۔ اس عمر میں بچے کھیل کود میں لگے رہتے ہیں لیکن مولانا کو کھیلوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ ان کی زندگی تو بس کتابیں تھیں شور وغل سے بچنے کے لیے وہ کتاب لے کر گوشہ تنہائی میں جا بیٹھتے۔ اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے

مولانا نے حبیب الرحمن شروانی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ کلکتے میں جنرل پوسٹ آفس کے سامنے جو ڈلہوزی اسکوائر تھا اور جسے لال ڈوگی کہا کرتے تھے، وہاں درختوں کا ایک ایسا جھنڈ تھا کہ باہر سے معلوم ہوتا ہے کہ بس درخت ہی درخت ہیں لیکن اندر کافی جگہ تھی۔ وہاں ایک بنچ تھی مولانا اتنے کم عمر تھے کہ جب سیر کو نکلتے تو ایک ملازم حافظ ولی اللہ ساتھ ہو جاتے۔ مولانا سیر کو جاتے ہوئے کتاب ساتھ لے لیتے اور ڈلہوزی اسکوائر کے درختوں کے اس جھنڈ میں بیٹھ کر کتاب کا مطالعہ کرتے۔ ملازم خاص حافظ ولی اللہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجھلا جھنجھلا کر کہتے کہ اگر کتاب ہی پڑھنی تھی تو گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔

1.3.5 مولانا آزاد کے عزیز و اقارب:

مولانا آزاد کے بھائی کا نام غلام یسین تھا، پورا نام ابو النصر غلام یٰسین آہؔ تھا، مولانا آزاد سے دو تین سال بڑے تھے۔ اچھے شاعر اور عمدہ نثر نگار تھے۔ شاعری میں مرزا داغ دہلوی سے اصلاح لیتے تھے۔ اس عہد کے اکثر معیاری رسالوں جیسے مخزن، زمانہ، مرقع عالم، خدنگ نظر وغیرہ میں ان کے کلام اور مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ ان کو عربی ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ اردو، فارسی اور انگریزی بہت اچھی جانتے تھے۔ تیراکی کے بھی شوقین تھے اور اس میں بہت اچھی مہارت رکھتے تھے۔ مولانا آزاد ایک دفعہ اپنے بھائی کے ہمراہ عراق بھی گئے تھے۔ آزاد بیمار پڑ کر ہندوستان لوٹ آئے جب کہ ان کے بھائی غلام یٰسین آہ ملکِ شام چلے گئے۔ جہاں وہ بیمار پڑ گئے۔ بڑی کسمپرسی کی حالت میں ہندوستان واپس آئے۔ چند ماہ بعد 1906ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی تین بہنیں تھیں سب سے بڑی بہن کا نام زینت بیگم تھا۔ قسطنطنیہ میں پیدا ہوئی تھیں اور عمر میں سب بھائی بہنوں سے بڑی تھیں۔ ان کا بہت کم عمری میں انتقال ہو گیا تھا۔ باقی دو بہنیں فاطمہ بیگم آرزوؔ اور حنیفہ بیگم آبروؔ تھیں، جو بعد میں اپنے ناموں کے بجائے اپنے تخلص سے زیادہ مشہور ہوئیں۔ مولانا خیر الدین نے اپنے دونوں صاحبزادوں اور دونوں صاحبزادیوں کی اچھی تربیت کی۔ وہ ان سب کو ایک ساتھ پڑھاتے تھے۔ مولانا آزاد کی دونوں بہنوں نے عربی، اردو اور فارسی اپنے والد سے سیکھی۔ فاطمہ بیگم جن کا تخلص آرزوؔ تھا، مولانا آزاد کی منجھلی بہن تھیں۔ اُن کے بارے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ ''چوں کہ ہم لوگ اس زمانے میں تعلیم میں مصروف تھے اور والد کی مشغولیت بہت بڑھ گئی تھی۔ ساتھ ہی بینائی میں ضعف بھی آ گیا تھا اس لیے ان کا جس قدر لکھنے پڑھنے کا کام تھا وہ ہماری منجھلی بہن آرزوؔ بیگم ہی کے سپرد ہو گیا تھا۔ چناں چہ تمام تصنیف و تالیف کے مسودے لکھنا ان کو صاف کرنا، خط و کتابت کرنا اور تمام باتیں اپنی شادی تک وہی کرتی رہیں۔ چوں کہ ہم سب میں حسن خط اور والد مرحوم کے خط سے مشابہہ ہونے کے اعتبار سے انہی کا خط سب سے بہتر تھا۔ اس لیے جو لوگ والد صاحب سے خط و کتابت کے عادی تھے وہ اس تبدیلی کے بعد بھی آخر تک محسوس نہ کر سکے کہ والد مرحوم کے خطوط کسی دوسرے قلم سے لکھے ہوئے ہیں، چنانچہ منجھلی بہن کو چوں کہ ہم لوگوں کے ساتھ پڑھنے کے بعد بھی سال ڈیڑھ سال تک مزید تعلیم کا موقع ملا، اس لیے انھوں نے حدیث و فقہ کی کتابیں بھی بہت حد تک ختم کیں۔'' آرزو بیگم کی شادی معین الدین عرب سے ہوئی تھی۔ 13 اپریل 1926ء کو بیاسی سال کی عمر میں بھوپال میں اُن کا انتقال ہوا۔ ان کے تخلص سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شعر و شاعری کا اچھا شغف رکھتی تھیں بلکہ شاعری بھی کرتی تھیں۔ مولانا آزاد کی یہ ہمشیرہ ان سے چار سال بڑی تھیں۔

مولانا آزاد کی تیسری بہن حنیفہ بیگم آبروؔ تھیں۔ یہ مکہ معظمہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی پہلی شادی کلکتہ کے احمد ابراہیم سے ہوئی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد دوسری شادی حکومت بھوپال کے سکریٹری واجد خاں سے ہوئی۔ آبرو بیگم "پرنس آف ویلیز لیڈیز کلب بھوپال کی آنریری سکریٹری تھیں۔ یہ کلب نواب سلطان جہاں بیگم نے بھوپال کی خواتین کی اصلاح اور ان کی تربیت کے لیے قائم کیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیڈیز کی ایک کانفرنس 1925ء میں علی گڑھ میں منعقد ہوئی۔ اس کے دسویں اجلاس میں انہوں نے جو تقریر کی تھی، وہ مطبع سلطانی ریاست بھوپال سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کانفرنس کی جانب سے بھوپال میں ایک نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا۔ اس نمائش کی روداد "روداد نمایش دستکاری خواتین بھوپال" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ روداد آبرو بیگم نے ہی تحریر کی تھی۔ آبرو بیگم مولانا کی بڑی غمخوار تھیں۔ ان کے بارے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ: اس زمانے میں صرف مجھ سے بڑی ہمشیرہ تنہا ایک عزیز تھیں، جو نہ صرف ہمدردی کرتیں بلکہ میرے خیالات سے بھی متفق تھیں۔ والد کی نظر پھر جانے کی وجہ سے اور سب بھی ناپسند کرتے تھے" جون 1943ء میں آبرو بیگم کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت مولانا آزاد احمد نگر کی جیل میں قید تھے۔

1.4 مولانا آزاد کی ازدواجی زندگی

1.4.1 مولانا آزاد کی اہلیہ:

1907 میں مولانا ابوالکلام آزاد کی عمر جب 19 برس کی ہوئی تو ان کی مولوی آفتاب الدین کی بیٹی زلیخا بیگم سے کر دی۔ مولوی آفتاب الدین بغداد کے رہنے والے ایک شریف خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ اس وقت کلکتہ میں مقیم تھے۔ آفتاب صاحب کے ہاں جب پانچویں لڑکی پیدا ہوئی تو انھوں نے بچی کو اپنے پیر و مرشد کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ مولانا خیر الدین نے اس بچی کو گود میں اُٹھایا اور اس کا نام زلیخا رکھا۔ یہی وہ زلیخا ہیں جو 1907ء میں مولانا کے عقد میں آئیں اور زلیخا بیگم کہلائیں۔ شادی کے وقت زلیخا بیگم کی عمر غالباً چھ یا آٹھ سال تھی۔ حمیدہ سلطان صاحبہ نے زلیخا بیگم کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ زلیخا بیگم کے بارے میں نہایت دلکش خاکہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ "نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں جٹی بھویں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ، یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لانبے بال، بوٹا سا قد، مائل بہ گداز دلاویز جسم، سفیدہ کالی کنی کی سوتی بایک ساری بے پروائی سے لپیٹے، مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لیے، میں نے اسی دنیا کی حور کو دیکھا ہے۔ یہ پاکیزہ ہستی حضرتِ یوسف والی زلیخا نہیں "یوسفِ ہندی" حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی رفیقۂ حیات زلیخا بیگم تھیں۔" اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی بڑے لوگوں کے کارنامے بیان کیے جاتے ہیں تو ان کی خانگی زندگی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی عائلی اور خاندانی زندگی کیسی تھی۔ ان کے گھریلو حالات کیسے تھے۔ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ان کا رویہ اور برتاؤ کیسا تھا اور گھر والوں کا معاملہ ان کے ساتھ کیسا تھا۔ مولانا آزاد کی ازدواجی زندگی نہایت پر سکون تھی انہیں ایک نہایت وفاشعار رفیقۂ حیات ملی جس نے مولانا کے ہر خیال کو سر آنکھوں پر رکھا۔ ہجر کی سختیاں جھیلیں، مالی مشکلات سہیں لیکن جبینِ الفت پر شکن نہیں آئی۔ کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا۔ حمیدہ سلطان زلیخا بیگم کے بارے میں کہتی ہیں کہ "وہ سلیقہ شعار بھی تھیں اور خانہ

داری کے امور سے بھی واقف، مہمان نواز بھی تھیں اور ہنس مکھ شیریں زباں بھی، سسرال والوں پر بھی جان چھڑکتی تھیں اور شوہر پر بھی فدا تھیں۔ "زلیخا بیگم کی علمی لیاقت کے بارے میں بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ آزاد بھون نئی دلی میں زلیخا بیگم کی ڈائری کے نام سے ایک ڈائری محفوظ ہے۔ اس میں زلیخا بیگم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظم اور اشعار ہیں۔ اگر یہ تحریریں ان ہی کی ہیں تو وہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں۔ گھر پر ہی انھوں نے تھوڑا بہت پڑھ لیا ہو گا۔

مولانا آزاد کی زندگی سیاست اور قید و بند میں اس طرح گھری ہوئی تھی کہ اُن کے پاس اپنی وفاشعار بیوی کی طرف توجہ کرنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ آزادی کی جد وجہد میں زلیخا بیگم کی قربانی کسی بھی مجاہد آزادی سے کم نہیں ہے۔ وہ اچھا کھاتیں نہ اچھا پہنتیں شوہر سے مسلسل جدائی، تنہائی اور مالی مشکلات نے اُن کی صحت خراب کر دی۔ ادھر مولانا کی سیاسی مصروفیات نے کبھی موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اپنی بیوی کی صحت کا خیال رکھ سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زلیخا بیگم دق جیسے موذی مرض کا شکار ہو گئیں۔ دو سال کی مسلسل بیماری کے بعد اُن کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ مولانا اس وقت احمد نگر جیل میں تھے جیل کے حکام نے مولانا سے کہا کہ اگر وہ درخواست دیں تو انھیں بیوی کو دیکھنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ مولانا کی غیرت اور حمیت نے یہ رعایت گوارا نہیں کی۔ 9؍اپریل 1943 کو زلیخا بیگم اپنے محبوب شوہر کی دیدار کی حسرت لیے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئیں۔ اپنی اس وفاشعار رفیقۂ حیات کی رفاقت کو یاد کر کے مولانا آزاد پر احمد نگر قلعہ میں ایک پرانی قبر کو دیکھ کر رقت طاری ہو جاتی تھی، جس کا ذکر انہوں نے نواب صدر یار جنگ کو لکھے گئے اپنے ایک مکتوب میں تفصیل سے کیا ہے۔

11؍اپریل 1943ء کو مولانا نے نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن شروانی کو خط لکھا اور اس میں اپنی اہلیہ کی وفات کا ذکر ان الفاظ اور اس کرب ناک انداز میں کیا کہ مولانا جیسے باوقار اور رکھ رکھاؤ کے انسان کی جذباتی کیفیت ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ خط خاصا طویل ہے لیکن اس خط کی اہمیت یہ ہے کہ مولانا نے غالباً پہلی اور آخری بار اپنے عائلی مسائل، ذہنی کرب اور روحانی کرب میں کسی کو شریک کیا۔ مولانا کے اس خط سے اُن کی اہلیہ کے آہنی عزم و حوصلے اور ان کی ہمت و استقامت کا بھی پتہ چلتا ہے مولانا لکھتے ہیں :

> "میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ 1941ء میں جب میں نینی جیل میں مقید تھا۔ تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویش خاطر کا موجب ہو گا، مجھے اطلاع نہیں دی گئی لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔ مجھے قید خانہ میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیل آب و ہوا کی ہوئی۔ اور وہ رانچی چلی گئی۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئی تو صحت کی رونق چہرہ پر واپس آرہی تھی۔ اس تمام زمانے میں میں زیادہ سفر میں رہا۔ وقت کے حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ کسی ایک منزل میں دم لینے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی۔ ایک منزل میں ابھی قدم پہنچا نہیں کہ دوسری منزل سامنے نمودار ہو گئی۔"

مولانا اپنی اہلیہ سے الوداعی سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی، جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی۔ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا؛ وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔''مولانا آزاد اور ان کی اہلیہ نے پوری زندگی قومی، ملی اور ملکی مشن کے لیے قربان کر دی۔

1.4.2 مولانا آزاد کی اولاد:

مولانا ابولکلام آزاد نے اپنے وارثین میں کسی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ البتہ وہ اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ ان کے ہاں صرف ایک لڑکے کی ولادت ہوئی تھی۔ چوں کہ ان کا یہ بیٹا بہت خوب صورت تھا اس لیے اس کا نام حسین رکھا تھا۔ محض چار سال کی عمر میں اُس بچے کا انتقال ہو گیا۔ یہ بچہ بھی غالباً مانک تلہ کے قبرستان میں مدفون ہے۔

1.5 مولانا ابوالکلام آزاد کے شوق

1.5.1 چائے نوشی:

مولانا آزاد کو چائے سے بڑی رغبت تھی۔ چائے بہت اہتمام سے پیتے تھے۔ وائٹ جیسمین انہیں زیادہ مرغوب تھی۔ جب وہ دستیاب نہیں ہوتی تو کوئی بھی عام چائے استعمال کر لیتے ۔ چائے میں دودھ نہیں ڈالتے تھے۔ مولانا نے غبار خاطر کے کئی خطوط میں چائے کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں: "شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چائے کے باب میں میرے بعض اختیارات ہیں، میں نے چائے کی لطافت و شیرینی کو تمباکو کی تندی و تلخی سے ترکیب دے کر ایک کیف مرتب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا ہوں۔ علمی اصطلاح میں اس صورت حال کو علی سبیل التوالی والتعاقب کہیے۔ اس طرح اس سلسلۂ عمل کی یہ کڑی چائے کے ایک گھونٹ اور سگریٹ کے ایک کش کے باہمی امتزاج سے بتدریج ڈھلتی جاتی ہے اور سلسلۂ کار دراز ہوتا رہتا ہے۔ مقدر کے حسن تناسب کا انضباط ملاحظہ ہو کہ ادھر فنجان آخری جرعے سے خالی ہوا، ادھر تمباکوے آتش زدہ نے سگرٹ کے آخری خط کشید تک پہنچ کر دم لیا۔ کیا کہوں، ان دو اجزائے تند و لطیف کی آمیزش سے کیف و سرور کا کیسا معتدل مزاج ترکیب پذیر ہو گیا ہے۔''

1.6 مولانا آزاد کی خودداری اور قناعت پسندی

مولانا بہت خود دار اور قناعت پسند انسان تھے۔ مالی حالت بہتر ہوتی تو عمدہ چیزیں استعمال کرتے اور اگر کبھی مالی مشکلات میں مبتلا ہوتے تو قناعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اُن کی باتوں اور چہرے سے ان کی تنگ دستی کا ہرگز اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ بہ بقول عبدالرزاق ملیح آبادی ''انہوں نے آنکھ کھولی تو سونے کا چمچہ منہ میں تھا۔ بہت بڑے پیر کے نورِ نظر تھے۔ دولت ہی دولت برستی تھی۔ ایسے آدمیوں کے لیے فقر و فاقہ دوسروں سے کہیں زیادہ مصیبت اور ذہنی اذیت کا سبب بن جاتا ہے، مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا

اس فقر وفاقہ میں بھی زیادہ سے زیادہ ہشاش بشاش رہتے تھے کبھی ان کے ماتھے پر بل نہیں دیکھا کبھی جھنجھلائے نہیں بلکہ ان خشک دنوں میں مولانا کی بشاشت اور ظرافت عروج پر پہنچ گئی تھی۔ ''مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مزید لکھتے ہیں کہ ''اُن دنوں میں مولانا کا ہاتھ اتنا تنگ تھا کہ دوپہر کو کھانے پر ارہر کی اُبالی دال اور بیچ نکلے ہوئے چاول ہوتے۔ اس بدمزہ کھانے کو مزے دار کرنے کے لیے مولانا فصاحت و بلاغت کا سہارا لیتے۔ ارہر کی دال کی پوری تاریخ بیان کر کے بتاتے کہ باقی دالوں پر اس دال کو کیوں فوقیت ہے۔ گھی نہ ہونے کی وجہ سے یہ دال بگھاری نہیں جاتی، اس لیے مولانا مختلف دلائل سے ثابت کرتے کہ اگر یہ دال بگھاری نہ جائے تو تندرستی کے لیے نہیں، زندگی کے لیے بھی گارنٹی ہے۔ بہ قول مولانا اگر یہ دال بگھار کر کھائیں تو اس کے خواص بدل جاتے ہیں اور یہ صحت کے لیے بہت نقصان دہ ہو جاتی ہے۔

مولانا بڑے مہمان نواز تھے جن دنوں تنگ دستی میں زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور آزاد سبحانی کلکتے آئے اور مولانا کے مہمان ہو گئے مولانا آزاد اور علی برادران میں سخت چشمک تھی لیکن جب بھی ان حضرات کی ملاقات ہوتی تو ایک دوسرے سے بڑی خنداں پیشانی سے ملتے۔ ان حضرات کی آمد سے مولانا ذہنی طور سے پریشان تو ہوئے۔ لیکن چہرے پر شگفتگی اور مسکراہٹ بہ دستور برقرار رہی۔ مولانا نے عبدالرزاق ملیح آبادی کو حاجی فقیر محمد پشاوری یا حاجی اللہ بخش پشاوری کے یہاں بھیج کر دو سو روپے قرض منگوائے اور علی برادران اور آزاد سبحانی کی پر تکلف کھانوں، شامی کبابوں اور رس گلوں سے ضیافت اور تواضع کی۔

مولانا اکثر مالی دشواریوں میں گرفتار رہتے۔ غیرت اور حمیت دست سوال دراز کرنے میں مانع رہتی۔ کلکتہ سے اخبار "دارالسلطنت" جاری ہونے والا تھا۔ اخبار کے مالک سے تقریباً تمام معاملات طے ہو چکے تھے۔ اخبار جاری ہونے میں کچھ عرصہ باقی تھا مولانا کو ڈھاکہ جانا تھا لیکن جیب خالی تھی۔ اخبار کے مالک سے ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ کا مطالبہ نہایت شائستگی اور خودداری سے کیا۔ دارالسلطنت کے مالک کو اپنی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ایک نہایت ضروری معاملہ ہے، جو اس وقت اس خط کے لکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اگر ضرورت متقاضی نہ ہوتی تو میری خودداری اس خط کو لکھنے میں سخت مانع آتی میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک ماہ کی تنخواہ متعلق اخبار مجھے اس وقت پیشگی دے دیں بشرطیکہ پیشگی دینے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ ڈھاکے سے واپسی پہ اخبار جاری ہو جائے گا اور انشاءاللہ پہلے ماہ میں یہ رقم وضع ہو جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں آپ کو عذر نہ ہو گا، بالخصوص ایسی حالت میں کہ یہ پیشگی رقم اس وقت میرے لیے ایک نہایت کارآمد اور بے حد مفید رقم ہے'' گرچہ مولانا کا تعلق ایک خوش حال خاندان سے تھا لیکن انھوں نے اپنے لیے جو راستہ اختیار کیا تھا اس میں تنگ دستی کے سوا کچھ نہ تھا۔ تنگ دستی کے باوجود انہوں نے اپنی خودداری برقرار رکھی۔

1.7 مولانا آزاد کی ادبی اور صحافتی زندگی

1.7.1 مولانا آزاد کی صحافت:

ابوالکلام آزاد کی زندگی کا بیشتر حصہ ادبی یا سیاسی صحافت کے میدان میں گزرا۔ انھوں نے متعدد رسالوں میں مضامین لکھے۔ کئی رسالوں میں مدیر یا نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا اور کئی ادبی اور سیاسی رسالے خود بھی جاری کیے۔ مولانا نے زندگی میں پہلا رسالہ ماہنامہ " نیرنگ عالم'' سنہ 1899ء میں جاری کیا۔ اس وقت مولانا کی عمر غالباً گیارہ سال تھی۔ نیرنگ عالم سات آٹھ مہینے بعد بند ہو گیا۔ 1900ء میں مولانا نے ہفت روزہ "المصباح" کی ادارت سنبھالی۔ یہ عید الفطر کے موقع پر شائع ہوا تھا۔ تین چار مہینے کے بعد یہ ہفت روزہ بند ہو

گیا۔ 1901ء میں کلکتہ سے احسن الاخبار نکالا۔ اس ہفت روزہ کے مالک اور اڈیٹر سید احمد حسن تھے لیکن اس کی ادارت کا بیشتر کام مولانا کے سپرد تھا۔ اس اخبار میں مولانا کے کئی مضامین بھی شائع ہوئے۔ یہاں مولانا کو ان عربی اخبارات اور رسائل کو پڑھنے کا موقع ملا، جو مصر، قسطنطنیہ، طرابلس اور تیونس سے شائع ہوتے تھے۔ ان اخبارات میں مصر کے "الہلال" اور "المنار" صحافت کے شاہکار نمونے تھے۔ جس کا انھوں نے کئی بار خود بھی اعتراف کیا ہے۔ جب مولانا نے اپنی زندگی کا اہم ترین ہفت روزہ نکالا تو اس کا نام "الہلال" رکھا۔ احسن الاخبار تقریباً دو سال جاری رہا۔

منشی نوبت رائے نظر نے 1897ء میں لکھنو سے ماہنامہ گلدستہ جاری کیا۔ اس میں مولانا آزاد، اُن کے بھائی یٰسین آہؔ اور دونوں بہنوں آبروؔ اور آرزوؔ بیگم کی غزلیں شائع ہوتی تھی۔ 1900ء میں خدنگ نظر میں مضامین بھی چھپنے شروع ہوئے۔ اس کے نثری حصے کی ترتیب مولانا آزاد کے ذمہ تھی۔

مولانا آزاد نے علامہ شبلی نعمانی کے ماہانہ الندوہ کی ادارت "کا کام بھی کیا۔ اس دوران میں مولانا ندوہ میں رہے۔ 1895 میں شیخ غلام احمد مصطفیٰ نے امرتسر سے ایک ہفت روزہ رسالہ "وکیل" جاری کیا۔ مولانا نے 1906 سے 1908ء کے دوران اس اخبار میں کام کیا تھا۔ ایک ہفت روزہ دارالسلطنت بھی تھا جس کے مالک عبدالہادی تھے۔ غالباً اُن کی وفات پر یہ رسالہ بند ہو گیا۔ 1906ء کے اوائل میں عبدالہادی کے صاحبزادے محمد یوسف نے یہ ہفت روزہ دوبارہ جاری کیا اور اس کی ادارت کی ذمہ داری مولانا آزاد کے سپرد کی۔ مولانا نے اس اخبار میں زیادہ عرصے کام نہیں کیا۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں ایک ہفت روزہ پیغام جاری ہوا۔ پہلا شمارہ 23 ستمبر 1921ء کو شائع ہوا۔ سرورق پر زیر نگرانی ابوالکلام آزاد لکھا ہوتا لیکن کچھ دن بعد یہ عبارت حذف ہونے لگی۔ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ غالباً اس کے بارہ تیرہ شمارے ہی شائع ہوئے تھے کہ مولانا آزاد اور عبدالرزاق ملیح آبادی گرفتار کر لیے گئے جس کی وجہ سے یہ رسالہ بند ہو گیا۔ اس کا آخری شمارہ 16 دسمبر 1921ء کو شائع ہوا۔ الجامعہ: عربی زبان میں شائع ہونے والا رسالہ تھا۔ اس کا پہلا شمارہ یکم اپریل 1923ء کو اور آخری شمارہ مارچ 1933ء میں شائع ہوا۔ اس کے مدیر عبدالرزاق ملیح آبادی اور مولانا ابوالکلام آزاد نگراں تھے۔ اس کا مقصد اتحاد اسلامی (پان اسلامزم) اور مشرق کا اتحاد تھا۔ مولانا نے 1927ء میں "پیام" کے نام سے ایک اور اخبار کلکتے سے جاری کیا تھا۔ اس کے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ ابو سلمان شاہ جہاں پوری کا خیال ہے کہ "پیام" جنوری 1926ء کے بعد نکلا اور جون 1927ء میں جب الہلال نکلا تو "پیام" بند ہو چکا تھا۔

مولانا نے مختلف اوقات میں تین ایسے رسالے جاری کیے جو ادبی نہیں تھے، بلکہ خاص مقصد کے تحت نکالے گئے تھے۔ یہ تین رسالے ہیں۔ ماہانہ لسان الصدق "ہفت روزہ "الہلال" اور پندرہ روزہ "البلاغ" تھے "لسان الصدق" سرسید کے تہذیب الاخلاق" کے انداز پر تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا پر سرسید کا گہرا اثر تھا، اس لیے جب تک "لسان الصدق" جاری رہا۔ مولانا سرسید کے مقاصد کے فروغ کے لیے مضامین لکھتے رہے۔ اگر کوئی سرسید کے خلاف کچھ لکھتا تو مولانا کو ناگوار گزرتا اور وہ سخت لفظوں میں اس کا جواب دیتے۔ ہفت روزہ "الھلال" اس زمانے میں نکالا گیا ہے جب مولانا کی فکر میں انقلاب پیدا ہو چکا ہے۔ اب وہ برطانوی حکومت کے حمایتی نہیں بلکہ سخت مخالف

تھے۔ "لسان الصدق" میں سیاسی تحریریں نہیں ہوتی تھیں۔ "الہلال" سیاست کے لیے وقف تھا۔ پندرہ روزہ "البلاغ" مولانا کے سیاسی اور انقلابی خیالات کا آئینہ دار تھا۔

ماہانہ "لسان الصدق کا پہلا شمارہ نومبر سنہ 1903ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت مولانا کی عمر تقریباً پندرہ سال تھی۔ اس رسالہ کے اولین شمارے کے پہلے صفحے اس کے اجرا کے چار مقاصد بیان کیے گئے تھے: (1) سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی سماجی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا (2) ترقی اردو یعنی اردو زبان و ادب کے دائرے کو خصوصاً بنگال میں وسیع کرنا۔ (3) دانشوروں میں علمی ذوق بیدار کرنا (4) تنقید یعنی اردو تصانیف کا درست، موزوں اور منصفانہ جائزہ لینا اور ان کا ریویو کرنا۔

1.7.2 مولانا آزاد کی مکتوب نگاری:

اردو زبان و ادب میں صاحبانِ کمال کے بڑی تعداد میں خطوط کے مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن ادبی نقطہ نظر سے مکتوب نگاری کی تاریخ میں غالب کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کا ہی نام لیا جاتا ہے۔ ان دونوں کے خطوط اور خطوط نگاری کی خصوصیات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ مولانا آزاد کے خطوط کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ تو خطوط ہیں جو مولانا نے ضرورتاً عام فہم اور سیدھی سادی زبان میں لکھے ہیں۔ ان میں ادبیت اور اشعار کا استعمال بہت کم کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس وہ خطوط ہیں جو غبار خاطر کی زینت ہیں، اُن کا انداز بالکل مختلف اور ادبی ہے۔ بہ قول خلیق انجم "یہ خطوط نہیں بلکہ مختلف موضوعات پر انشائیے ہیں۔ ان میں مولانا آزاد کے افکار کی سیاسی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

بقول خلیق انجم مولانا آزاد کے خطوط کا پہلا مجموعہ غبار خاطر" ہے، جسے اجمل خاں نے مرتب کر کے 1964ء میں شائع کیا۔ ہندوستان اور پاکستان میں اس کے بے شمار اڈیشن شائع ہوئے لیکن بعد کے اڈیشنوں میں مالک رام کا مرتبہ اڈیشن بڑی محنت دیدہ ریزی اور متنی تنقید کے جدید اصولوں کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ یہ اڈیشن 1967ء میں شائع ہوا تھا اور 1983ء میں اس کی دوبارہ اشاعت ہوئی۔

مولانا کے مکاتیب کا دوسرا مجموعہ "کاروانِ خیال" ہے جسے عبد الشاہد خاں شیروانی نے مرتب کر کے 1946ء میں شائع کیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے 1958 میں نقشِ آزاد کے نام سے مولانا کے خطوط کا مجموعہ شائع کیا۔ غلام رسول مہر نے مولانا آزاد کے خطوط کا ایک اور مجموعہ "تبرکات آزاد" کے نام سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی مولوی محی الدین قصوری، نیاز فتحپوری، خواجہ حسن نظامی اور دیگر حضرات کے نام خطوط شامل ہیں۔ پاکستان کے ابو سلمان شاہ جہاں پوری نے مختلف حضرات کے نام مولانا کے خطوط کا مجموعہ "مکاتیب ابوالکلام آزاد" کے نام سے 1968ء میں کراچی سے شائع کیا۔ ظہیر احمد خاں ظہیر نے اپنے دادا سردار محمد اکبر خاں کے نام مولانا آزاد کے خطوط کے ایک مختصر سا مجموعہ "نوادر ابوالکلام" کے نام سے مرتب کر کے پاکستان سے شائع کیا۔ پاکستان سے مکاتیب ابوالکلام "ملفوظاتِ آزاد اور افادات آزاد کے نام سے مولانا آزاد کے مختلف خطوط کے مجموعے شائع ہوئے۔

ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں کہ غبار خاطر کا پہلا خط 3 اگست 1943ء کو اُس وقت لکھا گیا، جب مولانا آزاد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ایک جلسے میں شرکت کے لیے بمبئی جا رہے تھے۔ یہ خط ٹرین میں لکھا تھا۔ 8 اگست 1942ء کو کانگریس کا جلسہ ہوا، جس

میں ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع کرنے کی تجویز منظور کی گئی۔ اس لیے 9اگست کی صبح حکومت نے کانگریس کے کئی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ان رہنماؤں میں مولانا آزاد بھی شامل تھے۔ مولانا آزاد کو احمد نگر کے قلعے میں رکھا گیا۔ یہاں سے انھوں نے اپنے عزیز دوست مولانا حبیب الرحمن شیروانی کو پہلا خط 10 اگست 1942ء کو اور آخری خط 16 ستمبر 1943ء کو لکھا۔

جیل کی تنہائی میں جہاں مطالعہ کی سہولیات فراہم نہ ہوں دل کا غبار نکالنے کا بہترین ذریعہ مکتوب نگاری تھا۔ ان مکاتیب کے بارے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں: یہ مکاتیب نجی خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کیے جائیں گے، لیکن رہائی کے بعد جب مولوی محمد اجمل خاں صاحب کو ان کا علم ہوا تو مصر ہوئے کہ انھیں ایک مجموعے کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ چوں کہ اُن کی طرح ان کی خاطر بھی مجھے عزیز ہے، اس لیے ان مکاتیب کی اشاعت کا سر و سامان کر رہا ہوں، جس حالت میں قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے، اسی حالت میں طباعت کے لیے دے دیے گئے ہیں۔ نظر ثانی کا موقع نہیں ملا۔

1.8 مولانا آزاد کی سیاسی زندگی

مولانا آزاد کی سیاسی زندگی نصف صدی کی وہ داستان ہے جس میں ہندوستانی تاریخ کے بے شمار واقعات، حادثات، معاملات اور مشکلات شامل ہیں۔ مولانا کی پوری حیات قوم سازی، جہد آزادی اور نئی جمہوری ریاست کی آبیاری کے گرد گردش کرتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو اجتماعی درماندگی، سماجی پسماندگی، سیاسی بدگمانی، اقتصادی دشواریوں سے نکالنے کے لیے بھرپور کوشش کی اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

1.8.1 مولانا آزاد کی انقلابی سیاست:

1857 کی جدوجہد کی ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمان مایوسی کا شکار تھے سرسید نے اس صورت حال میں انگریزوں کی حمایت کی اور مسلمانوں کو عملی سیاست سے دور رہنے کی تلقین کی۔ مولانا آزاد نے جس وقت ہندوستانی سیاست میں قدم رکھا ہندوستانی مسلمانوں کی پالیسی اسی فکر کے گرد گھومتی تھی۔ لیکن مولانا کے سیاسی خیالات مختلف تھے۔ وہ برطانوی سامراج کی استبدادی پالیسی کے خلاف تھے۔ انگریز حکومت کے رویہ پر اُن کے دل میں شدید نفرت تھی۔ برطانوی اہلکاروں نے 1905ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لارڈ کرزن نے برطانوی مفادات کے لیے بنگال کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہندوستانی تحریک آزادی کی مخالفت میں بنگالی مسلمانوں کو آلہ کار بنانے کی یہ برطانوی حکومت کی سازش تھی۔ مسلمان برطانوی حکومت کی سیاسی چالوں کو نہیں سمجھ سکے۔ ابوالکلام پہلے مسلمان تھے جنھوں نے انگریزوں کی چال کو سمجھا اور آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اسی دور میں مولانا کی ملاقات بنگال کے انقلابی رہنما شیام سندر چکرورتی سے ہوئی۔ چکرورتی کے توسط سے مولانا دیگر انقلابیوں سے بھی ملے۔ انقلابی رہنماؤں سے تبادلہ خیال سے مولانا انقلابی سیاست میں شامل ہوئے۔ شیام سندر چکرورتی نے مولانا کا تعارف انقلابیوں سے کرایا تو انھیں یقین نہیں آیا کہ کوئی مسلمان بھی ان کی تحریک میں شریک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ شروع میں مخصوص محفلوں سے مولانا کو دور رکھا جاتا۔ کچھ ہی عرصے میں جب مولانا نے انقلابیوں کا اعتماد حاصل کر لیا تو اس تحریک کے ایک اہم رکن بنے۔ مولانا نے ان انقلابیوں کو

یقین دلایا کہ یہ ہر گز درست نہیں کہ تمام مسلمان ان کے دشمن ہیں۔ اگر مصر ایران اور ترکی میں مسلمان انقلابی سرگرمیوں میں مصروف ہیں تو ہندوستان میں بھی انھیں اس تحریک میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جس وقت مولانا اس تحریک میں شامل ہوئے انقلابیوں کی سرگرمیاں صرف بنگال اور بہار تک محدود تھیں مولانا نے ان سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کرنے کا مشورہ دیا۔ ان ہی کے اصرار پر شمالی ہندوستان اور بمبئی میں اس جماعت کی خفیہ شاخیں قائم ہوئیں۔

1.8.2 مولانا آزاد کی قومی سیاست میں شرکت اور نظر بندی:

مولانا کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا شامل ہونا ضروری ہے۔ مولانا نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانا اور اُن میں انقلابی جذبہ پیدا کرنا اور انہیں قومی سیاست میں شامل کرنا بے حد ضروری ہے۔ اسی خاص مقصد سے مولانا نے جون 1912ء میں ہفت روزہ "الہلال" جاری کیا۔ الہلال "اتنا مقبول ہوا کہ دو سال میں اس کی اشاعت 26 ہزار فی ہفتہ تک پہنچ گئی۔ 8 ستمبر 1912 کو مولانا آزاد نے ایک مضمون لکھا، جس کا عنوان تھا۔ "الہلال کا مقصد اور پولیٹیکل تعلیم" اس میں آزاد پوری طرح سے علیحدہ مسلم حب الوطنی اور بین الاقوامی اسلامی اتحاد (پین اسلام ازم) کی وکالت کرتے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ "اسلام نے انسانیت کے لیے ایک اعلیٰ اور مکمل سماجی نظام پیش کیا ہے، مگر افسوس ہے کہ دور حاضر کے مسلمانوں نے چونکہ اسلام کو اس کے عظیم دور میں نہیں دیکھا اس لیے وہ ہندوں کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں۔ انھوں نے لکھا کہ الہلال کا مقصد ہے کہ "وہ مسلمانوں کو کتاب اللہ پر شریعت پر اور احکام رسول پر چلنے کی دعوت دے"۔ انھوں نے مزید لکھا کہ "ثقافتی، سیاسی اور دوسرے امور میں مسلمانوں کو صرف مسلمان کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے۔"

"الہلال" کی مقبولیت اور مولانا کے سیاسی مضامین سے برطانوی حکومت خوفزدہ ہو گئی۔ حکومت نے 18 ستمبر 1913ء کو الہلال" کی اشاعت پر دو ہزار کی ضمانت طلب کی اور ضمانت کی رقم ملنے کے بعد جھوٹا الزام لگا کر ضمانت ضبط کر لی۔ حکومت کا جب کوئی بس نہیں چلا تو اُس نے الہلال پریس پر مکمل پابندی عائد کرتے ہوئے اسے ضبط کر لیا۔ مولانا نے ہمت نہیں ہاری۔ پانچ مہینے بعد انھوں نے البلاغ "پریس" قائم کیا اور البلاغ "نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ برطانوی حکومت نے جب دیکھا کہ مولانا پر ان پابندیوں کا اثر نہیں ہوا تو اُس نے ڈیفنس آف انڈیا ریگولیشنز کے ایکٹ کے تحت انہیں شہر بدر کر دیا۔ مولانا کے پاس بہار جانے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ 30 مارچ کو مولانا کلکتہ سے رانچی پہنچ گئے۔ مولانا نے رانچی کے پاس مورابادی نامی گاؤں میں قیام کیا۔

رانچی کی نظر بندی کے دوران انھیں رولٹ ایکٹ کے سیاہ قانون کے بھیانک مضمرات کا احساس ہوا اور ساتھ ہی جلیانوالہ باغ کے بہیمانہ قتلِ عام نے انھیں انگریز سامراجیت کے خلاف مزید فعال اور سرگرمِ عمل کر دیا تھا۔ جون 1912 سے نومبر 1914 تک اور نومبر 1915 سے اپریل 1916 تک الہلال اور البلاغ نے ذریعہ مولانا نے جو پیغام دیا وہ عوام کے ذہنوں میں پیوست ہو گیا۔ ان اخبارات نے مسلمانانِ ہند کی مذہبی و سیاسی زندگی میں نئی حرکت پیدا کر دی تھی۔ ان رسالوں کے بند ہونے کے باوجود ان کی صدائے بازگشت آج تک سنائی دیتی ہیں۔

1.8.3 مولانا آزاد اور گاندھی جی:

گاندھی جی مولانا آزاد اور ان کی کاوشوں سے غائبانہ طور پر آگاہ تھے۔ رانچی میں مولانا کی نظر بندی کے دوران گاندھی جی نے ان سے ملنے کی کوشش بھی کی مگر انگریز افسروں نے انہیں ملنے موقع نہیں دیا۔ یکم جنوری 1920 کو انھیں رہا کر دیا گیا اور وہ رانچی سے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ کچھ دن کلکتہ میں قیام کے بعد مولانا آزاد 18 جنوری 1920 کو دہلی میں منعقد ہونے والے جلسہ میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہاں پہلی بار ان کی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی۔ یہ پہلا موقعہ تھا جس میں مولانا اور گاندھی جی ایک دوسرے سے ملے، اس میں ملک کے کئی عظیم قائدین جمع تھے، اس وقت گاندھی جی نئے سیاسی منصوبے تیار کر رہے تھے۔ وہ مفاہمت کے بجائے عوامی عمل اور عوامی قومی تحریک کی سیاست پر چلنا چاہتے تھے۔ مولانا نے بھی رانچی کی نظر بندی کے زمانہ میں متحرک عوامی تحریک کا خاکہ تیار کیا تھا۔ ترک موالات کی اصطلاح بھی مولانا ہی کی دین ہے۔ ان کے ذہن میں اس کا جواز اسلامی بھی تھا اور سیاسی بھی۔ جوں ہی گاندھی جی نے عدم تعاون اور ستیہ گرہ کے طریقہ کار کو بیان کیا، مولانا شاید پہلے شخص تھے جنھوں نے ان کی داد دی اور ان کے لائحہ عمل کو تسلیم کیا۔ پہلے مولانا اور گاندھی جی کی طویل چھ گھنٹہ کی گفتگو حکیم اجمل خاں صاحب کے گھر پر ہوئی اور پھر ایک اور ملاقات سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی کے پرنسپل پروفیسر رودرا کے گھر پر ہوئی۔ ان دو طویل ملاقاتوں کے بعد مولانا آزاد کا سیاسی انداز ہی بدل گیا۔ وہ ایک نئے ڈھنگ کے بھرپور قومی نمائندے یک جہتی کے پرزور حامی اور متحد قومیت کے شاندار علمبردار کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ اُن کا یہ سیاسی رنگ زندگی بھر قائم رہا۔

مئی 1920ء میں میرٹھ میں صوبائی خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں گاندھی جی اور مولانا آزاد نے شرکت کی۔ اسی کانفرنس میں پہلی مرتبہ گاندھی جی کا پروگرام تفصیل سے بتلایا گیا اور پرزور انداز سے پہلی بار عوامی رضامندی حاصل کی گئی۔ اب عدم تعاون اور ترک موالات کا منصوبہ کانگریس کا بنیادی مقصد بن گیا۔ اس کے بعد الہ آباد میں کل ہند خلافت کانفرنس نے اس منصوبے اور لائحہ عمل کی توثیق کر دی۔ مولانا آزاد نے مسلمانوں سے پرزور تائید کی اپیل کی اس طرح عوامی سطح پر ایک کثیر مسلم مجلس میں اس پروگرام کو اختیار کیا گیا۔ ملک میں آزادی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ عوام میں زبردست جوش و خروش تھا۔ علم بغاوت بلند ہو رہا تھا۔ اس سال مولانا زیادہ تر گاندھی جی کی ہمراہی میں ملک کے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے رہے تاکہ عوامی احساس کو بیدار کر سکیں۔ دوسرے قائدین جیسے علی برادران دیش بندھو، سی آر داس، پنڈت موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو، ملک کے گوشے گوشے میں گھوم کر عوام کو حصول آزادی کی اہمیت سے آگاہ کر رہے تھے۔ سوراج فنڈ کھولا گیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے آزادی کے متوالوں نے صرف آٹھ مہینوں میں ایک کروڑ روپیہ جمع کر لیا تھا، جس نے تحریک آزادی کو بڑی تقویت دی۔

1.8.4 مولانا آزاد اور متحدہ قومیت:

ہندوستان کی سیاست کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے ہی مولانا نے ہندوستانی سیاست کا بڑا مرض تشخیص کر لیا تھا۔ انکا عقیدہ تھا کہ برطانوی حکومت اپنے ذاتی مفاد کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کر رہی ہے۔ انگریزوں کی یہ سازش پوری قوم کے لیے خطرناک ہے۔ جو ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی بابت نفرت پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ دراصل انگریزوں کے زر خرید غلام ہیں اور اپنے مالکوں کے دیے ہوئے کام کو پوری ایمان داری، خلوص اور لگن کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہندوؤں مسلمانوں اور ہندوستان کے دوسرے

مذہبی گروہوں میں جتنی نفرت پیدا ہو گی اور اُن میں آپس میں جتنا فاصلہ پیدا ہو گا، اتنی ہی ہندوستان پر برطانوی حکومت کی گرفت مضبوط ہو گی اور اتنی ہی ہندوستان کے پیروں میں پڑی ہوئی غلامی کی زنجیریں مضبوط ہوں گی۔

مولانا آزاد جیسے عقلیت پسند انسان نے بہت کم عمری میں انگریزوں کی پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی چال کو سمجھ لیا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے مارچ 1940ء کے سالانہ اجلاس میں صدارتی خطبے میں مولانا نے کہا تھا کہ "میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شان دار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں، اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

قومی اتحاد مولانا کا عقیدہ تھا۔ اُن کی ساری زندگی ہندو مسلم اتحاد کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ انھوں نے اس اتحاد کے لیے خود بھی جدو جہد کی اور دوسروں کو بھی ترغیب دی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے 15 دسمبر 1923ء کے سالانہ اجلاس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے مولانا نے کہا" آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج 24 گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا، مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہو گا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہے۔"

دسمبر 1923ء کو دہلی میں کانگریس کا ایک غیر معمولی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت کے لیے مولانا آزاد کا انتخاب ہوا، اس وقت ان کی عمر 35 سال تھی۔ کانگریس کی تاریخ میں سب سے کم عمر صدر رہنے کا امتیاز انھیں کو حاصل تھا۔ ملک بڑے آزمائش سے دور سے گزر رہا تھا۔ کانگریس دو گروپوں میں بٹ چکی تھی۔ ہندو مسلمان اتحاد کمزور ہو رہا تھا اور اختلافات بڑھ رہے تھے۔ گئو رکشا مہم زوروں پر چل رہی تھی۔ شدھی کی تحریکوں نے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا، جس کی وجہ سے تبلیغ کی تحریک تقویت پا رہی تھی۔ مولانا آزاد نے اپنے صدارتی خطبہ میں فرقہ وارانہ تحریکوں کی مذمت کی، اور متحدہ قومیت کی اہمیت پر زور دیا۔

مولانا آزاد نے ایک نئی سیاسی جماعت بھی بنائی جس کا نام قومی مسلم پارٹی رکھا۔ قومی مسلم جماعت کا پہلا اجلاس مولانا کی صدارت میں الہ آباد میں منعقد ہوا۔ اس جماعت کے روح رواں ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولوی تصدق احمد خاں شیروانی تھے۔ 6 جنوری 1930 کو قومی مسلم جماعت کی جانب سے مولانا آزاد اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے اعلان کیا کہ قومی آزادی کی جدوجہد بھرپور انداز سے شروع ہو چکی

ہے، اس وقت مسلمانوں کی جداگانہ مانگوں پر اصرار کرنا، جدوجہد کے اصل مقصد کو کمزور کر سکتا ہے۔ مولانا آزاد نے مسلمانوں کو ستیہ گرہ میں شرکت کی دعوت دی، اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان، بنگال، یوپی، پنجاب اور صوبہ سرحد سے شامل ہوئے۔

مولانا آزاد 1940 سے 1949 تک کانگریس کی مسندِ صدارت پر جلوہ افروز رہے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں یہ اعزاز صرف مولانا آزاد کو ہی حاصل ہے۔ اس پورے عرصہ کو مولانا آزاد کی سیاسی قیادت کا دور کہا جا سکتا ہے۔ ان ہی کے عہد صدارت میں "انفرادی ستیہ گرہ" اور "بھارت چھوڑو" جیسی تحریکیں چلائی گئیں۔ کانگریسی رہنماؤں نے قربانیاں دیں، قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں، انہیں کے دور میں کیبنٹ مشن اور کرپس مشن کے ممبروں سے مذاکرات ہوئے۔ شملہ کانفرنس منعقد ہوئی، کیبنٹ مشن کا پلان منظور ہوا۔ عبوری حکومت کی تشکیل ہوئی۔ آئین ساز اسمبلی کے ممبر بنائے گئے۔ 1947 میں وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ حصولِ آزادی کے بعد بھی اپنی وفات تک وزیرِ تعلیم رہے۔

الغرض مولانا آزاد نے نہج وجہد آزادی اور صرف ہندوستانی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ آزادی کے بعد کی تعمیر نو میں بھی سرگرم حصہ لیا۔ وہ عہدِ حاضر کے دور بین قائدین میں سے ایک تھے جنہوں نے متحدہ قومیت کو فروغ دیا۔ جمہوری سیکولر اور عوامی تحریکوں کی نمائندگی کی۔ انہوں نے انسانی ہم آہنگی، مذہبی امن و آشتی، جمہوری طرزِ فکر، انسانی حقوق کی پاسداری، عدل و انصاف پر مبنی نظام کی وکالت کی۔ ان کا بنایا ہوا قومی نصب العین آج بھی ہمارے ملک اور قوم کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

1.10 مولانا کی آزاد علالت اور وفات

19 فروری 1958ء کی صبح مولانا جب بستر سے اٹھ کر غسل خانے گئے تو ان پر اچانک فالج کا حملہ ہو گیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ تین دن تک مولانا بے ہوش رہے۔ اس دوران میں ایک دو دفعہ ہوش آیا۔ پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک دو کو پہچانا۔ ایک دفعہ ہوش آیا تو پنڈت جواہر لال نہرو پر نظر پڑی۔ پنڈت جی کو پہچان گئے۔ خدا حافظ کہا اور پھر بے ہوش ہو گئے۔

مولانا مستقل بے ہوش رہے کچھ دیر کے لیے ہوش آیا تو بولے۔ مجھے پنجرے میں کیوں بند کر رکھا ہے۔ بس اللہ پر چھوڑیے" آخر 22 فروری کی صبح دو بج کر دس منٹ پر ہندوستان اور عالم اسلام کی یہ روشن ترین شمع گل ہو گئی۔ 22 فروری کی سہ پہر تین بجے دہلی کے پریڈ گراؤنڈ میں نماز جناہ پڑھائی اور اسی گراؤنڈ میں جامع مسجد اور لال قلعے کے درمیان انھیں دفن کر دیا گیا۔

1.11 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مولانا کی ابتدائی زندگی کا پہلا دور 1888 سے 1899 تک محیط ہے۔ اس میں ان کی ولادت ہوئی، بچپن گزرا، ذاتی تعلیم حاصل کی، پڑھنے کا اشتیاق اور جذبہ بیدار ہوا، مکہ سے کلکتہ منتقل ہوئے اور اسی دوران 1899 میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔
- 1900 سے 1907 کا دور عنفوانِ شباب کا دور تھا۔ اسی دور میں انہوں نے شاعری کا آغاز کیا۔ لسان الصدق، الندوہ اور وکیل جیسے جریدوں کی ادارت کی۔

- اسلامی علوم میں مہارت اور درس نظامی کی تعلیم مکمل کی۔ عربی اور فارسی زبان و ادب کا مطالعہ کیا، اُردو زبان وادب میں مہارت اور اسلوب بیان پر ملکہ حاصل کیا۔
- مسلمانوں کی سماجی اصلاح کے ساتھ ان میں سیاسی سماجی اور قومی شعور بیدار کیا۔ ان میں حب الوطنی کی روح پھونکنے کا عزم مصمم کیا۔ مصر، شام عراق، ترکی، اور مشرق وسطیٰ کے سفر کیے۔ اسی دوران 1908 سنہ عیسوی میں ان کے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا۔
- 1908۔1911 عیسوی کا دوران کی ذہنی اور فکری نشو و نما، آبیاری، تحقیق و جستجو اور عقلیت پسندی کا دور تھا۔ اس دور میں ان کا مزاج انقلابی تھا۔ شدت پسندی اور پین اسلامک تحریک کی طرف راغب کا دور ہے۔
- 1912۔1915 سال کے دوران جب ان کی عمر چوبیس سے ستائیس سال تھی انہوں نے کئی معرکتہ الآرا کارنامے انجام دئے۔ 1913 میں الہلال اور 1915 میں البلاغ جیسے شہرۂ آفاق رسالے نکالے۔
- مسلمانوں میں حب الوطنی کے جذبات بیدار کیے۔ اس کی خاطر کئی اہم رسالے اور جریدے نکالے، کئی رسالوں کی ادارت کی۔ 1916۔1919 چار سالہ وقفہ بہت اہم تھا۔ رانچی میں قید و بند کی صعوبت برداشت کیں۔
- یہ دور مولانا کی گوشہ نشیی اور تخلیہ کا بھی دور تھا۔ اس میں ان کے اندر دینی تجسس پیدا ہوا۔ انہوں نے مذہب اور سیاست کے اہم اور بنیادی مسائل پر غور و فکر شروع کیا۔ تذکرہ اور ترجمان جیسی نادرِ روز گار کتابیں تحریر کیں۔ اسی دور میں ان کے ذہنی و فکری تخیلات کو نئی جلا ملی۔
- 1920۔1922 کا دور تحریک خلافت اور ترک موالات کا دور تھا، اس عہد میں ہندوستانی سیاست کی نئی سمجھ پروان چڑھی اور عملی سیاست میں سرگرم ہوئے اور عوام کو بھی میدانِ عمل میں لانے کی کوششوں کا آغاز ہوا۔
- 1923۔ 1927 کا عہد مولانا کے سیکولر قومی تحریک میں شمولیت کا پہلا دور تھا جس میں انہوں نے قومی تحریک کی قیادت اور ہندو مسلم اتحاد کی پرزور کوششیں کی۔
- 1928 - 1930 کے دوران مولانا کے سیکولر قومی تحریک کا دوسرا دور شروع ہوا انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی اعلیٰ قیادت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ قومی مسلم پارٹی کے نام سے ایک سیاسی پارٹی بنائی۔
- ملکی، ملی اور قومی یکجہتی کے پیغام کی ترویج و اشاعت کی-اپنی لکھی ہوئی تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد شایع کی۔ 1940۔ 1947 کا دور مولانا کی زندگی کا اہم ترین دور تھا۔
- یہ ان کی قومی قیادت کا تیسرا دور تھا، جس میں انہوں نے مسلم لیگ اور اسکے قائدین کی سخت مخالفت اور نکتہ چینی کی، مسلمانوں میں سیاسی شعور کی کمی کا احساس کیا۔

- انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت فرمائی، اسی دوران "ہندوستان چھوڑو" مہم کا آغاز ہوا جس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کی پاداش میں احمد نگر قلعہ میں قید ہوئے۔ اسی دور میں ان کی اہلیہ زلیخا بیگم کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوا۔
- کیبینٹ مشن سے بات چیت اور شملہ کانفرنس کے وفد میں شامل ہوئے۔اسی دور میں ہندوستان کو آزادی ملی اور تقسیم ملک کا سانحہ رونما ہوا۔1947۔1958 حکومت ہند کی آئین سازی میں شامل ہوئے۔وزیر تعلیم کا عہدہ سنبھالا دستور ساز اسمبلی میں مصروف رہے پارلیمنٹ میں نائب وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا۔
- آزادی کے بعد نئی کانگریس کی قیادت کی۔22 فروری 1958 کو اس دارِ فانی کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہا۔

1.12 کلیدی الفاظ (Keywords)

غبارِ خاطر	:	مولانا آزاد کے خطوط کا وہ شاندار مجموعہ جو انہوں نے احمد نگر قلعہ کی جیل سے ایامِ اسیری میں نواب صدر یار جنگ کو لکھے تھے۔
الہلال	:	1912 میں مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی بیداری کے لیے جاری کیا گیا رسالہ۔
البلاغ	:	الہلال پر پابندی لگنے کے بعد نومبر 1915 سے جاری ہونے ولا رسالہ
لال دوگی	:	کلکتہ میں الفنسٹن چوک پر واقع ایک علاقہ
پین اسلام ازم	:	وحدتِ عالمِ اسلام کے لیے چلائی جانے ولی تحریک
انفرادی ستیہ گرہ	:	برطانوی جبر واستبداد کے خلاف عوامی سطح کر کی جانے والی سول نافرمانی
بھارت چھوڑو تحریک	:	1942 میں انگریزوں سے ہندوستان چھوڑنے کا پرزور مطالبہ کرنے کی احتجاجی تحریک
کرپس مشن	:	برطانوی وزیر اعظم چرچل کے ذریعہ اسٹیفورڈ کرپس کی نمائندگی میں ہندوستان آنے والا وفد

1.13 نمونہ امتحانی سوالات

1.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا ابولکلام آزاد کہاں پیدا ہوئے تھے؟
2. مولانا آزاد کے والد کا نام کیا تھا؟
3. ابوالنصر غلام یٰسین آہ سے مولانا آزاد کا کیا رشتہ تھا؟
4. مولانا آزاد ہندوستان کب تشریف لائے؟
5. زلیخا بیگم کون تھیں؟
6. مولانا آزاد نے سب سے پہلے کون سا رسالہ جاری کیا تھا؟

7. مولانا آزاد نے اپنا پہلا الیکشن کہاں سے لڑا تھا؟
8. مولانا آزاد کا تاریخی نام کیا تھا؟
9. آزاد ہندوستان میں مولانا آزاد کو کون سی وزارت دی گئی تھی؟
10. مولانا آزاد کی وفات کب اور کہاں ہوئی؟

1.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالیے۔
2. مولانا آزاد کے اہل خانہ کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔
3. مولانا آزاد کی خانگی زندگی پر مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔
4. مولانا کی مکتوب نگاری کا جائزہ لیجیے۔
5. مولانا آزاد کے پسندیدہ شوق بیان کیجیے۔

1.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد اور ان کے خاندانی پس منظر کا جائزہ لیجیے۔
2. مولانا آزاد کی ادبی اور صحافتی زندگی پر روشنی ڈالیے۔
3. ہندوستان کی سیاست میں مولانا آزاد کا کردار بیان کیجیے۔

1.14 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی	مرتبہ: مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی
2. آثار ابوالکلام	قاضی عبدالغفار
3. مولانا ابوالکلام آزاد: تحریک آزادی و یک جہتی	مرتبہ: خان عبدالودود خان
4. مولانا ابوالکلام آزاد	عابد رضا بیدار
5. ہماری آزادی ابوالکلام آزاد	مترجم: پروفیسر محمد مجیب
6. ترجمان القرآن	ابوالکلام آزاد
7. مولانا آزاد کے مراسلات کا کیلنڈر	سید محمد عزیز الدین حسین

اکائی 2 : "تذکرہ" کا مطالعہ

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 تذکرہ کا تعارف (موضوع، وجہ تصنیف، زمانۂ تصنیف، مدت تصنیف، طریقۂ تصنیف، پہلی اشاعت، جدید ترین / مستند اشاعت وغیرہ)

2.3 تذکرہ کے اہم موضوعات

2.3.1 عزیمت دعوت

2.3.2 تجدید واحیائے دین

2.3.3 سیرت النبی ﷺ کے مطالعے کی اہمیت

2.3.4 ترک امر بالمعروف کا فتنہ

2.3.5 علم الکلام

2.4 تذکرہ میں مذکور اہم شخصیات

2.4.1 امام احمد بن حنبلؒ

2.4.2 امام ابن تیمیہؒ

2.4.3 مجدد الف ثانیؒ

2.4.4 شاہ ولی اللہؒ

2.4.5 شیخ جمال الدینؒ

2.5 تذکرہ میں مولانا آزاد کے اسلاف اور خاندانی حالات

2.6 تذکرہ کی زبان وبیان اور اسلوب

2.6.1 زبان وبیان کی خصوصیات

2.6.2 اسلوب کی خصوصیات

2.7 تذکرہ کی ادبی وفنی خوبیاں اور خامیاں

2.8		اکتسابی نتائج
2.9		کلیدی الفاظ
2.10		نمونہ امتحانی سوالات
	2.10.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	2.10.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	2.10.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
2.11		تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

مولانا ابوالکلام آزاد پختہ ایمان و شعور، فہم و ذکاوت اور اخلاقِ کریمانہ کے حامل انسان تھے۔ بچپن ہی میں انہوں نے مختلف علوم حاصل کیے جن میں منطق، ادب تفسیر، حدیث، فقہ، وغیرہ شامل تھے۔ اپنی عمر کے بارہویں سال میں ہی وہ ان صلاحیتوں پر قدرت حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے مشہور رسالہ "نیرنگِ خیال" کے علاوہ مختلف دیگر اخبارات کی بھی ادارت کی۔ مثلاً "الہلال"، "الوکیل"، "البلاغ" جس میں پُرزور انداز میں انگریزوں کی مخالفت کرتے اور ان کے اکثر مضامین کی وجہ سے انہیں کئی بار جیل جانا پڑا۔ مولانا آزاد نے کئی گراں قدر کتابیں لکھیں جن میں سے مشہور "غبار خاطر"، "تذکرہ" وغیرہ ہیں۔ "ترجمان القرآن" کے نام سے انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی۔ مولانا آزاد ان مسلم رہنمائوں میں سے ایک تھے جنہوں نے ہندوستان کی آزادی اور اسے انگریزوں کے استبداد سے آزاد کروانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ جدید ہندوستان کے معماروں میں سے ایک ہیں۔ آزادی کے بعد وہ ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مقرر کیے گئے۔ حکومت ہند اس عظیم شخصیت کی ولادت کی مناسبت سے ہر سال ۱۱ر نومبر کو "یوم تعلیم" کا انعقاد کرتی ہے۔ ان کی عظیم خدمات کے اعتراف میں حکومت نے انھیں "بھارت رتن" اعزاز سے نوازا۔ اس اکائی میں ہم مولانا آزاد کی خودنوشت سوانح عمری "تذکرہ" کا مطالعہ کریں گے۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- عہد مولانا آزاد کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات کا جائزہ لیں سکیں۔
- مولانا آزاد کے اسلاف کی سیرت، تعلیمات اور سوانح سے واقف ہو سکیں۔
- "تذکرہ" کے موضوع، وجہ تصنیف، زمانہ تصنیف طریقہ تصنیف وغیرہ پر تبصرہ کر سکیں۔
- "تذکرہ" میں موجود اکابرین، مجددین، مجتہدین جیسی اہم شخصیات سے واقف ہو سکیں۔
- مولانا آزاد کے نثری اسلوب سے واقف ہو سکیں۔

2.2 تذکرہ کا تعارف:

تذکرہ مولانا آزاد کی خود نوشت سوانح عمری کا پہلا حصہ ہے۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کے جد امجد اور اسلاف کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ فضل الدین احمد کے اصرار پر مولانا آزاد نے "تذکرہ" لکھا تھا۔ "تذکرہ" کا پہلا ایڈیشن ستمبر 19 19 میں "البلاغ" پریس کلکتہ سے شائع ہوا۔ فضل الدین احمد نے لکھا ہے کہ:

یہ کتاب جون 1916 سے اکتوبر 1917 کے درمیان پانچ مہینوں میں لکھی گئی

("تذکرہ"، مقدمہ، ص 18)

دوسرے ایڈیشن میں مالک رام نے چند اصلاحیں کیں اور ایک طویل مقدمہ کے ساتھ دوبارہ مرتب کر کے شایع کیا۔

پہلی بار	1968
دوسری بار	1981
تیسری بار	1985

آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی آزاد کی سوانح کا یہ دوسرا حصہ ہے جو 1957 میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔ 1927 میں مولانا آزاد علی پور سنٹرل جیل میں تھے۔ عبدالرزاق ملیح آبادی کے بے حد اصرار کے بعد انہوں نے اپنی سوانح لکھوائی تھی۔ آزاد بولتے جاتے تھے اور ملیح آبادی لکھتے جاتے تھے۔ اس کتاب میں آزاد نے اپنے بچپن کے حالات سے لے کر 17 سال کی عمر تک کے حالات کا ذکر کیا۔ آزاد کا بچپن، گھر کا ماحول، خاندان کے دینی و ادبی مشاغل کی تفصیلات اس میں موجود ہے۔ 1916 میں حکومت بنگال نے مولانا کو صوبہ بدر کر دیا تھا۔ بمبئی پنجاب اور یوپی میں پہلے ہی ان کا داخلہ ممنوع تھا۔ رانچی میں مولانا آزاد نے پناہ لی تھی۔ اس کے پانچ مہینے بعد انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب فضل الدین احمد نے انہیں اپنی سرگزشت لکھنے کے لیے راضی کیا۔ پہلا حصہ "تذکرہ" ہے۔ اس کتاب میں 34 باب تک اکابرین، مجتہدین، مجددین اور اسلاف کا ذکر کیا گیا ہے آخری کے چار ابواب میں آزاد نے اپنی سوانح کا ذکر کیا ہے۔ "تذکرہ" کے پہلے باب میں مولانا آزاد کے پردادا شیخ جمال الدین دہلوی جو شاہ محمد افضل کے مادری سلسلے کے ایک بزرگ تھے۔ ان کے حالات بیان کیے۔ دوسرا باب شائع نہ ہو سکا جس میں شیخ جمال الدین کے بیٹے شیخ محمد کے حالات تھے۔ تیسرے باب میں شاہ محمد افضل اور اپنے والد مولانا خیر الدین کے نانا مولانا نور الدین کی سوانح حیات ہے۔ مولانا صاحب مسودہ لکھنے کے بعد مولانا فضل الدین کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ اس طرح کتاب کا کام جاری تھا لیکن اچانک سن 1922 میں شیخ فضل الدین کا انتقال ہو گیا۔ مولانا آزاد نے مسودہ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی لیکن دستیاب نہ ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ طرابلس پر اطالویوں نے حملہ کر دیا۔ ایران انگریزوں اور روسیوں کے درمیان تقسیم ہو چکا تھا۔ روسی حکومت کے علمبرداروں نے دولت عثمانیہ کو تاخت و تاراج کرنے کے لیے پین سلوازم (Pan Slavism) تحریک کا آغاز کیا تھا جس کے خلاف سلطان عبدالمجید ثانی نے پین اسلامزم (Pan Islamism) کا تصور دیا تاکہ مسلمان متحد ہو

جائیں۔ بنگال دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ انگریزی حکومت ہندوستان میں نفاق کے بیج بو چکی تھی۔ کانگریس کے مقابل مسلم لیگ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ مولانا آزاد نے اپنے ہفتہ وار رسالہ "الہلال"، کی اجرا 13 جولائی 1912 کو کیا۔ اس رسالے نے ادبی سیاسی اور مذہبی رجحان کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ "الہلال" نے ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔ اس طرح سے صحافت کا استعمال کبھی نہیں ہوا تھا۔ قرآن و سنت، اصلاحِ معاشرہ، سیاست اور تعلیم کے متعلق اس طرح نہیں لکھا گیا تھا جس طرح کی آواز آزاد اس رسالے میں لکھتے تھے۔ " الہلال" کی عمر کم رہی اس کے بعد مولانا نے "البلاغ" شروع کیا۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد لکھتے ہیں:

"الہلال" تین مرتبہ موت و حیات کی کشمکش سے گزرا اس کا پہلا شمارہ 13 جولائی 1912 کو شائع ہوا اور 18 نومبر 1914 تک چلتا رہا۔ ایک سال کے بعد اس کا دوسرا جنم ہوا اور 12 نومبر 1915 کو "البلاغ" کے نام سے نکلا اور 13 مارچ 1916 تک زندہ رہا۔ 11 سال کے بعد 10 جون 1927 کو پھر " الہلال" کو نئی زندگی ملی اور اسی سال 9 دسمبر 1927 کو ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

"الہلال" کی طرح "تذکرہ" کے ذریعے بھی خفتہ اذہان کو بیدار کرنا اور دعوت و اصلاح کی تحریک پیدا کرنا ان کا مقصد عین تھا۔ "تذکرہ" نہ صرف مذہبی اہمیت کا حامل ہے بلکہ تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے۔" (پیش لفظ، ص10)

2.3 تذکرہ کے اہم موضوعات

2.3.1 عزیمتِ دعوت:

اس کے لفظی معنی ہوں گے عزیمت یعنی: "دلی ارادہ، مقصد اور اس کی جمع ہو گی عزائم" اور دعوت کے معنی ہوتے ہیں "بلانا یا دعوت دینا۔ لیکن یہاں دعوت سے مراد ہے دعوت الی الحق یعنی حق کی طرف کسی کو دعوت دینا یا بلانا۔" اب اس مرکب لفظ عزیمتِ دعوت کے معنی ہوں گے "کسی کو حق کی طرف بلانے کا مقصد یا دلی ارادہ یا خود کا حق کی طرف رجحان"۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرے اور قرآن کی آیات کے حوالے سے عزیمتِ دعوت کو سمجھایا ہے۔ دراصل یہی وہ درجہ عزیمت باذن اللہ ہے جس کو قرآن کریم نے " عزمِ امور" سے تعبیر کیا ہے: اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ اور یہی انسانیت کا اعلیٰ طبقہ ہے، جو صرف حق کو پانے پر قناعت نہیں کرتا بلکہ راہِ حق کی جدوجہد میں سب سے آگے نکل جانا اور سب سے بڑا اور اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے، ساری بڑائی پہلے قدم اٹھانے والے کے لیے ہے نہ کہ دوڑتے ہوؤں کو دیکھ کر دوڑنے والوں کے لیے۔ حدیث کے مفہوم سے بھی یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے کہ: "تم میں سے جب کبھی کوئی شخص کسی برائی کو دیکھے، تو چاہیے کہ بڑھ کر اس کو اپنے ہاتھ سے روک دے، اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے اسے بُرا کہے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ پائے تو دل میں اسے بُرا جانے، اور یہ آخری درجہ ایمان کا بڑی ہی کمزوری کا درجہ ہے۔" بس اس حدیث میں بھی تین درجے بتائے گئے ہیں، جس طرح آخری درجہ سب سے کمتر درجہ قرار دیا گیا۔ اسی طرح پہلا درجہ عزیمتِ دعوت کا سب سے قوی درجہ قرار پایا۔ یعنی اس حدیث میں سب سے قوی درجہ کو اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اگر آپ اتنی قدرت نہ رکھتے ہوں تو آخری درجہ سب سے کم تر ایمان کا ہے کہ اس کو دل میں بُرا جانے، جس کے متعلق واضح کیا گیا کہ ایمان کا یہ درجہ بہت

کمزور ہے۔ لیکن برائی کو کسی بھی حالت میں قبول نہ کیا جائے۔ کسی نہ کسی حالت میں اس کو روکنے کی جدوجہد جاری رہنی چاہیے۔ انبیا کے گرد حلقۂ احباب ایسے ہی صاحبِ استعداد اور باصلاحیت لوگوں کا ہوتا ہے جو اول نظر میں حق کو پہچاننے والا اور سب سے پہلے حق کو پالینے والا ہوتا ہے۔ اس گروہ کو حق کو پالینے کی مناسبت اسی طرح ہوتی ہے جس طرح لوہے کو مقناطیس سے ہوتی ہے۔ جو اس کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ جانے کے لیے بے قرار رہتا ہے اور ہر لمحہ اس کا منتظر رہتا ہے۔ صدیقیت کی مثال اس قوی بصارت کی سی ہے جو سب سے پہلے دور کی چیز کو دیکھ لیتی ہے اور باریک سے باریک ذرہ کو ڈھونڈ نکالتی ہے، جب کہ دوسری کمزور آنکھیں اس وقت دیکھتی ہیں جب وہ چیز بالکل سامنے آجاتی ہے۔ یا پھر قوی درجہ کی مثال اس آئینہ کی سی ہے جو بالکل صاف و شفاف ہو جس میں تصویر فوری اور صاف دکھائی دے۔ اس کے برخلاف بعض آئینے صفائی اور تزکیے کے محتاج ہوتے ہیں اور پھر زنگ و کثافت کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض جلد صاف ہو جاتے ہیں اور بعض کو صاف کرنے کے لئے بڑی محنت درکار ہوتی ہے اور بعض کے صاف ہونے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں اور بعض کے تو ہوتے بھی نہیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت علی اور حضرت ابوذر غفاریؓ کی مثالیں اس صاف اور شفاف آئینہ کی ہیں جنھوں نے پہلے ہی نظر میں عکس قبول کر لیا تھا اور ابو لہب جو خاندانی فرد ہونے کے باوجود منکر ہوا۔ مولانا کا مقصود ان مقامات کی طرف قاری کی توجہ مبذول کروانا ہے۔

2.3.2 تجدید و احیائے دین :

تجدید کے معنی نیا کرنا، بہتر حال میں بحال کرنا یا دوبارہ توجہ دینے کے ہیں۔ احیا کے معنی ہیں زندہ کرنا۔ تجدید و احیائے دین کا مطلب دین کو بگری ہوئی حالت سے نکال کر اس حالت میں کرنا جس حالت میں عہد نبوی میں تھا۔ اسلام قیامت تک رہنے والا دین ہے اور حضور ﷺ کے بعد دین کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالی نے لیا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ (سورۃ الحجر:9) اسلام کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں مجددین آتے رہے جنھوں نے اسلام سے غیر اسلامی عناصر کو ختم کیا اور عوام کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا، اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَاْسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا۔ (سنن ابی داود، رقم 4291) ترجمہ: ”بے شک اللہ تعالیٰ ہر صدی کے اختتام پر ایک ایسی ہستی بھیجتا ہے، جو اس امت کیلئے اس کے دین کی تجدید کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔“ حضور ﷺ کے بعد ہر دور میں فتنے اٹھتے رہے اور ان فتنوں کا اصل سبب مادہ پرستانہ ذہنیت، رہبانیت وغیرہ ہیں۔ مادہ پرستی ایک عیب ہے جس میں اپنے اعمال کو خواہشات کے سپرد کر کے انسان دنیاوی مال و متاع اور عیش و عشرت میں ڈوب جاتا ہے۔ مادہ پرستانہ ذہنیت فنون و ادب کو بھی متاثر کرتی ہے اور اس طرح معاشرے میں الحاد اور مادیت کی روح پروان چڑھتی ہے۔ رہبانیت انسان کو سماج سے ہٹا کر گوشہ عزلت میں لے جاتی ہے۔ مایوسانہ نقطہ نظر قائم ہو جاتا ہے ویدانتیزم، نیو پلیٹونزم، یوگ، تصوف مسیحی رہبانیت، بدھ ازم وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ نیک بندوں انبیاء، اولیا، شہداء و صالحین اور مشائخ کے مقام و احترام میں بے حد غلو کیا گیا۔ فاتحہ، پوجا پاٹ، زیارت، نیاز نذر، صندل، نشان، عَلَم جیسے اعمال نے ایک نئی شریعت تصنیف کی۔ ان تمام فتنوں کو ختم کرنے کے لیے مجددین کی ضرورت پیش آئی جو زمانے کی بگڑی رفتار کو بدل دیں، مجددین نے جاہلانہ رسومات کو کاٹ کر اسلامی ذہنیت کو از سر نو فروغ دیا اور اسلام کو

مٹانے والی طاقت کا مقابلہ کر کے اسلامی دعوت کو عوام میں پھیلایا۔

اسلام کے پہلے مجدد عمر بن عبدالعزیز ہیں جنہوں نے تخت حکومت پر بیٹھنے کے بعد اسلام کے راستے کو چنا، خاندان اور نظام حکومت کی اصلاح کی اور اسلامی حکومت کو زندہ کیا۔ ان کے دور میں عوام ہر جگہ روزہ نماز اور قران کا ذکر کرتے جس کا اثر یہ ہوا کہ ہزار در ہزار افراد مسلمان ہو گئے۔ متعدد ریاستوں نے دین قبول کیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے صرف ڈھائی سال کام کیا، بنو امیہ ان کے دشمن ہو گئے اور سازش کر کے زہر دے دیا۔ وہ صرف 39 سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کے بعد نظام حکومت بنو امیہ کے دیگر افراد، بنو عباس اور ترکی نسل کے بادشاہوں کے ہاتھوں میں چلی گئی اور ایک بار پھر جاہلیت عام ہوئی۔ پانچویں صدی میں امام غزالی نے دین کے فہم کو تازہ کیا، تقلید جامد کی مخالفت کی فلسفہ یونان کا مطالعہ کیا اور تنقید کی تھی جس کا اثر یورپ تک پہنچا۔ انہوں نے کتاب ''احیاء العلوم'' میں ہر طبقے کی اخلاقی حالت پر تنقید کی۔ ان کے بعد آنے والوں میں ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ دہلوی، سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید ہیں جن کی تفصیلات آپ آگے پڑھیں گے۔

2.3.3 سیرت النبی ﷺ کے مطالعے کی اہمیت:

روئے زمین پر ہر دور میں انبیاء آئے اور اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق فریضہ ہدایت انجام دیتے رہے اور اعمال صالحہ کا نمونہ پیش کیا۔ عالم انسانیت کی ہدایت کا آخری پیغام حضور ﷺ لے کر آئے۔ آپ ﷺ پر اللہ کا کلام قران پاک نازل ہوا۔ تمام عالم انسانیت کے لیے آپ ﷺ کی سیرت بہترین نمونہ ہے اور اہل ایمان کے لیے سیرت النبی ﷺ واجب اتباع ہے۔ آپ ﷺ کے اعمال، اخلاق، کردار، عادات واطوار آپ ﷺ کی زندگی کے تمام معاملات عالم انسانیت کے لیے کامل اور حسین ترین نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے عالم کے وجود میں آنے سے لے کر مرنے کے بعد تک کے انجام کا راستہ دکھایا ''تذکرے'' میں آزاد لکھتے ہیں:

> ''جب تک دنیا باقی ہے صاحب قران کی سیرت وحیات مقدس کے مطالعہ سے بڑھ کر نوع انسانی کے تمام امراض قلوب وعلل ارواح کا اور کوئی علاج نہیں۔ اسلام کا دائمی معجزہ اور ہمیشگی کی حجتہ اللہ البالغہ قرآن کے بعد اگر کوئی چیز ہے تو وہ صاحب قرآن کی سیرت ہے اور دراصل قرآن وحیات نبوت معناً ایک ہی ہیں، قرآن متن ہے اور سیرت اس کی شرح۔ قرآن علم ہے اور سیرت اس کا عمل، قرآن صفحات و قراطیس ما بین الدفتین اور فی صدور الذین اتوا العلم میں ہے، اور یہ ایک مجسم و ممثل قرآن تھا جو یژب کی سرزمین پر چلتا پھرتا نظر آتا تھا۔ (تذکرہ، ص 197)

ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کریں، قرآن کا دعوی ہے کہ نبی کی زندگی ہر بات کی ایک دلیل ہے۔ (سورۃ محمد، 33)

قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے سیرت النبی ﷺ کو سمجھنا ضروری ہے اور سیرت النبی ﷺ کو سمجھنے کے لیے قرآن پاک کو۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ: ''میں نے شبلی سے کہا کہ آپ سیرت میں خاص باب یا سیرت کا ایک خاص حصہ اس عنوان سے قرار دیجیے، ''قران

اور سیرت محمدیہ "اور اس میں صرف آیات قرآنیہ کو بہ ربط ترتیب جمع کر کے دکھلایئے کہ خود قرآن سے کہاں تک آپ ﷺ کی شخصیت اور آپ ﷺ کے وقائع و ایام معلوم ہو سکتے ہیں۔" آگے لکھتے ہیں کہ، "کتاب کے مرتب ہو جانے کے بعد جو دیکھا تو ایک عجیب عالم نظر آیا۔ حیات و سیرت کا کوئی ضروری ٹکڑا ایسا نہیں ہے جس کے لیے قرآن میں ایک سے زیادہ آیات نہ ہو۔ (تذکرہ، ص204، 205)

آج تمام عالم دین کی ایسی کوئی کتاب موجود نہیں جس میں کتاب الٰہی اور صاحب کتاب کے باہمی علاقہ وحدت کا حال بیان ہو اور دونوں ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ ہو۔ آپ ﷺ کی سیرت مقدسہ کے شواہد کبھی نہیں مٹ سکتے، قرآن دنیا کو یہ بتادے گا کہ اس کا لانے والا کون تھا؟ کس زمانے میں آیا؟ کس ملک میں پیدا ہوا؟ کیسی زندگی بسر کی اور اسکی زندگی کے وہ تمام حالات ہر شعبے اور ہر گوشے کے لیے ہر طبقے اور ہر گروہ کے لیے بہترین نمونہ ہیں ۔ اسی لیے آپ ﷺ کو رہبر کامل اور محسن انسانیت کہا جاتا ہے۔

2.3.4 ترک امر بالمعروف کا فتنہ:

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معنی ہیں 'اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا۔ دین اسلام کا یہ ایک اہم فریضہ ہے اور امت اسلامیہ کی تخلیق کا مقصد بھی۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور اس کی کامیابی اسی میں ہے کہ برائی سے خود بھی بچیں اور لوگوں کو بھی بچائیں۔ اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں۔ قران اور حدیث میں اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہا گیا ہے۔ قران میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (سورہ آل عمران۔104)

ترجمہ: اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھی بات کا حکم دیں اور بری بات سے منع کریں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (سورۃ توبۃ: 71)

ترجمہ: اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن پر عنقریب اللہ رحم فرمائے گا۔ بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۔

قرآن کریم کی آیات میں اولی الامر یعنی حکمرانوں اور علمائے کرام کو نیکی کے کام کرنے اور برائی سے روکنے کے لیے کہا گیا ہے۔ عہد صدیقی (حضرت ابو بکرؓ کا زمانہ) میں فتنے اٹھے اور انہوں نے دور اندیشی اور استقامت سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل پیرا ہو کر تمام فتنوں کو ختم کیا۔ اسی طرح سیدنا عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور عباسی اور عثمان خلفاء کے ادوار میں بھی کسی نہ کسی صورت میں یہ ادارہ قائم رہا۔ تذکرہ میں مولانا آزاد نے اس کا ذکر محدثین مجددین اور علمائے کرام کے حالات بیان کرنے کے دوران کیا ہے۔

2.3.5 علم الکلام:

علم الکلام وہ علم ہے جس میں خدا ے تعالیٰ کی ذات، صفات، افعال اور متعلقات سے بحث کی جاتی ہے۔ اگر ان پر کوئی عقلی شبہات وارد ہوتے ہیں، تو ان کا جواب عقلی دلائل سے دیا جاتا ہے اور شبہات دور کیے جاتے ہیں۔ دعوت انبیاء کے خلاف انسانی شکوک و شبہات و اعتراضات مختلف زمانوں میں ہوتے رہے۔ جب تک اسلام عرب کی سرزمین تک تھا بحث و نزع پیدا نہ ہوئی، لیکن جیسے جیسے اسلام کی وسعت ہوئی مختلف مذاہب کے لوگ اسلام میں آئے تو شک وشبہ میں اضافہ ہوا۔ مختلف فرقے وجود میں آئے شیعہ، سنی، خارجی، قدریہ، معتزلہ، جبریہ وغیرہ یہ اختلافات چار اصولوں پر مبنی ہیں نمبر ایک صفاتِ الٰہی کی اثبات و نفی، قدر و جبر، عقائد و اعمال، عقل و نقل۔ علم الکلام کے سبب مسائل سلجھنے کے بجائے الجھتے گئے۔ بنو امیہ کے دور میں سفاکی کا بازار گرم تھا کہ جو کچھ ہے خدا کی مرضی سے ہے۔ محدثین تحقیق اور نقل وروایت میں اتنے مصروف تھے کہ انہیں فرصت نہ تھی کہ تسلی بخش جواب دیتے اور معتقدین ان کی بات بھی مان لیتے تھے۔ فلسفہ ایک سبب تھا کہ جس کی وجہ سے مسائل سلجھنے کی بجائے الجھتے رہے۔ مولانا تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "محض چند لوگ جنہوں نے نہ تو یورپ کی کوئی زبان پڑھی تھی نہ علوم مادیہ سے واقفیت حاصل کی تھی صرف سنی سنائی باتوں اور مقلدانہ جوش عقیدت و حسن ظن بہ یورپ سے اپنے جی میں شکوک وشبہات پیدا کیے اور خود ہی پکارنا شروع کر دیا کہ علوم جدیدہ نے اسلام کا خاتمہ کر دیا، اس کے سیلاب نے مسلمانوں کے سیز دہ سالہ عقائد زیر وزبر کر دیے، اب بجز اس کے چارہ نہیں کہ اسلامی عقائد میں از سر نو ترمیم و تنسیخ کی جائے، پچھلے کیل پرزے نکال کر نیا کارخانہ ڈھالا جائے۔" (تذکرہ، ص 240)

علم الکلام میں فلسفہ اور طبیعات وغیرہ میں مہارت کی ضرورت تھی اور محدثین فلسفہ پڑھنے کے مخالف تھے۔158/ سنہ ہجری میں خلیفہ مہدی (ہارون رشید کے باپ) تخت نشین ہوا تو حکم دیا کہ مذہب اسلام پر جو شبہات کیے جاتے ہیں اس کے جواب کے لیے کتابیں تصنیف کی جائیں۔ مامون رشید کے زمانے میں فلسفیانہ مذاق پر اس فن کی تدوین کی تو انہوں نے اس کا نام "علم الکلام" رکھا۔

(علم الکلام، شبلی، ص 3)

اہل نظر فلسفے کی تنقید پر آمادہ ہوئے، اس فن میں سب سے پہلے ابو الہذیل علاف نے کتاب لکھی۔ (علم الکلام، شبلی، ص 35) اس زمانے میں خیالات کو آزادی سے ظاہر کرنا ممکن نہ تھا۔ خیالات کے اظہار کرنے پر جان کے دشمن بن جاتے تھے، کفر کے فتوے لگتے تھے، جو مسائل مذہب اسلام کے مخالف ہوں انھیں باطل قرار دے دیا جاتا تھا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ:

> "میں نے علم کلام و فلسفے کے تمام طریقوں کو خوب دیکھا بھالا، لیکن آخر میں یہی ثابت ہوا کہ نہ تو یقین کے دکھ کا یہاں علاج ہے، اور نہ شک کے اضطراب کے لیے چین۔ بہتر وا اقرب طریقہ وہی ہے جو قرآن کا ہے اور جس شخص نے میری طرح اس معاملے کا تجربہ کیا ہو گا وہ میری طرح سمجھ لے گا۔" (تذکرہ، ص 239)

2.4 تذکرہ میں مذکور اہم شخصیات

2.4.1 امام احمد بن حنبلؒ:

تذکرہ کے جملہ چونتیس ابواب میں مجتہدین اور اکابرین کا ذکر اوران کے کارناموں کا بیان ہے۔ ابتدائی چند اوراق اور آخر کے چار ابواب میں آزاد کی سوانح ملتی ہے۔ جن اکابرین اور علماء کا مولانا نے ذکر کیا ہے وہ مولانا کے ہم عصر نہیں تھے۔ تذکرہ میں شیخ جمال الدینؒ، امام ابن تیمیہؒ، شیخ علائیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، شاہ ولی اللہؒ، مجدد الف ثانیؒ کا ذکر ملتا ہے۔

امام احمد بن حنبل کے تذکرے میں مولانا آزاد نے ان کی ایمانی جرات اور استقامت کو خراج تحسین پیش کیا ہے، جس کا مظاہرہ امام نے "فتنہ خلق قرآن" کے درمیان میں کیا تھا۔ عام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن کلامی الٰہی ہے اور قدیم ہے۔ اس کے برخلاف معتزلہ کا عقیدہ ہے قرآن مخلوق ہے۔ یہ قدیم نہیں ہے۔ عباسی خلیفہ مامون کے زمانے میں ایک شخص اوب داؤد معتزلی نے مامون کو باور کرایا کہ قرآن مخلق ہے اور اس عقیدے کی اشاعت کی جانی چاہیے۔ خلیفہ نے حکم جاری کیا کہ سارے مسلمانوں کو اس عقیدے کا اقرار کرنا چاہیے۔ امام احمد بن حنبل نے خلیفہ کے اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا۔ خلیفہ کے حکم پر انہیں قید کیا گیا۔ مامون کے جانشین معتصم نے بھی امام پر زور ڈالا کہ وہ قرآن کو مخلوق مانیں، لیکن امام نے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کے لیے قرآن اور سنت سے دلیل لاؤ۔ خلیفہ کے پاس تو کوئی دلیل تھی تو نہیں، اس نے جلاد کو حکم دیا کہ امام کو کوڑے لگائے۔ "تذکرہ" میں اس وقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ اسلام میں ہر دور میں گمراہ کن فتنے اٹھتے رہے، لیکن حق تعالیٰ نے ان فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے صاحب عزیمت و استقامت امامانِ حق کو بھی کھڑا کیا۔ اسی ہی ایک صاحب عزیمت و صاحب استقامت ہستی امام احمد بن جنبل کی تھی، جنہوں نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا، انھیں قید میں ڈالا گیا اور پیروں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔ رمضان میں روزہ کی حالت میں بھوکے پیاسے جلتی دھوپ میں بٹھایا گیا، پیٹھ پر کوڑے مارے گئے۔ ایک جلاد کوڑے لگاتا اور پھر ہٹ جاتا تو پھر دوسرا تازہ دم جلاد کوڑے برساتا لیکن امام بن حنبلؒ نے حق سے منہ نہیں موڑا اور تازیانے کی ہر ضرب پر کہا کہ قرآن کلام الٰہی ہے مخلوق نہیں۔

حافظ ابن جوزی نے محمد بن اسماعیل کا قول نقل کیا ہے کہ احمد بن حنبل کو اسّی کوڑے ایسے مارے گئے کہ اگر ہاتھی کو بھی مارے جاتے، تو چیخ اٹھتا۔ مگر اس کوہِ عزم وہمّت نے اُف تک نہ کی۔ جب تک ہوش رہا، ہر ضرب پر یا تو وہی جملہ زبان سے نکلتا رہا جس کے لئے یہ سب کچھ ہو رہا تھا: القرآن کلام اللہ غیر یعنی قرآن اللہ کا کلام ہے اور مخلوق نہیں ہے۔

امام موصوف کا یہی وہ مقام ہے جس کی طرف بشر حافی نے اشارہ کیا تھا کہ امام احمد کی استقامت وثبات کی آزمایش لگاتار چار بادشاہوں نے کی۔ بعضہم بالضراء وبعضہم بالسراء مامون، معتصمؔ اور واثقؔ نے ضرب و حبس سے آزمائش کی اور متوکّلؔ نے تعظیم و تکریم اور عطاء وبخشش دنیا سے، لیکن فکان فیھا معتصما باللہ عزّوجل ان کی استقامت وعشقِ حق پر نہ تو خوفِ دنیا غالب آیا اور نہ طمع دنیا۔

(تذکرہ، ص:150)

امام موصوف کو قید کر کے طرطوس روانہ کیا گیا تو ابو بکر الاحول نے پوچھا اگر تلوار کے نیچے کھڑے کر دیئے گئے، تو کیا اس وقت مان لوگے ؟ کہا: ''نہیں''۔ ابراہیم بن مصعب کوتوال کہتا ہے کہ میں نے کسی انسان کو بادشاہوں کے آگے احمد بن حنبل سے بڑھ کر بارعب نہ پایا۔ (تذکرہ، ص:140)

حافظ ابن جوزی اور خطیب نے لکھا ہے کہ امام موصوف کا ذریعۂ معاش کاشتکاری تھا اس میں تھوڑی سی کاشتکاری کر لیتے اور اسی کے حاصل پر قانع تھے۔ زراعت کی زکوٰۃ بھی سال بسال ادا کرتے تھے۔ اور اس بارے میں ان کا عمل حضرت عمرؓ کے فرمانِ خلافت پر تھا، جو انھوں نے ارض سواد (عراق) کی نسبت نافذ فرمایا تھا ''علی کل جریب درھماً وقفیزاً۔ غور کرو یہ حال علماء سلف کا تھا اور آج جو حال علماء دنیا کی دنیا پرستیوں کا ہو رہا ہے وہ معلوم ہے یاکلون اموال الناس بالباطل الخ (حاشیہ ص۔155)

2.4.2 امام ابن تیمیہؒ:

ان کا نام احمد بن عبد الحلیم، لقب تقی الدین اور کنیت ابو العباس تھی۔ چوں کہ ان کے اجداد میں ایک بزرگ ابن تیمیہؒ تھے۔ ان کی نسبت سے "ابن تیمیہ" مشہور ہو گئے۔ علم و فضل اور تقویٰ کی وجہ سے شیخ الاسلام کہلاتے تھے۔ ابن تیمیہؒ 22 جنوری 1262 کو حران میں پیدا ہوئے۔ 27 ستمبر 1328 کو دمشق کے قید خانے میں انتقال کیا۔

مولانا آزاد نے ابن تیمیہؒ کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ابن تیمیہؒ کی شخصیت کے تمام پہلو، دعوت و تجدید کے سبب دشمنوں کی ان کے خلاف سازشیں اور ان کی دعوت کے اثرات۔ تاریخ اسلام میں اس عہد کی تفصیلات دیگر ادوار کے مقابلے میں زیادہ ملتی ہیں۔ اس زمانے میں علمی اور عملی تنزل کا بیج بار آور ہو چکا تھا۔ خلافت عباسیہ ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی۔ ایمان کے نام پر بدعت و تقلید نے مسلمانوں کو بانٹ دیا تھا۔ ابن تیمیہؒ نے قرآن و حدیث کا دعوتی کام شروع کیا۔ خلافِ شرع کیے جانے والے کاموں کو قرآن اور احادیث کی روشنی میں منع کیا اور تمام غیر اسلامی افکار سے اختلاف کیا۔ دعوتی کاموں کے سبب وہ تمام عالم میں مشہور ہو گئے۔ ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں اور ان کی مخالفت کرنے والوں کا ایک گروہ تیار ہوا، ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے، سالہا سال انہیں جیل میں قید رکھا گیا۔ ''تذکرہ'' میں آزاد لکھتے ہیں:

> "با ایں ہمہ یہ حقیقت سورج کی طرح چمک رہی ہے اور ہر صاحب بصارت پر روشن ہے کہ مقامِ عزیمتِ دعوت کا جو ایک مقامِ خاص ہے، وہ ان [مخالفین] میں سے کسی کے حصے میں بھی نہ آیا۔ وہ صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ہی کے لیے تھا۔ سب اپنے دوسرے دوسرے کاموں میں رہ گئے، لیکن انھوں نے وہ سب کام بھی ان سے بہتر کیے جو وہ سب کر رہے تھے، اور پھر ان سے بڑھ کر یہ کہ سب کو راہِ عزیمتِ دعوت، و تجدید و احیاء ملت، و رفع اعلام سنت، و اخماد شر و بدعت و کشف و ابراز معارف مستورۂ کتاب و سنت و غوامض و سرائر معارف و حکمت نبوت، و انفجار ینابیع الحکمت من اللسان والجنان، وجہاد في سبیل اللہ بالسیف والقلم واللسان میں منزلوں اپنے پیچھے چھوڑ دیا اور

علوم و اعمال وہبیہ و سماویہ کی ان بلندیوں پر تن تنہا جا کھڑے ہوئے جہاں ان کے اقران و معاصرین کے وہم و تصور کو بھی بار نہیں۔ حتیٰ کہ خود ان کے معاصرین کو یک زبان دیک قلم ہو کر اعتراف کرنا پڑا، ما راینا مثلہ و انہ مارای مثل نفسہ، نہ تو ہماری آنکھوں نے اس کا مثل دیکھا اور نہ خود اس کو اپنا سا کوئی نظر آیا۔" (تذکرہ، ابوالکلام آزاد، ساہتیہ اکادیمی، ص160۔159)

ابن تیمیہ نے اپنی تمام زندگی علمی اور دعوتی کاموں میں لگادی۔ مزاروں پر جانے اور وسیلہ بنانے سے روکا۔ جاہل علماء کی تعلیم نے مسلمانوں میں شرکیہ اعمال رائج کر دیئے تھے۔ آپ نے کتاب و سنت کی روشنی میں صحیح علم لوگوں کو دیا۔ حافظہ بلا کا تیز تھا۔ حدیثوں کو سند کے ساتھ یاد کر لیتے تھے۔ ایک بار جو کتاب پڑھ لیتے یاد ہو جاتی تھی۔ 22/ سال کی عمر میں موجودہ تمام علوم، فلسفہ، منطق، تاریخ، علم الکلام، حدیث، تفسیر، صرف و نحو میں مہارت تامہّ حاصل کر لی تھی۔ اصول تفسیر میں سب سے پہلے ابن تیمیہ نے کتاب لکھی۔ اس زمانے میں بڑے بڑے علماء گزرے لیکن ان میں امام ابن تیمیہؒ کی شان سب سے منفرد تھی۔ ابن تیمیہؒ کی عظمت اور فضیلت کے بارے میں مولانا آزاد نے حافظ ابوالعاس عمادالدین واسطی الحزامی کا درج ذیل قول نقل کیا ہے :

"شیخ ابن تیمیہؒ کا نظیر و مثیل کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ نہ علم میں نہ عمل میں، نہ حال میں نہ اخلاق میں، نہ اتباع حق اور نہ شیوۂ کرم و کمالِ حلم میں، اور نہ اللہ اور اس کے شعائر کے حفظ و قیام کی راہ میں۔ اور قسم خدا کی ہم نے اپنے زمانے میں کسی کو نہ دیکھا جس کے اقوال و افعال سے نبوت محمدی کے انوار اور ان کی سنت کی روشنیاں چھن چھن کر نکلتی ہوں، الا ابن تیمیہؒ کو ان کو دیکھ کر دل بے اختیار بول اٹھتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا حقیقی اتباع اس کو کہتے ہیں۔ اور ایسا ہوتا ہے۔"

(تذکرہ، ابوالکلام آزاد، ساہتیہ اکادمی، ص175)

سب سے اہم کام جو ابن تیمیہؒ نے انجام دیا وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے میں فلسفہ کی تردید کی، علم الکلام کا نقص واضح کیا، صوفیا سے مناظرہ کیا۔ فلسفہ اور منطق کے اصولوں کو غلط ثابت کیا، کیونکہ فلسفہ کی بنیاد عقل پر ہے۔ آپ نے قرآنی دلائل کا فلسفی دلائل سے مقابلہ کیا اور قرآنی دلائل کی فوقیت واضح کی۔

علماء اسلام نے ابن تیمیہؒ کو شیخ الاسلام، بحر العلوم، سید الحفاظ، قاطع البدعۃ اور ترجمان القرآن و السنہ جیسے القابات سے یاد کیا ہے۔ ابن دقیق العید 702/ ہجری لکھتے ہیں کہ

" جب ابن تیمیہؒ سے ملا تو میں نے ویسا آدمی نہیں پایا کہ تمام علوم اس کی نظر میں ہیں جس علم کو چاہتا ہے لے لیتا ہے جس کو چاہتا ہے چھوڑ دیتا ہے۔"

(کواکب، ص140، بحوالہ امام ابن تیمیہؒ، ص46، از غلام جیلانی برق)

شیخ بدرالدین محمد ماردینی نے آپ کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا اور اس میں آپ کے علمی مقام و مرتبہ کو خوب واضح کیا۔ ابن تیمیہؒ نے

اپنی تمام زندگی علمی اور دعوتی کاموں میں لگادی۔ حق گوئی کے سبب مسلسل سازشوں کا شکار رہے۔ سالہاسال قید رہے۔ کفر کے فتوے لگائے گئے۔ جاہل اور دنیا پرست علماء کی تعلیم نے مسلمانوں میں شرکیہ اعمال رائج کر دیئے تھے۔ ابن تیمیہؒ نے اسلام کا صحیح علم کتاب و سنت کی روشنی میں لوگوں کو دیا۔ صحیح اسلامی مسائل سے آگاہ کیا۔ آپ ایک دلیر مجاہد بھی تھے۔ 702 ہجری میں تاتاریوں نے شام پر حملہ کرنے کا عزم کیا تو لوگوں میں اضطراب بڑھ گیا تھا۔ لوگ شہر چھوڑ کر جانے لگے اور دمشق میں جمع ہونے لگے۔ آپ نے تمام مسلمانوں کو سمجھایا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ مسلمان ہیں، ان سے جنگ کرنا درست نہیں۔ ابن تیمیہ نے انھیں سمجھایا کہ تاتاری خوارج کے حکم میں ہیں۔ خوارج ہی نے سیدنا علی و معاویہؓ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ وہ اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے۔ لوگوں کو اطمینان ہوا اور مسلمان جواں مردی سے لڑے اور جنگ جیت گئے۔ امام ابن تیمیہؒ کے شاگردوں میں مشہور مفسر قرآن حافظ ابن کثیرؒ اور امام ابن قیمؒ کا نام شامل ہے۔ حافظ ابوالحاج مشری امام الحدیث تھے۔ ابن تیمیہ کے بارے میں کہتے تھے :

> ”نہ میں نے ان کا مثل دیکھا اور نہ خود انھوں نے کسی کو اپنا ہمتا پایا۔ اور نہ میں نے کسی شخص کو ان سے زیادہ کتاب و سنت کا علم رکھنے والا اور کتاب و سنت کا اتباع کرنے والا دیکھا۔ حافظ موصوف نے ایک اور موقعے پر کہا: لم یر مثلہ منذ اربع ماتہ سنۃ۔ یعنی چار سو برس سے ایسا باکمال پیدا نہیں ہوا۔
>
> (تذکرہ، ابوالکلام آزاد، ساہتیہ اکادمی، ص 161)

امام تیمیہؒ کے کمالات اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ لے کر مولانا آزاد نے اس دور میں اصلاح و عزیمتِ دعوت کے فریضہ کی اہمیت سے آگاہ کیا اور بتایا کہ تمام مسائل کا حل صرف قرآن اور سیرت پیغمبر ﷺ کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔

2.4.3 مجدد الف ثانیؒ:

حضرتؒ شیخ احمد سرہندی 26 مئی 1564 کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ تذکرہ کی تصنیف کے ضمن میں مولانا آزاد حضرت شیخ احمد سرہندی کی سیرت پر 172 صفحات پر مشتمل کتاب لکھی اور طباعت و اشاعت کے لیے مرزا فضل الدین احمد کے حوالے کر دی۔ لیکن افسوس کہ یہ کتاب شائع نہیں ہو سکی اور اس کا مسودہ بھی گم ہو گیا۔ مولانا آزاد نے شیخ احمد سرہندی کی سیرت ایک خاص جذبے اور کیفیت کے ساتھ لکھی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> "سیرت حضرت مجدد لکھتے ہوئے کچھ عجیب النشرح خاطر اور انبساط طبع بہم پہنچا جس کی کیفیت حد بیان سے باہر ہے اور یہ یقیناً اس ارادت و نسبت کا نتیجہ ہے، جو حضرت ممدوح سے اس عاجز اور اس عاجز کے خاندان کے تماما کابر کو نسلاً بعد نسلٍ حاصل رہی۔۔۔ حتیٰ کہ اس کو اپنے خمیر طینت میں ممزوج پاتا ہوں۔" (تذکرہ، ص 265-264)

چوں کہ مولانا آزاد نے حضرت مجدد کی سیرت پر ایک کتاب لکھی تھی اس لیے تذکرہ میں ان کا ذکر صرف چند جملوں میں کیا ہے۔ بعض روایات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ہر ہزار سال کے بعد تجدید دین کے لیے اللہ تعالی ایک مجدد مبعوث فرماتا

ہے چنانچہ علماء کا اتفاق ہے کہ عمر بن عبد العزیزؒ کے دوسرے ہزار سال کے مجدد آپ ہی ہیں۔ اسی لیے اپ کو مجدد الف ثانی کہتے ہیں۔ والد شیخ عبد الاحد فاروقی ممتاز عالم دین تھے کم عمری میں قرآن حفظ کرنے کے بعد سیال کوٹ جا کر مولانا کمال الدین کشمیری سے معقولات کی تکمیل کی، 17 سال کی عمر میں تمام مراحل تعلیم سے فارغ ہو کر درس و تدریس کرنے لگے۔ عہد اکبری کے اختتام اور عہد جہانگیری کی ابتدا میں بے شمار علماء و مشائخ حق موجود تھے لیکن:

> ”مفاسد وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کا وجود گرامی ہی تنہا اس کاروبار کا کفیل ہوا۔“ (تذکرہ، ص 264)

دعوت تک ہر راہرو کی رسائی ناممکن رہی۔ حضرت مجدد کے زمانے میں سینکڑوں علما و فضلا موجود تھے لیکن تجدید دین میں مجدد الف ثانی کا مرتبہ خاص تھا۔ مجدد الف ثانی نے پورے عالم اسلام اور خاص طور پر برصغیر میں اسلام کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ مجدد الف ثانی کے دور میں تجدید دین کی ایک عالمگیر تحریک کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اور آپ کی دعوتی کوششوں نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ اس وقت اسلام خارجی اور داخلی فتنوں کی زد میں تھا کم علم لوگ گمراہی میں مبتلا تھے۔ کہا جاتا ہے کہ امراء نے بادشاہ جہانگیر کو آپ کے خلاف بھڑکایا اور انہیں یقین دلایا کہ آپ باغی ہیں کیونکہ آپ بادشاہ کو تعظیمی سجدہ کرنے کے قائل نہیں۔ جہانگیر نے مجدد الف ثانی کو دربار میں طلب کیا اور سجدہ نہ کرنے کا سبب پوچھا تو آپ نے کہا۔ سجدہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے جائز نہیں یہ اللہ کا حق ہے جو اس کے کسی بندے کو نہیں دیا جا سکتا۔ اس واقعے کے سبب امرا نے بادشاہ کو آپ کے قتل کا مشورہ دیا اور اس طرح گوالیار کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ قلعے میں آپ نے تبلیغ شروع کر دی اور کئی غیر مسلم مسلمان ہو گئے۔ قلعے کی فوج میں بھی آپ کا اثر و رسوخ بڑھا۔ جہانگیر کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو رہا کر کے اپنے لشکر کے ساتھ رکھا۔ مجدد کا مقام نہایت اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے۔ مجدد کے اوصاف بیان کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> ”بڑے بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سر و سامان و اسبابِ کار فراہم نہیں۔ لیکن وقت کا عظیم فاتح اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں دیتا تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سر و سامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کر لوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیے۔ اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے۔ اگر انسانوں کی زبان گونگی ہے تو پتھروں کو چیخنا چاہیے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ درختوں کو دوڑنا چاہیے۔ اگر دشمن بے شمار ہے تو آسمان کی بجلیوں کی بھی کوئی گنتی نہیں۔ اگر رکاوٹیں اور مشکل بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہو گیا کہ راہ صاف نہیں کرتے۔ وہ زمانے کا مخلوق نہیں ہوتا کہ زمانہ اس سے چاکری کرائے، وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے اور زمانے کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ زمانہ آتا ہے تاکہ اس کی جنبشِ لب کا انتظار کرے۔ وہ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتا کہ کیا کیا ہے، جس سے دامن بھر لوں! وہ یہ دیکھنے کے لیے آتا ہے کہ کیا کیا نہیں ہے، اس کو پورا کر دوں۔ اس

کا مایۂ خمیر بخشش و نوال ہے، طلب و سوال نہیں۔ اس کی نظریں طاق کی بلندی نہیں ناپتی ہمیشہ
اپنے ہاتھ کی رسائی اور قد کی بلندی دیکھتی رہتی ہے۔" (تذکرہ، ص272)

شیخ احمد سرہندی کی وفات کے سو سال بعد شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان نے زیادہ مقبول عام کیا۔ علامہ اقبال کے یہاں نثر اور شاعری دونوں میں آپ کے افکار کی ترجمانی ملتی ہے اقبال نے کچھ اس طرح نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

2.4.4 شاہ ولی اللہؒ:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی 10 فروری 1703 کو پیدا ہوئے۔ "احمد نام، ابو الفیاض کنیت، ولی اللہ عرف، بشارتی نام، قطب الدین اور تاریخی نام، عظیم الدین مشہور ہے لیکن شاہ صاحب کی بعض دوسری صراحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین احمد ایک ہی نام ہے۔" (شاہ ولی اللہ کی قرانی فکر کا مطالعہ، ص39) ان کے والد کا نام شاہ عبد الرحیم تھا وہ ایک متقی عالم اور صوفی تھے۔

"شاہ ولی اللہ کا نسب نامہ والد ماجد کی طرف سے حضرت عمر بن خطابؓ تک پہنچتا ہے اور والدہ کی طرف
سے امام موسی کاظم سے ملتا ہے۔"

(شاہ ولی اللہ اور ان کے تجدیدی کارنامے، حکیم محمود احمد ظفر، ص45-46)

شاہ عبد الرحیم نے ہندوستان میں دینی علم کی روشنی پھیلانے کے لیے "مدرسۂ رحیمیہ" کے نام سے درسگاہ قائم کی تھی۔ شاہ ولی اللہؒ کی ابتدائی تعلیم عبد الرحیم کی نگرانی میں ہوئی۔ شاہ ولی اللہؒ نے سات سال کی عمر میں حفظ اور 10 سال میں شرح ملا جامی پڑھ لی تھی۔ 15 سال کی عمر میں والد سے تفسیر بیضاویؒ کا ایک بڑا حصہ پڑھ لیا تھا۔ علم تصوف میں کمال حاصل کیا اور 17 سال کی عمر میں والد ماجد کے گزر جانے کے بعد مدرسۂ رحیمیہ کی مسند سنبھال لی۔ شاہ ولی اللہؒ کو حکیم الامت اور مجدد ملت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ناگفتہ حالات میں مسلمانوں کے لیے ابر رحمت تھے۔ مسلمانوں کو منظم کیا، دینی علوم کی تدریس کی اور نظامِ حکومت کی تشکیل پر قلم اٹھایا۔ تذکرہ میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ تمام عوام و خواص پر تصوف کا رنگ غالب تھا۔ بجد
ے کہ اس کے سوا علماً و عملاً کوئی بات مقبول نہیں۔ لیکن تصوف صالح کا جوہر پاک جہل و بدعت کی
آمیزش سے یکسر مکدر ہو چکا تھا، بلکہ ایک طرح کی اباحت و مطلق العنانی تھی۔ جس کو طریق باطن و
اسرار سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ ملک کا ملک شریعت و علوم شریعت سے بیگانۂ محض اور اصل حقیقت یک
قلم معدوم۔ صرف خانقاہوں اور سجادہ نشینی کے سلسلوں کے جال میں پوری اقلیم جکڑ بند تھی۔
دوسری طرف عہد اکبری کی بدعات، تخت و تاجِ حکومت کے زور سے ہر طرف پھیل چکی تھی۔"

(تذکرہ، صفحہ 266)

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی یہ کیفیت تھی، جب اسلام کا وہ اختر تاباں نمودار ہوا جس کو دنیا شاہ ولی اللہؒ کے نام سے

جانتی ہے مغلیہ سلطنت کا آفتاب لبِ بام تھا۔ مسلمانوں میں رسوم و بدعات کا زور تھا۔ جھوٹے فقرا اور مشائخ جابجا اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے اور اپنے بزرگوں کی مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے۔ مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق وحکمت کے ہنگاموں سے پر شور تھا۔ فقہ و فتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیش نظر تھی۔ مسائل فقہ میں تحقیق و تدقیق سب سے بڑا جرم تھا۔ عوام تو عوام خواص تک قرآن پاک کے معنی و مطالب کے احکام و ارشادات اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے۔ شاہ صاحب کا وجود اس عہد میں اہل ہند کے لیے موہبت عظمیٰ اور عطیہ کبریٰ تھا۔"

شاہ ولی اللہؒ ایک سماجی مصلح، سیاسی مبصر، معاشی اصلاحات کے داعی اور روحانی پیشوا تھے۔ انہوں نے ہر مسئلے کو کتاب و سنت اور محقق کی نظر سے پیش کیا۔ ایک مصنف کی حیثیت سے آپ کا درجہ بلند ہے۔ حکیمانہ خیالات علمی مضامین اور عربی میں نعتیہ قصائد اور فارسی میں کچھ غزلیں اور رباعیاں ملتی ہیں۔ نعتیہ قصائد کی کتاب (اطیب النعم فی مدح سید العرب والعجم) ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے قران مجید کا فارسی ترجمہ "فتح الرحمن" کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ برصغیر میں قران کریم کا پہلا ترجمہ ہے۔ اس کے بعد دوسری زبانوں میں ترجمے کے لیے لوگ سامنے آئے۔ اس طرح لوگوں کو یہ بات سمجھ میں آئی کہ قرآن کا مقصد انسان کی ہدایت ہے۔ اس ترجمے کے سبب عام لوگوں کو کلام الہی سمجھنا آسان ہوا اور پورے ہندوستان میں اس کی شہرت ہوئی۔ شاہ صاحب نے علم تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف پر کئی کتابیں لکھیں۔ مسلمانوں کے فرقوں کے اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ پیری مریدی کے طریقوں کو غلط راستے سے ہٹایا۔ آپ کی سب سے مشہور کتاب "حجت اللہ البالغہ" ہے جو دنیا بھر میں مشہور ہے اس میں اسلامی عقائد، اسلامی تعلیمات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ اسلامی ریاست اور اس کے نظام پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی جس کا نام " ازالۃ الخفاء" ہے۔ اللہ کے مقدس بندوں پر اکثر کفر کا فتوی لگایا گیا۔ آپ پر بھی کفر کا فتوی لگایا گیا لیکن سارے ہندوستان میں آپ کی شاگرد پھیل گئے تھے۔ آپ کی وفات 29/ محرم 1176ھ ہجری 11/ اگست 1772ء عیسوی کو ہوئی۔

مولانا آزاد کے والد شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کے شاگرد تھے اور ان کا تذکرہ گھر میں ہوا کرتا تھا اسی لیے آزاد شاہ ولی اللہؒ کے نام سے ابتدا ہی سے واقف تھے۔ "عقید الجید" اور "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف"، رسالوں کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا۔ آزاد اپنی "خودنوشت" میں لکھتے ہیں:

"انہی مباحث نے ایک بڑا دروازہ مطالعہ کا کھولا۔ آگے چل کر یہ میری زندگی کے خاص موثرات میں سے ثابت ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔ ابتدا میں کچھ ٹھیک اندازہ نہ کر سکا لیکن جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا اور ان کی دیگر تصانیف سے ذوق ہوتا گیا ان کا مسلک نمایاں ہوتا گیا۔"

(خودنوشت، مولانا آزاد، صفحہ نمبر. 6 22)

2.4.5 شیخ جمال الدینؒ:

شیخ جمال الدین دہلوی المعروف بہلول دہلوی

تذکرہ کے پہلے باب میں شیخ جمال الدین کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ شیخ جمال الدین دہلوی مولانا آزاد کے پر داداشاہ محمد افضل کے مادری سلسلے کے ایک بزرگ تھے۔ شیخ جمال الدین پہلے شیخ ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان میں علم حدیث کا چرچہ ہوا۔ آپ عہد اکبر کے معروف علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ انہوں نے " صحیح بخاری" کی فارسی شرح لکھی تھی جو "کتاب النکاح "تک مکمل ہوئی تھی۔ان کی دوسری تصنیف "اصول بزدودی" کی شرح ہے۔وہ علمِ طریقت اور دیگر علوم کی درس و تدریس کے ماہر استاد تسلیم کیے جاتے تھے اس لیے طلبہ دور دور سے فیض یاب ہونے آتے تھے۔ شیخ جمال الدین کے تفصیلی حالات نہیں ملتے ہیں۔ ان کا وطن دہلی تھا طریقت کی تکمیل شیخ محمد داؤد جنبی والؒ کی زیر سرپرستی کی اور علوم معقول و منقول میں سید رفیع الدین اسلامی شیرازی کے شاگرد تھے۔ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں ہندوستان آئے اور یہیں مقیم ہوگئے۔ سلطان سکندر سے سلیم شاہ تک شاہان ہند کے خدمت گزار رہے۔ بڑے بڑے علمائے وقت نے فنِ حدیث میں ان کی شاگردی اختیار کی۔ ہمایوں کو جب شیر شاہ سے شکست ہوئی اور آگرہ آیا تو سید موصوف کے مکان پر جا کر طالبِ دعا ہوا۔ تذکرہ کے واقعات میں ہے کہ ایران جانے کا مشورہ سید موصوف ہی نے دیا تھا۔ ملا بدایونی " منتخب التواریخ"میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں درس علم وحدیث کے فروغ کے سلسلے میں شیخ جمال الدینؒ کی نمایاں خدمات ہیں۔

ملا بدایونی نے "منتخب التواریخ" میں لکھا ہے:

> " علم حدیث را خوب ورزیدہ در صحبت اہل فقر و فنا رسیدہ، مدت مدید یست کہ لذت آں وادی دریافتہ، و توفیق استقامت و استدامت بر آں رفیق او گشتہ، با اہل دنیا کارے ندارد، و با فادہ و افاضہ طلاب العلم مشغول است۔ علم حدیث میں خوب مشق بہم پہنچائی تھی۔ فقیروں اللہ کی یاد میں گم لوگوں کی صحبت میں پہنچے۔ طویل مدت تک اس وادی کی لذت حاصل کرتے رہے۔ استقامت اور استدامت (ہمیشگی) ان کی رفیق رہی۔ اہل دنیا سے انہیں کام نہ تھا۔ طلبا کو فائدہ اور فیض پہنچانے میں مصروف رہتے۔" (خود نوشت آزاد، ص 38)

شیخ جمال الدین دہلی (ہندوستان) سے قطع تعلق کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے جس کے مختلف اسباب "تذکرۃ الواصلین" میں ملتے ہیں اس کا ایک اہم سبب تو محضر امامت کا واقعہ ہے اور دوسرا اتہام مہدویت میں۔

محضر امامت کا معاملہ:

اکبر کے محضر امامت پر تمام علمائے دارالحکومت نے اپنی مہر ثبت کی یہ محضر جب دہلی آیا تو آپ نے انکار کر دیا اور علماء مشرق نے بادشاہ کے خلاف فتوی دیا کہ اکبر شریعت سے منحرف ہو گیا ہے۔ دربار حکومت کو علمائے دہلی پر شبہ ہوا کہ ان میں شیخ موصوف بھی شامل ہیں۔ جب حالات بگڑنے لگے تو حج کا ارادہ کیا اور اپنے مریدین اور تلامذہ کے ساتھ مکہ معظمہ چلے گئے۔

اتہام مہدویت:

علمائے دربار طائفہ مہدویہ کے قتل و تعزیر میں کوشاں رہتے تھے۔ جب شیخ عبداللہ نیازی اور ان کے جماعت کے فقراء مبتلاءِ رنج و محن ہوئے تو شیخ جمال الدین نے فرمایا کہ ان مظلوموں کا خون عنقریب رنگ لائے گا اور افغانیوں کی حکومت زیادہ عرصے باقی نہیں رہے گی۔ معاندین نے شیخ کو مہدویت سے متہم کیا۔ بڑے بڑے علماء کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑا شیخ نے الگ ایک کتاب بھی تحریر کی تاکہ حق کو واضح کر سکے لیکن مخالفین کا عناد بڑھ چکا تھا۔ ان اسباب کی بنا پر مکہ معظمہ چلے گئے اور ۱۳/ سال وہیں رہے۔ خان اعظم مرزا کوکلتاش (جو شیخ جمال الدین کے بڑے معتقد تھے) جب حج کو گئے تو بڑے اصرار کے بعد انہیں ہندوستان واپس لائے لیکن دہلی پہنچنے کے چند ماہ بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ (خود نوشت، ص38)

2.5 تذکرہ میں مولانا آزاد کے اسلاف اور خاندانی حالات

تذکرہ دو جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی جلد میں مولانا آزاد کے خاندانی حالات کا تذکرہ ہے۔ دوسری جلد کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں آزاد کے خاندان کے بقیہ حالات اور دوسرے حصے میں خود آزاد کی سوانح عمری لکھی ہے۔ تذکرے کے ابتدائی صفحات میں خاندان کا تعارف پیش کیا گیا ہے اور اگلے ابواب میں ان کے خاندانی بزرگوں کے حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اپنی سوانح لکھنے سے پہلے مولانا نے ان علماء مشائخ کا تفصیلی جائزہ اس لیے پیش کیا کہ یہ وہ بزرگ، علماءِ سلف و مجددین ہیں جو دعوت و اصلاح اور عزیمتِ دعوت کے لیے تمام زندگی کوشاں رہے۔ آزاد لکھتے ہیں:

> ”پس بلاشبہ اس کو اللہ تعالی کا فضل و کرم یقین کرتا ہوں کہ مجھ کو ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جس میں صدیوں سے سلسلۂ علم و ارشاد قائم و جاری ہے اور جس کے اسلاف اکرام کے اعمال صالحہ کا پاک ورثہ یکے بعد دیگرے اخلاف تک منتقل ہوتا آیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جس کے اخلاف کو حق گوئی و حق پرستی اور طریق استقامت و عشق حق میں سرفروشی و جاں سپاری اور مغروران تاج و تخت و بندگان مال و جاہ کے مقابلے میں بے نیازی اور سرگرانی ہمیشہ اپنے اسلاف کے ورثے میں ملی ہے۔ اسی کو اپنا موروثی خزانہ اور اسی کو اپنا خاندانی تخت و تاج سمجھتا ہوں۔“ (تذکرہ، ص 29)

مولانا آزاد اس بات کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ انسان کی سیرت و اخلاق اور عادات و اطوار، خاندان کی مٹی سے بنتے ہیں اور ان کا عکس آنے والی نسلوں میں صاف نظر آتا ہے۔ آزاد اپنے اسلاف اور خاندان کے علمی کارناموں سے بے حد متاثر تھے۔ اسی لیے اپنے خاندانی اوصاف کا اثر مولانا پر پڑھنا فطری بات ہے۔ مولانا آزاد کے اسلاف اور خاندان کا جب تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں تو پس پردہ مولانا آزاد کی ذات کا عکس موجود نظر آتا ہے۔ تذکرے میں خاندان کے بزرگوں کے تفصیلی حالات بیان کرنے سے پہلے ابتدائی صفحات میں خاندان کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا ہے لکھتے ہیں:

> ”میرے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہوئے ہیں اور تینوں خاندان ہندوستان و حجاز کے ممتاز

بیوت علم و فضل اور اصحاب ارشاد و ہدایت میں سے ہیں۔ دنیوی عزت و جاہ کی اگرچہ ان میں سے کسی نے خواہش نہیں کی لیکن دنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ ان کے سامنے پیش کیا اور کبھی انہوں نے قبول کیا کبھی رد کر دیا۔" (تذکرہ، ص 25)

مولانا آزاد نے جن تین خاندانوں کا ذکر کیا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

1) مولانا آزاد کی والدہ ماجدہ کا خاندان
2) مولانا آزاد کے والد مرحوم کے نانا کا خاندان
3) مولانا آزاد کے دادا کا خاندان

تذکرے میں مولانا آزاد نے اس کی تفصیلات یوں لکھی ہے:

"میری والدہ حضرت شیخ محمد بن ظاہر وتری مفتی، مدینہ منورہ کی بھانجی تھی جو گزشتہ دور کے اکثر علمائے حجاز کے استاذ حدیث اور شیخ عبداللہ سراج کے بعد مکہ معظمہ کے آخری محدث تھے۔ ان کے بعد اس درجے کا کوئی شیخ حدیث حرمین میں پیدا نہیں ہوا۔ میرے دادا مولانا محمد ہادی دہلی مرحوم کے ایک مشہور خاندان علم و فضیلت سے تعلق رکھتے تھے جس میں بیک وقت پانچ پانچ علمائے درس و افتاء و اصحاب سلوک و طریقت پیدا ہوئے ہیں۔ والد مرحوم کے نانا رکن المدرسین مولانا منور الدین اپنے عہد کے مشاہیر اساتذہ علم و درس اور اصحاب طریقت و سلوک میں سے تھے اور ان مخصوص اصحاب کمال میں سے جن کو اللہ تعالی علوم ظاہر و باطن کی جامعیت عطا فرماتا ہے۔ ان کا شمار حضرت شاہ عبدالعزیز کے اجلّہ تلامذہ میں تھا، اور وہ سلطنت مغلیہ کے آخری " رکن المدرسین" تھے ان کے شاگردوں اور مریدوں میں ایسے ارباب کمال ہوئے جو اپنے عہد کے ممتاز بزرگوں میں شمار کیے گئے۔ ان کے والد، مولانا رشید الدین، صوبہ لاہور کے " قاضی القضاۃ" اور احمد شاہ ابدالی کی جانب سے نائب سلطنت پنجاب کے مشیر تھے، اور ان کے والد شیخ صدر الدین ہرات کے مشائخ طریقت میں معدود، اور وہاں کے خاندان قضاۃ کے ایک رکن تھے۔" (تذکرہ، ص 26)

مولانا آزاد نے ان تینوں خاندانوں کے اثرات قبول کیے۔ یہ تینوں خاندان علم و فضل کے مرکز رہے ہیں۔ مولانا آزاد کو اپنے حسب و نسب اور خاندان کی عظمت پر فخر ضرور تھا لیکن وہ " پدرم سلطان بود" کے قائل نہ تھے۔ پیری مریدی جیسے دیرینہ روایت سے انحراف کیا۔ مولانا آزاد ذاتی اوصاف و کمالات اور خود حاصل کردہ علم و عمل کے قائل تھے۔ اپنے زور بازو، جوہر ذاتی اور علمیت سے کوئی کارنامہ انجام دینے کو اہمیت دیتے تھے۔

2.6 تذکرہ کی زبان و بیان اور اسلوب

2.6.1 زبان و بیان کی خصوصیات:

مولانا آزاد کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوئی تھی۔ والدہ عرب نژاد تھیں اس لیے ان کی مادری زبان عربی تھی۔ تعلیم فارسی اور اردو کتابوں سے حاصل کی اسی لیے عربی اور فارسی کے استعمال کے سبب تذکرہ کی عبارت عام فہم نہیں ہے۔ تذکرے کا یہ پیرا گراف دیکھیے۔

> " اس زمانے میں حیلہ تراشیوں کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ یہ کتاب و سنت سے بعد و ہجر، اور ترک براہین و یقینیاتِ شرعیہ و تشبّث بظن و تخمین بحث و تخرص و تلعّب بظلماتِ اوہام واہواء و قیاس غیر صالح و غیر موید بالوحی کے شجرۃ الزقوم کے ابتدائی برگ و بار تھے، جو آگے چل کر اس قدر پھلے پھولے کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ ان کے ثمراتِ ردئیہ و خسیسہ سے خالی نہ رہا اور وہ شریعتِ الاہیہ جس کی نسبت کہا گیا تھا کہ " السّمحۃ الحنیفیہ والمحجۃ البیضاء لیلا کنھارھا" طرح طرح کے ظنونِ فاسدہ، و آرائے متشتّتہ و قیاساتِ متخالفہ و سُبُلِ متفرقہ وطرائقِ قددا و قواعدِ متناقضہ وہ تاویل الجاہلین وہ انتحال المبطلین و حیل المتحیلین واقیسۃ القیاسین ظُلُمَاتٌ بَعْضُھَا فَوْقَ بَعْضٍ کا مجموعہ بنادی گئی۔"
>
> (تذکرہ، ص 86-87)

درج بالا اقتباس پر اگر غور کیا جائے تو ہر جملہ فارسی اور عربی الفاظ کے استعمال سے معمور ہے۔ اگرچہ اس طرح کے انداز تحریر کو ثقالت سے تعبیر کیا گیا ہے جو عام فہم نہیں۔ مولانا آزاد کو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی اور الفاظ کا ایک بے بہا ذخیرہ تھا جسے جس طرح چاہتے استعمال کر لیتے، نئی تراکیب بنالیتے، اس طرح مولانا اپنے طرز تحریر کے خود موجد ہیں جو انھیں سے شروع اور انھیں پر ختم ہوا۔

2.6.2 اسلوب کی خصوصیات:

تذکرہ چونکہ الہلالی دور کی تصنیف ہے اس لیے اس کا اسلوب الہلال سے ہم آہنگ ہے یہ اسلوب خطیبانہ ہے تذکرے میں اسلاف یا بزرگان دین کے ذکر کا مقصد قوم کو بیدار کرنے، ضمیر کو جگانے اور اس اصلاح کرنے سے ہے۔ اس لیے جو اسلوب نظر آتا ہے وہ خطیبانہ ہے جس میں قاری کو جوش دلانا اور للکارنا ضروری ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی آزاد کے اسلوب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> " آزاد کا اسلوب نگارش محض خطیبانہ نہیں ہے اس میں تزئین کلام کے نقوش بھی نمایاں ہیں۔ تشبیہ، استعارہ، کنایہ، ضرب المثل اور قول محال سب کا بہ کثرت استعمال آزاد کے بیانات و عبارات میں ہوتا ہے۔ وسیلہ اظہار کے یہ محاسن نثر کو شعر بنانے کے لیے ہرگز استعمال نہیں کیے گئے ہیں بلکہ ان کا واحد مقصد نثر کو زیادہ سے زیادہ حسین سلیس اور پُر اثر بناتا ہے۔"

(عبدالمغنی، ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش، ایم کے افسیٹ پرنٹس، دہلی 1991، ص 69)

تذکرہ کا ہر جملہ اپنے اندر ایک وسیع معنی رکھتا ہے۔ اسلوب نہ صرف عالمانہ ہے بلکہ اس میں تاریخ، تحقیق اور زبان کی ساحرانہ کیفیت موجود ہے۔ درمیان میں پیش کیے گئے اشعار، احادیث اور آیتیں تحریر کے معنی و مطالب میں گہرائی پیدا کرتے ہیں۔ مولانا آزاد کے اسلوب کی انفرادیت کا ایک سبب قرآن، احادیث، عربی لغات پر بے پناہ دسترس ہے۔ ادبیات عرب، قرآن اور احادیث کے گہرائی سے مطالعہ کے سبب تذکرہ میں قدم قدم پر عربی فارسی الفاظ محاورات اور اشعار کا برجستہ استعمال کیا گیا ہے۔ آزاد کی تحریروں میں علمی و ادبی رنگ شامل ہے۔ تحریر میں نثر و نظم کا امتزاج ہے۔ بے شمار اشعار عربی فارسی اور اردو کے دلائل کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں، عبارت کہیں مسجع و مرصع اور تکرارِ لفظی لیے ہوئے ہیں۔ تذکرے کا ایک تہائی حصہ عربی اشعار، قرآنی آیات اور احادیث پر مبنی ہے۔ تذکرے کی تحریر میں محاکات کا اظہار ہے، اکثر محسوس پیکروں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ تذکرے کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

> ”سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے، لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہو جا سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو، وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ان کا سرمایہ ناز علمِ حق نہیں ہے، جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سبلِ متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراط مستقیم پر چلاتا ہے، بلکہ یکسر علم جدل و خلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر دیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز کرتی رہتی ہے۔“
>
> (تذکرہ، ص 104)

تذکرہ میں تکرار اور بے جا طولِ کلام بہت ہے، جس کا اعتراف خود آزاد نے کیا ہے۔ تذکرے کے آخری ابواب جہاں مولانا نے اپنی ذاتی سوانح لکھی ہے وہاں لہجہ عالمانہ اور ادبیت سے معمور ہے۔ آزاد کے ہم عصروں میں شبلی، حالی، سر سید، مولانا محمد حسین آزاد کی نثر کے مقابلے مولانا آزاد کی نثر ایک عام قاری کے لیے مشکل ہو جاتی ہے۔ آزاد کی اس نثر نے اسلوب کی نئی بنیاد ڈالی جو آزاد کی شناخت ہے۔

2.7 تذکرہ کی ادبی و فنی خوبیاں اور خامیاں

”تذکرہ“ ایک بیش قیمتی ادبی سرمایہ ہے گو کہ فنی اعتبار سے خود نوشت کے اصولوں پر مبنی نہیں ہے۔ تذکرے میں آزاد نے ان علمائے حق کی داستان بیان کی ہے جس نے عالم اسلام پر چھائی تاریکی اور غفلت کے پردے کو چاک کر کے حق کی آواز بلند کی۔ تذکرے میں مولانا آزاد کے سوانحی حالات نہیں ملتے لیکن علمائے حق کے تذکرے کے پس پردہ آزاد کی زندگی کی پرچھائیں صاف نظر آتی ہے آپ کی زندگی کے حالات جذبات و احساسات اور اسلام کے تئں آپ کا نظریہ وغیرہ۔ تذکرے میں سب سے زیادہ طویل بحث شیخ جمال الدین افغانی کے متعلق ہے۔ قاری مطالعہ کے دوران یہ محسوس کرتا ہے کہ آزاد نے تکرار اور طوالت سے کام لیا ہے، (جس بات کا اقرار تذکرے میں خود کیا ہے) اور کہیں کہیں غلو سے بھی کام لیا لیکن اس کا مقصد بات کو وضاحت سے سمجھانا ہے۔ آزاد نے وعظ اور نصیحت کی روش اختیار کی، جو

سوانحی فن کے لیے موضوع نہیں۔ اس ادب پارے کی سب سے بڑی خوبی اس کا شاعرانہ لب ولہجہ ہے فارسی اور عربی اشعار کا جابہ جا استعمال آزاد کی داخلی کیفیت اور ان کے علمی تبحر اور مرتبے کو ظاہر کرتا ہے لیکن علمی اصطلاحات، استعارات و کنایات اور تلمیحات عربی اور فارسی کے الفاظ کے استعمال سے نثر عام فہم نہیں اور اس طرح کے انداز تحریر پر نکتہ چینی بھی کی گئی ہے کہ اس طرح کی تحریر صرف خواص یا اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر تذکرہ ایک پر جوش مخاطبہ ہے جس میں مذہبی واخلاقی مسائل جذباتی انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔

2.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد کی خود نشت سوانح عمری کا پہلا حصہ ہے۔
- یہ کتاب مولانا آزاد نے اپنے ایک قدرداں فضل الدین احمد مرزا کے پیہم اصرار پر رانچی میں اپنی نظر بندی کے دوران جون 1916 سے اکتوبر 1916 کے درمیان پانچ ماہ کی مدت میں لکھی۔
- تذکرہ کا پہلا ایڈیشن 1910 میں الہلال پریس کلکتہ سے شائع ہوا۔
- یہ کتاب 38 ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائی 34 ابواب میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اجداد کے علاوہ بعض دیگر ائمہ ،اکابرین، مجتہدین، مجدین اور ارباب عزیمت کا ذکر کیا ہے۔ آخر کے چار ابواب میں اپنے خاندان کے حالات لکھے ہیں۔
- تذکرہ میں سیرت نگاری اور تاریخ کا امتزاج نظر آتا ہے۔ اس میں اصل موضوع سے زیادہ ضمنی مطالب اور مولانا آزاد سے زیادہ دوسروں کے حالات وواقعات پیش کیے گئے ہیں۔
- تذکرہ میں مولانا آزاد نے جن ضمنی موضوعات پر بحث کی ہے ان کے عنوانات درج ذیل ہیں:

  الف: عزیمت دعوت

  ب: تجدید واحیائے دین

  ج: سیر النبی ﷺ کے مطالعے کی اہمیت

  د: ترک امر بالمعروف کا فتنہ

- تذکرہ میں مولانا آزاد نے اپنے اسلاف خاندان کے علاوہ جن بلند مرتبت اور صاحب دعوت و عزیمت علمائے سلف کا ذکر کیا ہے ان کے نام اس طرح ہیں:

(i) امام احمد بن حنبلؒ (ii) امام ابن تیمیہؒ (iii) مجدد الف ثانیؒ (iv) شاہ ولی اللہؒ

- ان میں مولانا آزاد نے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کے حالات وکارناموں کا سب سے زیادہ تفصیلی ذکر کیا ہے۔
- اپنے خاندان کے بزرگوں میں شیخ جمال الدین کے احوال تفصیل سے بیان کیے ہیں۔
- مولانا آزاد کے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع تھے، جن کا ذکر مولانا آزاد نے اس طرح کیا ہے:

(i) مولانا آزاد کی والدہ ماجدہ کا خاندان

(ii) مولانا آزاد کے والد مرحوم کے نانا کا خاندان

(ii) مولانا آزاد کے دادا کا خاندان

- تذکرہ کے اصل مسودے کے پہلے باب میں مولانا آزاد نے اپنے پر دادا شاہ محمد افضل کے ننھیالی سلسلے کے بزرگ حضرت شیخ جمال الدین کے حالات بیان کیے ہیں۔
- دوسرے باب میں شیخ جمال الدین کے فرزند شیخ محمد کے حالات لکھے تھے اور تیسرے باب میں اپنے پر دادا شاہ محمد افضل اور اپنے والد (مولانا خیر الدین) کے نانا مولانا منور الدین کے سوانح تحریر کیے تھے۔
- یہ دونوں باب (باب دوم اور سوم) تذکرہ کے مجوزہ دوسرے حصے میں مولانا آزاد کے حالات کے ساتھ شائع کیے جانے تھے، لیکن یہ دوسرا حصہ تذکرہ کے مرتب فضل الدین احمد مرزا کے انتقال کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا اور اس کا مسودہ بھی گم ہو گیا۔
- تذکرہ کی زبان نہایت ادق اور عربی و فارسی آمیز ہے۔ اس کا اسلوب خطیبانہ ہے۔
- اس میں بکثرت قرآنی آیات، احادیث اور عربی و فارسی اشعار کا استعمال کیا گیا ہے۔
- اس میں اصل موضوع سے زیادہ ضمنی موضوعات پر توجہ دی گئی ہے، جس کی وجہ سے مضامین کی تکرار اور بے جا طوالت کا احساس ہوتا ہے۔
- فنی حیثیت سے یہ کتاب خود نوشت سوانح کے معیار کی تکمیل نہیں کرتی۔

2.9 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
عزیمت	:	مقصد، ارادہ
تجدید	:	ایجاد، اختراع، نئے سرے سے کام شروع کرنا
مجدد	:	جو شخص دین کو اثر نو زندہ و تازہ کرتا ہے
اتہام	:	الزام، تہمت، بہتان
اسلاف	:	سلف کی جمع، بزرگ
محضر	:	وہ کاغذ جس پر قاضی اپنی مہر ثبت کرتا ہے
اکابرین	:	اکبر کی جمع، بڑے لوگ
خرقہ	:	درویشوں کا لباس، پیوند لگا کپڑا
امر بالمعروف نہی عن المنکر	:	نیک کاموں کا حکم اور برائی سے روکنا

2.10 نمونہ امتحانی سوالات

2.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کی تصنیف "تذکرہ" کا تعلق کس صنف سے ہے؟
2. مولانا آزاد نے "تذکرہ" کتنے عرصے میں لکھی؟
3. تذکرہ پہلی مرتبہ کب شائع ہوئی؟
4. کس کے اصرار پر مولانا آزاد نے تذکرہ تصنیف کی؟
5. مولانا آزاد نے تذکرہ کی تصنیف کس مقام پر کی؟
6. شیخ جمال الدین دہلوی کون تھے؟
7. تذکرہ کے دوسرے مرتب کون ہیں؟
8. "مدرسہ رحیمیہ" نامی درس گاہ کس نے قائم کی؟
9. "حجت اللہ البالغہ" کس کی تصنیف ہے؟
10. تذکرہ میں شیخ احمد سرہندی کا ذکر سب سے زیادہ تفصیل سے کیوں ہے؟

2.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. علم الکلام کی مختصراً تعریف کیجیے۔
2. تجدید احیائے دین سے کیا مراد لی گئی ہے؟ بیان کیجیے۔
3. سیرت النبی ﷺ کے مطالعے کی اہمیت بیان کیجیے۔
4. عزیمت دعوت کے مفہوم کو سمجھائیے۔
5. مندرجہ ذیل شخصیات پر مختصراً لکھیے۔

(1) امام احمد بن حنبلؒ (2) امام ابن تیمیہؒ (3) مجدد الف ثانیؒ

2.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کے خاندان کے بزرگ شیخ جمال الدین کے حالات پر روشنی ڈالیے۔
2. مولانا آزاد کے اسلاف اور خاندان کی تفصیلی معلومات دیجیے۔
3. تذکرے میں زبان و بیان کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے آزاد کے اسلوب کا جائزہ لیجیے۔

2.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد (مرتبہ مالک رام)
2. خود نوشت	مولانا ابوالکلام آزاد
3. سیرت النبی ﷺ	علامہ شبلی نعمانیؒ معہ اضافہ وہ تکملہ سید سلیمان ندوی
4. علم الکلام	علامہ شبلی نعمانیؒ
5. شاہ ولی اللہؒ اور ان کے تجدیدی کارنامے	حکیم محمود احمد ظفر
6. شاہ ولی اللہؒ کی قرآنی فکر کا مطالعہ	مولانا محمد مسعود عالم قاسمی
7. ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش	عبدالمغنی

اکائی 3 : مولانا آزاد معاصرین کی نظر میں

اکائی کے اجزا

3.0		تمہید
3.1		مقاصد
3.2		مولانا آزاد کی ذاتی شخصیت و کردار: معاصرین کی نظر میں
	3.2.1	مولانا آزاد کے نام پر ماہرین کی رائے
	3.2.2	مولانا آزاد کی وجاہت ناظرین کی نظر میں
	3.2.3	مولانا آزاد کے بچپن کے بارے میں معاصرین کا اظہارِ خیال
3.3		مولانا آزاد کا علمی و قار و مرتبہ ہمعصر دانشوروں کی نگاہ میں
3.4		مولانا آزاد کی صحافت ماہرین کی نظر میں
3.5		مولانا آزاد کے ارتحال پر معاصرینِ عالم کا خراجِ عقیدت
3.6		اکتسابی نتائج
3.7		کلیدی الفاظ
3.8		نمونہ امتحانی سوالات
	3.8.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	3.8.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	3.8.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
3.9		تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

مولانا ابوالکلام آزاد کی حیات و خدمات تاریخ ہند کا ایسا زریں باب ہیں جسے پڑھنے اور سننے والا ہر کس و ناکس دیر تک اس کی تابناکیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت تاریخی بھی ہے اور تاریخ ساز بھی۔ انہوں نے اپنی مومنانہ فراست، سیاسی دانشمندی اور قائدانہ بصیرت سے جد و جہد آزادی کو مہمیز کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا دور اس اعتبار سے تاریخ ہند کا عہد زریں ہے ان کے معاصرن ہندوستان میں دانشوروں کی ایک کہکشاں ملک کے بہتر مستقبل اور اس کے ارتقا کی راہوں کو ہموار کرنے میں مصروف عمل تھی۔ اپنی

منفرد سوچ اور مخصوص اندازِ فکر سے ہندوستان کے عظیم علمی، ادبی، سیاسی اور قومی رہنماؤں مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، سردار پٹیل، مولانا محمد علی جوہر، الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی اور دیگر اکابرین کے درمیان شمع محفل کا درجہ حاصل کیا۔ مولانا آزاد کی پُر وقار شخصیت ہمہ جہت، متنوع اور گوناگوں صفات سے متصف تھی۔ ان کی شخصیت کا ہر پہلو بڑا واضح اور انتہائی تابناک ہے۔ وہبی کسبی اور موروثی صلاحیتوں کا جو امتزاج آزاد کی شخصیت میں نظر آتا ہے اس کی نظیر خال خال ہی ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ، تفسیر ، ادب، صحافت، سیاست اور خطابت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر انہیں مہارت حاصل نہ ہو، آزاد کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شخصیت کو کسی ایک میدان تک محدود نہیں رکھا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو بقول نیاز فتح پوری "وہ اس میدان کا معتبر نام ہوتے" آزاد کی تحریر کی روانی، تقریر کی جادو بیانی، نثر کی دل آویزی، صحافت کی بلند آہنگی، سیاست کی بیدار مغزی، عزم و حوصلہ کی پختگی، فہم و فراست کی تیزی، علومِ اسلامیہ کی مہارت و پختہ کاری اور مجتہدانہ بصیرت آج بھی ناقدین و محققین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کر سکیں۔
- مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت کے بارے میں معاصرین کے نظریات بیان کر سکیں۔
- مولانا آزاد کی سیاسی خدمات کے متعلق معاصر دانشوروں کے خیالات کی وضاحت کر سکیں۔
- مولانا آزاد کی قومی خدمات کے بارے میں مبصرین کے نظریات پر گفتگو کر سکیں۔
- مولانا آزاد کے مذہبی نظریات کے بارے میں ہم عصر دانشوروں کے خیالات کا جائزہ لے سکیں۔
- مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی و ادبی خدمات کے بارے میں معاصرین کی آرا پر گفتگو سکیں۔

3.2 مولانا آزاد کی شخصیت و کردار معاصرین کی نظر میں

3.2.1 مولانا آزاد کے نام پر ماہرین کی رائے:

مولانا ابوالکلام آزاد کے والد نے ان کا تاریخی نام فیروز بخت رکھا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنا یہ نام غالباً کبھی استعمال نہیں کیا۔ مختلف موقعوں پر انہوں نے اپنا نام مختلف انداز میں لکھا ہے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مولانا نے 1900 میں اپنے دوست عبدالرزاق کانپوری کو خط لکھا اور اس میں اپنا نام غلام محی الدین آزاد لکھا۔ جنوری 1900ء کے خدنگ نظر لکھنو میں بھی ان کا یہی نام چھپا ہے۔ دو سال بعد مخزن میں ان کا نام "ابو الکلام محی الدین احمد آزاد چھپا۔ نومبر 1903ء میں مولانا نے ماہانہ لسان الصدق" جاری کیا تو اس پر ایڈیٹر کی حیثیت سے اُن کا نام ابو الکلام آزاد دہلوی لکھا تھا۔ 13 جولائی 1913ء کو ہفت روزہ الہلال" جاری ہوا تو اس پر مدیر مسئول اور محرر خصوصی کے طور پر مولانا کا نام احمد المکنی بابی الکلام آزاد الدہلوی چھپا، پانچ سال بعد تذکرہ" میں احمد" ملتا ہے۔

مولانا کی ایک تصنیف رسالہ مسئلہ خلافت و جزیرہ عرب مطبوعہ البلاغ پریس کلکتہ میں ان کا نام ابو الکلام دیا گیا ہے نقش آزاد میں شامل خط 17 میں مولانا لکھتے ہیں۔ نام ابو الکلام آزاد... احمد سے لوگ آشنا نہیں گو نام وہی ہے۔ 1903ء میں ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی تو اس پر ان کا نام ابو الکلام احمد چھپا تھا۔ غبار خاطر کے خطوط مولانا نے 1932ء سے 1946ء کے درمیان لکھے ہیں۔ ان میں مکتوب نگار کی حیثیت سے مولانا نے اپنا نام "ابو الکلام لکھا ہے۔ مولانا مختلف اوقات میں اپنا نام مختلف طریقوں سے لکھتے رہے۔ لیکن ہندوستانی سیاست اور اردو ادب میں وہ مولانا ابو الکلام آزاد کے نام ہی سے مشہور ہوئے۔

مولانا آزاد نے اپنا سنہ ولادت 1888 مطابق ذو الحجہ 1305 ہجری بتایا ہے اور یہ بھی بتایا کہ ان کے والد نے ان کا نام " فیروز بخت" رکھا تھا۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے تذکرہ کے انگریزی ترجمہ میں جس کا اردو ترجمہ میر ولی الدین نے کیا ہے ان کی تاریخ پیدائش 11، نومبر 1888 درج کی ہے۔ تمام سرکاری کاغذات میں یہی تاریخ رائج ہے۔

3.2.2 مولانا آزاد کی وجاہت ناظرین کی نظر میں:

آغا شورش کاشمیری نے ابو الکلام آزاد کی شخصیت کا خاکہ کچھ یوں بیان کیا ہے:

"قد طویل نہ قلیل، متوسط القامت، اکہرا بدن، نازک الجثہ، سرخ و سپید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، متحرک اور روشن، آخری عمر میں رنگ دار عینک کے شیشے ان کا غلاف تھے، اس طرح پیشانی کی شکنوں اور آنکھوں کی لہروں سے پتا چلانا مشکل تھا کہ ان کے ذہنی پس منظر میں کیا ہے؟ چہرہ کتابی، ڈاڑھی کچی، آواز میں جمال و جلال، عجم کے حسنِ طبیعت اور عرب کے سوزِ دروں کی تصویر، طبیعت باغ و بہار، فطرت کم آمیز، مزاج میں سطوت، عوام سے بے نیاز، ان سے ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ اس حد تک خلوت پسند تھے کہ تنہا آئے اور تنہا چلے گئے، فقر و استغنا کے پیکر اور صبر جمیل کا مجسمہ، کئی کئی دن مہمان شرفِ ملاقات سے محروم رہتے۔"

مولانا آزاد کی شخصی وجاہت کی کتابی تصویر مصور فطرت خواجہ حسن نظامی نے یوں بیان کیا ہے۔

" سرو قد، دہرا بدن، ایرانی وضع کی بڑی آنکھیں، کتابی چہرہ، چھوٹی ڈاڑھی، آواز مہین اور بلند، مزاج میں تمکنت اور وقار، طبیعت میں شوخی و ظرافت، دہلی کے رہنے والے ہیں۔ قوم سید، پیشہ آزادی و بے نیازی، حافظے کی قوت بے مثال ہے، تصور کی طاقت چیونٹی کی ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی ہے، تحریر و تقریر کے خود مختار بادشاہ ہیں۔ نازک مزاجی میں تاناشاہ اور سیاست دانی میں ہندوستان کے ہر مسلمان سے زیادہ ہیں۔ بیرون ہند کے مسلمانوں میں بھی مقبول ہیں۔ ظاہر داری اور نمود سے بیزار ہیں۔ اگرچہ لیڈروں کے عروج اور ذرائع شہرت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔"

مسلمانوں میں گاندھی جی ہو سکتے تو ابو الکلام ہوتے اور مالوی جی ہو سکتے تو ابو الکلام ہوتے اور مولانا

ابوالکلام انگریزی جانتے ہوتے تو مسٹر جناح ہوتے اور مسٹر جناح عربی اُردو جانتے ہوتے تو مولانا ابوالکلام ہوتے۔۔۔۔۔ کیونکہ وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جب کہ ریاکار اور نمود کار لیڈروں کی کثرت ہے۔ جن میں نہ سمجھ ہے، نہ عمل ہے، نہ علم ہے۔ ایسے لیڈروں کے ساتھ ان کو کام کرنا پڑتا ہے اور اپنی فطری آزاد خیالی اور آزاد حالی کے سبب ان کے ساتھ عمل نہیں کر سکتے تھے۔"

عبدالماجد دریابادی نے مولانا آزاد سے 1909 میں ملاقات کے وقت ان کی قلمی تصویر یوں بیان کی ہے: "پلیٹ فارم پر دیکھا کہ سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم سے ایک نوجوان سگریٹ پیتے برآمد ہوئے، گورے چٹے، خوش رو جامہ زیب، کشیدہ قامت چھریرے بدن پر سیاہ شیروانی اور سیاہ ایرانی ٹوپی میں ملبوس، جوان رعنا ایسے کہ نظر ان پر خواہ مخواہ پڑے۔ پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ کسی نے کہا کہ کوئی ایرانی پرنس (شہزادہ) معلوم ہوتا ہے۔ آخر کو کھلا کہ یہی ابو الکلام آزاد ہیں" ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے دریابادی صاحب مزید کہتے ہیں کہ: گفتگو کے بادشاہ، علم کے بحرِ ناپیدا کنار، خطابت کے شہسوار، قلم کے دھنی تھے۔ اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب لیکن مجمعوں سے نفور، سفر کے دل دادہ، سیاست دانوں میں عبقری، حافظہ بے پناہ، کتابوں کے دوست، مطالعے کے مجنوں، قرنِ اول کے شہ دماغ مسلمانوں کی تصویر، عیب بینی اور عیب چینی سے متنفر، قرآن کے مفسر، کلام اللہ پر گہرائی و گیرائی تک رسائی، آزادی کی جدوجہد کے سالار، گم شدہ اسلاف کی یادگار، مستقبل کے نباض، چال میں طنطنہ، ڈھال میں ہمہمہ، بولتے تو پھول جھڑتے، مطالب کے فرش پر الفاظ کا رقص، چاروں طرف سحر چھاجاتا، وجد ان جھومنے لگتے، ساعت موتی رولتی، اٹھارہ سوستاون کی خوں خواری کے بعد انیس سو دس میں اسلام کی پہلی آواز، جس نے مسلمانوں کی پلکوں سے نیندیں اتاریں اور ان کے کانوں کا جھومر بن گئی، ان کے دلوں کا نگینہ اور دماغوں کا سفینہ ہو گئی۔

3.2.3 مولانا آزاد کے بچپن کے بارے میں معاصرین کا اظہار خیال:

جس عہدِ طفولیت میں اکثر بچے کھیل کود اور تفریح میں مشغول رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں ابوالکلام ریت سے گھروندہ بنانے کے بجائے اپنے بھائی بہنوں کو سامنے بٹھاتے اور خود ایک بلند مقام پر پگڑی باندھے تقریر کی مشق کرتے اور اہلِ خانہ کو یہ باور کراتے کہ کوئی بڑے عالم بھرے مجمع سے خطاب کر رہے ہیں۔ ان کی بڑی ہمشیرہ آرزو بیگم ان کے بچپن کی تفریحات کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

"بچپن میں بھائی کو ان کھیلوں کا شوق نہیں تھا جو اکثر بچے کھیلا کرتے ہیں ان کے کھیل سات آٹھ سال کی عمر میں عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی وہ گھر کے تمام صندوقوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے تھے کہ یہ ریل گاڑی ہے پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے تھے اور ہم بہنوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ چلا چلا کر کہو، ہٹو ہٹو راستہ دو، دلی کے مولانا آرہے ہیں۔ ہم لوگ اس پر کہتے تھے کہ بھائی یہاں تو کوئی آدمی نہیں ہے، ہم کس کو دھکا دیں اور کہیں کہ راستہ دو اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ کھیل ہے، تم سمجھو کہ بہت سے لوگ مجھ کو لینے اسٹیشن پر آئے ہیں۔ پھر بھائی صندوقوں پر سے اترتے تھے اور بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلتے تھے جیسے کہ بڑی عمر کے لوگ

چلتے ہیں۔ کبھی وہ گھر میں کسی اونچی چیز پر کھڑے ہو جاتے تھے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم لوگ تالیاں بجاؤ اور سمجھو کے ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں اور میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ میں کہتی تھی کہ بھائی سوائے ہم دو چار کے یہاں اور کوئی نہیں ہے ہم کیسے سمجھیں کہ ہزاروں آدمی یہاں کھڑے ہیں۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے، کھیل میں ایسا ہی ہوتا ہے"۔

مولانا کا لڑکپن یا یوں کہیں کہ ان کا بچپن عام بچوں سے یکسر مختلف تھا۔ جس عمر میں بچے کھیل کود اور تفریح میں لگے رہتے ہیں مولانا بڑی سنجیدگی سے تعلیم میں منہمک تھے۔ ان کو بچوں کے کھیل کود اور تفریحات سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ ان کی زندگی تو بس کتابیں تھیں شور وغل سے بچنے کے لیے وہ کتاب لے کر گوشہ تنہائی میں جا بیٹھتے۔

ان کے گھریلو ملازمِ خاص حافظ ولی اللہ کا بیان ہے کہ "کلکتہ میں جنرل پوسٹ آفس کے سامنے جو ڈلہوزی اسکوائر تھا اور جسے لال ڈوگی کہا کرتے تھے، وہاں درختوں کا ایک ایسا جھنڈ تھا کہ باہر سے معلوم ہوتا ہے کہ بس درخت ہی درخت ہیں لیکن اندر کافی جگہ تھی۔ وہاں ایک بنچ تھی۔ مولانا سیر کو جاتے ہوئے کتاب ساتھ لے لیتے اور ڈلہوزی اسکوائر کے درختوں کے اس جھنڈ میں بیٹھ کر کتاب کا مطالعہ کرتے۔ ملازم خاص حافظ ولی اللہ باہر پھرتے رہتے اور جھنجھلا جھنجھلا کر کہتے کہ "اگر کتاب ہی پڑھنی تھی تو گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی"۔

انہیں جو فطری صلاحتیں، بے مثال ذہانت اوراور خداداد بصیرت عطا ہوئی تھی، اس کا اظہار ابتدائی برسوں میں ہی ہونے لگا تھا چنانچہ اپنے خیالات کے اعتبار سے وہ کبھی بچے نہیں رہے۔ بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو نے ان کے بچپن میں ہی ان کی ذہنی بلوغت اور مزاج کی پختگی پر تاریخی جملہ کہا تھا کہ "مولانا اپنی پیدائش کے وقت ہی پچاس برس کے تھے" یہ آزاد کی وہی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے بچپن، عنفوانِ شباب، جوانی اور پیری کے جداگانہ ادوار کا ادراک کر پانا کسی بھی صاحبِ بصیرت کے لئے انتہائی مشکل ہے۔

عبد الرزاق ملیح آبادی کہتے ہیں کہ "انہوں نے آنکھ کھولی تو سونے کا چمچہ منہ میں تھا۔ بہت بڑے پیر کے نورِ نظر تھے۔ دولت ہی دولت برستی تھی۔ ایسے آدمیوں کے لیے فقر وفاقہ دوسروں سے کہیں زیادہ مصیبت اور ذہنی اذیت کا سبب بن جاتا ہے، مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا اس فقر وفاقہ میں بھی زیادہ سے زیادہ ہشاش بشاش رہتے تھے کبھی ان کے ماتھے پر بل نہیں دیکھا کبھی جھنجھلائے نہیں بلکہ ان خشک دنوں میں مولانا کی بشاشت اور ظرافت عروج پر پہنچ گئی تھی۔"

3.3 مولانا آزاد کا علمی و قار و مرتبہ ہم عصر دانشوروں کی نگاہ میں

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے بچپن ہی سے بڑے ذہین اور زیرک واقع ہوئے تھے۔ وہ علم و ادراک، فہم و فراست اور حکمت و دانائی جیسے اوصاف سے بہرہ مند تھے۔ ابوالکلام آزاد کے اکثر معاصرین اُن کی علمی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔ گاندھی جی نے مولانا کے بارے میں لکھا ہے: "مجھے 1920ء سے قومی کام میں مولانا آزاد کے ساتھ وابستہ رہنے کا فخر حاصل رہا۔ اسلام کے بارے میں ان سے زیادہ معلومات کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ عربی زبان کے وہ بہت بڑے عالم ہیں۔ اُن کی دیش بھگتی اسی طرح پختہ ہے جس طرح ان کا اسلام میں

عقیدہ، وہ انڈین نیشنل کانگریس کے اعلاترین سردار ہیں اور ہندوستانی سیاسیات کا مطالعہ کرنے والے ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرے۔"

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم **پنڈت جواہر لال نہرو** کے مولانا آزاد کے ساتھ بہت گہرے اور دیرینہ مراسم تھے۔ پنڈت نہرو کو تقریباً تیس سال تک مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے ،سننے اور سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ انہوں نے مولانا کی علمی قابلیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مولانا کو دیکھ کر مجھے اکثر وہ فرانسیسی قاموس یاد آجاتے تھے جو انقلاب فرانس سے کچھ پہلے موجود تھے۔ تاریخ اقوام ماضی میں ان کا درک و بصیرت یقیناً حیرت انگیز تھی اور پھر یہ وسیع علم ان کے دماغ میں عجیب ضبط و ترتیب کے ساتھ موجود تھا۔ ان کا ذہن مدلل و مسجل ہوا کرتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے منطق و فلسفہ کی تعلیم کسی قدیم یونانی دانشگاہ میں حاصل کی ہے۔"

خواجہ حسن نظامی ان کے علمی وقار و مرتبہ اور قرآنی بصیرت و دانائی کے بارے میں کہتے ہیں کہ:"قرآن مجید پر ایسا عبور ہے اور اس کے مقاصد کو اتنا سمجھتے ہیں کہ مصر و شام کے علمائے جدید بھی نہیں سمجھتے۔"

چراغ حسن حسرت نے مولانا سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ یوں کیا ہے کہ "میں پہلی مرتبہ شملہ میں مولانا سے ملا تھا۔ ایڈورڈ گنج میں ان کی تقریر سنی، تقریر مکمل ہو چکی تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، لیکن چند منٹ کی ملاقات تھی اور ملنے والوں میں صرف ایک میں ہی نہیں تھا بلکہ بہت سے لوگوں کا ایک وفد بھی تھا۔ لوگ سوال کر رہے تھے اور وہ جواب دے رہے تھے۔ اس وقت ان کی صورت و شکل کے عام انداز سے ان پر عقاب کا دھوکا ہوتا تھا لیکن ایسا عقاب نہیں جو محض شکاریوں کا بازیچہ ہو بلکہ عقاب جو سنگ خارا کی چٹانوں میں آشیانہ بناتا ہے" وہ مزید لکھتے ہیں کہ "ایک دفعہ میں نے افسانہ نگاری کے متعلق انہیں اپنا ایک مضمون دکھایا۔ پڑھ کر کہنے لگے :" تم نے فلاں فلاں فرانسیسی قصہ نویسوں کا ذکر نہیں کیا حالانکہ ان کے تذکرہ کے بغیر اس موضوع پر کوئی مضمون مکمل نہیں ہو سکتا، پھر افسانہ نگاری کے متعلق ایک تقریر شروع کر دی اور اس سلسلے میں ایسے ایسے مصنفوں اور ان کی تصانیف کا ذکر کر گئے جن کے بارے میں اچھے اچھوں کو کچھ پتہ نہیں تھا۔"

پٹنہ کی طبی کانفرنس میں مولانا آزاد کی شرکت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "پٹنہ میں بڑی دھوم سے طبی کانفرنس ہوئی۔ غالباً حکیم مسیح الملک (اجمل خاں) اس کے صدر تھے۔ چوں کہ مولانا آزاد بھی اتفاق سے وہیں (پٹنہ) موجود تھے اس لئے بعض طبیبوں نے ان سے استدعا کی کہ آپ کانفرنس میں طب یونانی کے متعلق چند کلمات کہہ دیجیے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم نے بھی سفارش کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو پورے دو گھنٹے طب قدیم اور طب جدید کے نظریوں اور طریق علاج وغیرہ پر بحث کرتے رہے۔ **حکیم نور** احمد صاحب نے جو کلکتہ کے مشہور طبیب ہیں اس اجتماع میں موجود تھے انہوں خود مجھ سے بیان کیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تقریر میں جو باتیں بیان فرمائیں وہ بڑے بڑے نامور طبیبوں کو بھی معلوم نہیں"۔

ڈاکٹر بی وی کیسکر سابق وزیر اطلاعات حکومت ہند کہتے ہیں کہ "مولانا آزاد سے میری راہ و رسم کوئی بیس برس ہوئے شروع ہوئی تھی۔ ان دنوں مولانا آزاد اور میں دونوں الہ آباد جیل میں تھے۔ میں ہر شام مولانا سے ملا کرتا تھا کیوں کہ ان کی ملاقات اور مختلف

موضوعات پر گفتگو فکر و نظر کو جلا بخشتی تھی۔ وہ دنیا کے عظیم اسکالروں میں سے تھے وہ بہت بڑے عالم تھے لیکن عجز وانکساری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں نے ان کی میز پر فرانسیسی زبان کی بہت سی کتابیں دیکھیں میں نے ان سے پوچھا تھا کہ آیا انہیں فرانسیسی ادب سے دل چسپی ہے اور کیا وہ یہ زبان اچھی طرح جانتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، بس معمولی شدبد ہے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ فرانسیسی زبان کے بہت بڑے عالم ہیں اور فرانسیسی ادب سے خاصا شغف رکھتے ہیں۔ وہ عربی فارسی، اردو، انگریزی اور فرانسیسی کے عظیم اسکالر تھے۔"

خواجہ غلام السیدین لکھتے ہیں کہ "مولانا آزاد نے شعوری طور پر اور نہایت سلیقے کے ساتھ اپنی خودی کی تعمیر کی تھی۔ وراثت میں سیرت اور دل و دماغ کا بیش بہا خزانہ پایا تھا۔ بزرگوں کی تربیت سے بہت کچھ حاصل کیا تھا اور پھر اپنی ذاتی اپج اور انفرادیت کے طفیل ہر معاملے میں اپنی ایک ذاتی راہ نکالی تھی اور باوجود وراثت اور بیعت کے اثرات قبول کرنے کے ان کو تمام و کمال اپنانے سے انکار کر دیا تھا۔ زندگی بھر اپنے ہی بنائے راستے پر چلتے رہے اور دوسروں کو ان پر چلنے کی تربیت دیتے رہے۔ ایمان کو بھی انہوں نے بطور ایک عطیہ خداداد کے نہیں پایا بلکہ اس کے حصول کی راہ میں شک و شبہ کے بہت سے خار زاروں میں سے گزرے اور اس تک طلب سعی فکر سخت جدوجہد اور آزمائشوں کے بعد پہنچے۔ انہوں نے ملک کی سیاسی جدوجہد میں ایک فیصلہ کن حصہ لیا اور قومی زندگی میں بہت سے ایسے موڑ پیش آئے جس میں انہوں نے گاندھی جی اور نہرو کے دوش بدوش انقلابی قیادت کا فرض انجام دیا۔ تیسری طرف ان کی تقریریں اور تحریریں اردو ادب میں ایک شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہیں اور عرصہ دراز تک رکھیں گی۔ وہ لفظوں کا جادو وہ عبارت کا دروبست وہ فصاحت جو ابتدائی دور میں شوکت الفاظ سے معمور ہوا کرتی تھی اور آخری دور میں اپنی سلامت اور زور بیان سے جادو جگاتی تھی۔ پوری تحریر کو ضبط تحریر میں لائیں تو معلوم ہو گا کہ ادب عالیہ میں جگہ پانے کے قابل ہے۔۔۔ ان کی ذات میں دو باتیں بہت نمایاں تھیں۔ ایک اصول پرستی جس کا تقاضہ ہے کہ انسان جس بات کو صحیح سمجھے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے اور دوسری جرات کہ کسی خوف یا لالچ یا نام نہاد "مصلحت" سے متاثر ہو۔ دراصل خوف تو ان لوگوں پر طاری ہوتا ہے جن کا یا تو حساب صاف نہ ہو یا جو اپنے یقین اور اصول کی قیمت ادا کرنے کو تیار نہ ہوں۔۔۔ مولانا کی کتابِ زندگی ہمیشہ صاف رہی انہیں کبھی نہ انعام کی خواہش ہوئی نہ ستائش کی تمنا، کوئی خطاب قبول نہیں کیا۔ سنتا ہوں کہ جب بھارت رتن نے دروازے پر دستک دی تو انہوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ دیکھا کہ اعزازی ڈگریوں سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ مجھے ہدایت تھی کہ اگر کوئی ادارہ یا جماعت ان کے نام پر کسی عمارت یا درس گاہ وغیرہ کا نام رکھنا چاہے تو بغیر ان سے دریافت کئے باسلوب مناسب معذرت کر دو۔ میں نہیں چاہتا کہ میں جب تک وزیر تعلیم ہوں اس قسم کی کوئی چیز کی جائے۔ جرات کا یہ حال تھا کہ جب کبھی گاندھی جی یا جواہر لال سے اختلاف ہوتا تو اس کو کھلم کھلا ان کے سامنے مضبوطی کے ساتھ ظاہر کرتے برخلاف ان لوگوں کے جو ان کی پیٹھ پیچھے مخالف کرتے تھے۔ اصول پرستی کا ایک قصہ سن لیجیے ایک صوبہ کی طرف سے پارلیمنٹ کے الیکشن کے لیے ایک امیدوار کا نام بہت اصرار کے ساتھ پیش کیا گیا۔ ان کے پاس صوبہ کانگرس کمیٹی کی طرف سے وفد آیا تار اور ٹیلی فون آئے ان کے اپنے ساتھیوں اور وزیروں نے سفارش کی لیکن پہاڑ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ اس شخص نے اناج کی ذخیرہ اندوزی اس وقت کی جب لوگ بھوکوں مر رہے تھے۔ میں کسی طرح اس بات کے لیے آمادہ نہیں ہوں کہ

اس کو کانگریس کا ٹکٹ دیا جائے" زندگی ایسی پاک وصاف گزری کہ جب پیدا کرنے والے نے ان کو اپنے پاس بلا لیا تو بنک میں اتنا روپیہ نہ تھا کہ موٹر خریدنے کے لیے حکومت سے جو رقم لی تھی اس کو ادا کیا جاسکے۔ میں نے بحیثیت ان کے جوائنٹ سیکرٹری اور سیکرٹری کے آٹھ سال سے زیادہ ان کے ساتھ کام کیا اور انہوں نے کبھی کسی امیدوار کے تقرر یا ترقی کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی، کوئی سفارش نہیں ۔

پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں کہ "مولانا آزاد کی بنیادی حیثیت ایک مفکر کی ہے۔ مفکر خلوت پسند ہوتا ہے فکر اپنے اظہار کے لئے علمی اصطلاحات لانے پر مجبور ہے۔ مولانا کے یہاں عربی کی اصطلاحات اسی وجہ سے ہیں۔ پھر مولانا ایک بہت بڑے خطیب بھی ہیں خطابت کے لئے رجزیہ لہجہ ضروری ہے اور سید عبد اللہ نے الہلال کے مضامین کو "رجز" غلط نہیں کہا ہے۔ پھر مولانا ایک عظیم صحافی ہیں اور صحافت ہنگامی واقعات کو بھی آفاقی رنگ دینے پر مجبور ہے۔ ان اشاروں کی مدد سے الہلال اور البلاغ کے مصنف کا کارنامہ سمجھ میں آنے لگا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ نثر سرسید اور حالی کی سادہ نثر سے مختلف ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ نثر کا بہترین نمونہ نہیں ہے مگر اس میں علمی، سیاسی، مذہبی اور تہذیبی موضوعات کو خطیبانہ بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک جلال ہے جس میں دلبری و قاہری ملے ہوئے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک پیمبرانہ انداز ہے جو حق اور باطل، سود وزیاں، نور وظلمت، صراط مستقیم اور ضلالت کی نشاندہی کرتا جاتا ہے۔ ترجمان القرآن کی پہلی جلد جو سورہ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے حکیمانہ نکتہ چینی کے ساتھ کہیں کہیں شاعرانہ شوخی سے بھی کام لیتی ہے تاکہ حکمت بوجھ نہ معلوم ہو بلکہ باعث کشش نظر آئے۔ ترجمان کی نثر کو ہم غالب کے درمیانی دور کی شاعری کی مثال سے سمجھ سکتے ہیں غالب کی انفرادیت اس دور میں رنگ بہار ایجاد بیدل کی مرہون منت نہیں رہی، اس نے اپنی راہ پالی ہے۔ مولانا کی حکمت اب خطابت کے طوفان نہیں اٹھاتی ہاں شعریت کی ہلکی سی موجیں ضرور پیدا کرتی ہے۔ موضوع کی رعایت سے انداز بیان علمی ہے مگر اس میں علم کی خشکی نہیں ایک جمالیاتی حسن ہے جس کی وجہ سے ایک رعنائی پیدا ہوگئی ہے۔

مفکر کو اظہار خیال کے لئے وسیع میدان ملا ہے مگر مفکر ذوق جمال رکھتا ہے اس لئے فکر کے پہاڑ نہیں لڑھکاتا، ہاں اس کی آب و تاب دکھاتا ہے۔ یہاں صحافت نہیں ہے کہ طوفانی کیفیت پیدا کر دے یہاں ازلی اور ابدی صداقتوں کی تشریح ہے جن کے لیے حکیمانہ اسلوب کی ضرورت ہے۔ مولانا آزاد نے اس طرح اردو نثر کو برگزیدگی عطا کی ہے۔"

سجاد انصاری نے مولانا آزاد کی نثر کی لطافت و دل پذیری، جادو بیانی اور سحر آفرینی سے مسحور ہو کر کہا تھا کہ "اگر قرآن اردو میں اترتا تو اس کے لیے ابوالکلام کی نثر منتخب کی جاتی" یقیناً یہ اشارہ ان کی نثر کے خطیبانہ اسلوب اور پر شکوہ الفاظ و تراکیب کی طرف تھا۔ جدید اردو نثر عربی اور فارسی سے جو کچھ لے سکتی تھی وہ ابوالکلام نے لے لیا۔ عرب کے سوز دروں اور عجم کے حسن طبیعت دونوں کو اردو میں سمولینا اور اردو کو عربی اور فارسی کا غلام نہ ہونے دینا معمولی کام نہیں ہے۔ مولانا آزاد کی نثر سے یہ کام ختم ہو گیا اور اقبال کی نظم سے۔ اب اردو نثر کی ترقی کے لیے جو امکانات ہیں وہ عالمی ادب خصوصاً انگریزی سے ہی لیے جاسکتے ہیں مگر اچھی اردو نثر میں عربی اور فارسی کے اثرات جس طرح حل ہو گئے ان کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا پڑے گا اس وجہ سے ابوالکلام آزاد کے جوش قدح سے ادب میں ہمیشہ چراغاں رہے گا۔

ابو الکلام آزاد کی ہمہ جہت صلاحیت اور ان کے جوہر ذاتی پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور ادیب، نیاز فتح پوری نے لکھا ہے کہ ”مولانا آزاد اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبی اور بدیع الزماں ہمدانی ہوتے، اگر محض دینی و مذہبی اصلاح کو اپنا شعار بنالیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے، اگر وہ علوم حکمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل جیسے فلسفی ہوتے، اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں نظر آتے، اگر وہ تصوف و اصلاح کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے۔،،

مولانا آزاد کو قدرت کی طرف سے غیر معمولی ذہانت و فطانت اور خداداد حافظہ اور حاضر دماغی ملی تھی، جوہر خطابت اور بلند آہنگ انشاپردازی اس پر مستزاد، خود داری خود اعتمادی، نیز نظافت و لطافت میں وہ اپنے معاصرین میں ممتاز و نمایاں تھے۔ ان کو پہلی بار دیکھنے کے بعد **مولانا علی میاں ندوی** کے تاثرات یوں تھے کہ ”اس وقت جہاں تک یاد ہے میں نے ان کی سب سے پہلے گنگا پرشاد میموریل ہال کے ایک جلسہ میں زیارت کی، جلسہ کا مقصد ہندو مسلم اتحاد کی دعوت تھی اور جہاں تک یاد آتا ہے، اس جلسہ میں مولانا محمد علی بھی موجود تھے۔ انہوں نے خطاب کیا تھا، جلسہ کے دوران مغرب کا وقت آیا، مولانا نے ہال کے شمالی گوشہ میں جہاں نماز کا انتظام تھا، تشریف لے گئے، ہم سب لوگوں نے ان کی اقتداء میں نماز پڑھی اور میں نے پہلی بار ان کو قریب سے دیکھا، بلند و بالا قد و قامت جس کو سرو آزاد کہنا ہر طرح موزوں ہو گا، کتابی چہرہ جس میں سرخی جھلکتی ہوئی، آنکھیں روشن و فراخ متبسم بلکہ متکلم، پیشانی سے خود اعتمادی اور بلند طالعی نمایاں، لباس خالص دہلی و لکھنؤ کے شرفاء بلکہ روساء کا سا سادہ، لیکن حسن مذاق اور نستعلیقی ہر چیز سے عیاں، ٹوپی ذرا بلند جس میں ان کی انفرادیت جو ان کی ذات کا جوہر بن گئی تھی نمایاں، پاؤں میں سلیم شاہی جوتا، یہ تھے مولانا ابو الکلام آزاد جن کو میں نے پہلی بار دیکھا۔“

سید سلیمان ندوی مولانا آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”اگر ہمارے نظر بندوں میں کوئی ایسا ہے جو اسوۂ محمدی پر فائز ہوا تو ہم میں ایک اور ہستی ایسی ہے جو اسوۂ یوسفی کے درجہ پر ممتاز ہوئی، جس عزم و استقلال استغناء اور قوت ایمانی کے ساتھ مولانا آزاد نے یہ زمانہ بسر کیا ہے وہ ائمہ سلف کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ شاید سب کو معلوم نہ ہو کہ انہوں نے حکومت کا وظیفہ لینے سے انکار کر دیا اور اعانت نظر بنداں کا ماہوار عطیہ بھی قبول نہیں کیا۔ اس زمانے میں ان کو جو مالی دقتیں پیش آئیں وہ صرف عبادی الشکور کے رمز میں پنہاں ہیں۔ یہ معلوم ہو گا کہ رات کو انہیں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس بنا پر وہ نماز عشاء کی جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اسے گوارہ نہیں کیا۔ انہوں نے حکومت سے اجازت چاہی اور جب اجازت نہیں دی گئی تو برملا اعلان کر دیا کہ فریضہ اساسی میں انسانوں کے فرمان مانع نہیں آسکتے۔ آہ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو آزادی کے بستر پر بھی اٹھ کر خدا کے آگے سر نہیں جھکاتے اور ایک وہ عباد صالحین ہیں جو قید و تنگی میں بھی مساجد الٰہی کی یاد فراموش نہیں کر سکتے۔“

سید سلیمان ندوی مولانا آزاد ان کے علمی کمالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں کہ ”اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابو الکلام کے ”الہلال“ اور ”البلاغ“ نے پیدا کیا اور جس اسلوبِ بلاغت کمالِ انشاپردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا اس نے ان کے لیے ایمان اور یقین کے نئے

نئے دروازے کھول دیے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی و وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔ ضرورت تھی کہ اس موثر قلم سے قرآن پاک کی پوری تفسیر شائع ہوتی کہ عربی سے نابلد مسلمانوں کے لیے نور بینش اور افزائش بصیرت کا سر و سامان اردو میں میسر آتے۔"

مزید لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد انگریزی بہت کم بولتے ہیں مگر آپ کی لائبریری انگریزی اور فرانسیسی کتب سے بھری ہوئی ہے۔ آپ نے کئی انگریزی شعراء کا مطالعہ کیا ہے مثلاً شیکسپیئر، ورڈزورتھ، شیلے وغیرہ مگر آپ بائیرن کو بہت پسند کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یونان کی جنگ آزادی میں شریک ہو کر مارا گیا اور اس نے اپنی نظموں میں آزادئ افکار اور آزادئ فکر و عمل کی تعلیم دی اور انقلابی سیاست میں نمایاں حصہ لیا۔ آپ کے پاس عربی، فارسی اور ترکی کی لاتعداد کتابیں موجود ہیں"۔۔۔۔ کثرت مطالعہ اور استغراق کتب نے آپ کو خلوت پسند اور عزلت گزیں بنا دیا ہے۔ اگرچہ آپ بہت خلیق اور ملنسار ہیں مگر آپ کے دوستوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اگرچہ آپ بہترین گفتگو کرنے والے ہیں مگر اکثر خاموش رہتے ہیں۔ مولانا کو نمائش ہنگاموں اور جلوسوں سے سخت نفرت ہے۔ آپ رات کے کھانے پر بہت کم ہی دعوتیں قبول کرتے ہیں۔"

مولانا غلام رسول مہر نے ان کی قادرالکلامی اور خطابت کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے "مولانا نے پہلی مرتبہ جب انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں تقریر فرمائی تھی تو وہ عمر کی سولہویں منزل میں تھے اور اس زمانے میں انجمن کے اسٹیج پر ممتاز اصحاب علم و فضل کو بھی بمشکل بار ملتا تھا۔ یہ تقریر اتنی مسلسل مربوط مدلل اور عام تقریروں سے ہر لحاظ سے اتنی مختلف تھی کہ مولانا ثناءاللہ امرتسری نے کہا" ہم تو تھے پسنجر ٹرین ہمارے بعد کلکتہ میل آرہی ہے"۔ اس زمانے میں کلکتہ میل کو رفتار کی تیزی اور ہنگامہ خیزی کے باعث تمام ٹرینوں پر بدرجہا فوقیت حاصل تھی مولانا آزاد کے وطن کی نسبت سے کلکتہ میل کے ساتھ تشبیہ میں جو لطف تھا وہ تشریح سے بے نیاز ہے۔ 1904ء کا واقعہ تھا"۔۔۔ آئندہ سال مولانا دوسری مرتبہ انجمن کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ 22ر اپریل 1905 کو انہوں نے تقریر فرمائی۔ اس کا موضوع تھا۔ "اسلام زمانہ آئندہ میں" اس وقت مولانا سترہ سال میں تھے۔ یہ تقریر اس قدر پسند کی گئی کہ صدر اجلاس نے حاضرین کو خوشخبری سنائی کہ "آزاد صاحب مولانا" ہو گئے اور شہرت کے پروں پر اڑنے لگے ہیں۔"

سید سلیمان ندوی مولانا آزاد کی خطابت اور جادو بیانی کا ذکر یوں کرتے ہیں" آپ ایک سحر بیان مقرر ہیں آپ بڑے بڑے مجمعوں کو اپنے دلائل و براہین سے قائل کر سکتے ہیں مگر اس کے باوجود آپ عوام میں بہت کم خلط ملط ہوتے ہیں ہاں کانگریس کمیٹی کی بحثوں میں آپ نمایاں حصہ لیتے ہیں اور آپ کی بات ہمیشہ ایک قابل قدر اضافہ ہوتی ہے"۔

الہلال کی اشاعت کے بعد مولانا کی صحافت و خطابت کے جوہر خوب چمکے ہر جلسے کی رونق ان کی ذات سے ہونے لگی۔ الہلال بظاہر ایک سیاسی پرچہ تھا لیکن اس کی دعوت تمام تر دینی رنگ میں تھی اور اس کی سیاست پر بین الملی اسلامیت کی چھاپ لگی ہوئی۔ بات بات پر آیات قرآن سے استدلال و استناد علمی، ادبی پہلو بھی نمایاں تھے اور فقہی رنگ بھی کچھ کم شوخ نہ تھا۔ اچھے اچھوں کی قلعی اس کے کالموں میں کھل جاتی تھی اور بڑے بڑے اس سے ٹکر لیتے ہچکچاتے تھے۔ مولانا کی بے پناہ مقبولیت، ذہانت و فطانت، حاضر جوابی، برجستہ گوئی، بذلہ

سنجی کا نمایاں ترین دور یہی رہا ہے۔ جن لوگوں نے مولانا کو ان کی زندگی کے آخری 30,25 سال میں دیکھا ہے۔ وہ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ وہ تیرہ چودہ برس میں کیا تھے۔ ''ذہانت و فطانت کا مجسمہ، شوخی و بذلہ سنجی کا مرقع، حاضر جوابی میں طاق، لطیفہ گوئی میں استاد۔ اسے چھیڑا اسے بنایا۔ اس پر فقرہ چست کیا، اسے چٹکیوں میں اڑایا۔ لوگ تنہا ملتے جلتے سامنا کرتے گھبراتے ہچکچاتے اور کنی کاٹ جاتے تھے۔

3.4 مولانا آزاد کی صحافت معاصرین کی نظر میں

مولانا آزاد کو بچپن سے ہی اخبار بینی کا شوق تھا۔ پہلا اخبار جس سے انہیں دلچسپی پیدا ہوئی وہ لاہور سے شائع ہونے والا اخبار عام تھا۔ بعد از آں لکھنو سے شائع ہونے والا اودھ اخبار، بانکی پور (پٹنہ) سے نکلنے والا الپنچ، قاہرہ (مصر) سے نکلنے والا ''المؤید'' ان کے مطالعہ میں رہے۔ الجوائب اور طرابلس بھی ان کے گھر آتے تھے۔ ان کے علاوہ لاہور سے نکلنے والا اخبار ''پیسہ'' بمبئی سے نکلنے والا ''پنچ بہار''، کلکتہ سے جاری ہونے والا ''احسن الاخبار'' ہر دوئی سے شائع ہونے والا ماہنامہ ''مرقع عالم'' لکھنؤ سے جاری ہونے والا ماہنامہ ''دل گداز'' پٹنہ سے شائع ہونے والا رسالہ ''تحفہ حنفیہ'' وغیرہ رسائل و اخبارات ان کے مطالعہ میں رہے۔ مصر و شام کے کئی اخبارات آزاد کے مطالعے میں رہے جس آزاد کے ذوق کی تسکین ہوتی۔ اخبارات کے کثرت مطالعہ سے اسلامی دنیا سے متعلق ان کی معلومات میں وسعت و گیرائی پیدا ہوئی اور ان کی صحافتی فکر و نظر بھی پروان چڑھی۔ خاندانی پس منظر، علمی مطالعے، مشاہدے اور طویل صحافتی سفر نے ان کے اندر جو شعور و آگہی، دانائی و بصیرت، درک و آگہی اور عرفان عطا کیا تھا، اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ زندگی کے مقصد کی حصول یابی کے لیے صحافت ہی کو وسیلہ کار بنایا جائے، یہی وجہ ہے کہ صحافت ان کے نزدیک پیشہ نہیں عین مقصد حیات تھی۔ چنانچہ انھوں نے الہلال کے اولین شماروں میں ہی اپنے نظریات کی وضاحت کر دی تھی:

> ''ہمارے عقیدے میں جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہے وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کے لئے سر تا پیر عار ہے۔ ہم اخبار نویس کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں۔ اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہئے اور چاندی و سونے کا تو سایہ بھی اس کے لیے سم قاتل ہے۔ جو اخبار نویس رئیسوں کی فیاضیوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی عطیوں، قومی امانت اور اسی طرح فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نور ایمان کو بیچیں، بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر قلندروں کی کشتی کی جگہ قلم دان لے کر ریکسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور گلی کوچہ ''قلم ایڈیٹر کا'' کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں۔ ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آتے ہیں، حمد و تحسین کے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں، عیش کے نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔''

ابوالکلام آزاد نے اپنی صحافت کو قومی بیداری اور اصلاح کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ قوم وملت میں حوصلوں کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ الہلال کی اشاعت صحافت کے نئے باب کا آغاز تھی۔ قومی تعلیم و تبلیغ اور ان کے شعور کی بیداری میں الہلال کے گراں قدر مضامین کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ چنانچہ آزاد کے ہم عصروں میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے الہلال کے بارے میں اپنا تجزیاتی بیان نہ دیا ہو۔ **پنڈت جواہر لال نہرو** نے اپنی کتاب تلاش ہند میں لکھا ہے:

> ''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار الہلال میں مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا انداز تخاطب تھا جس سے ہندوستان کے مسلمان آشنا نہ تھے، وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجہ سے واقف تھے۔ سرسید، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے انداز بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی زیادہ گرم جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا۔ الہلال مسلمانوں کے کسی مکتب خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا''۔ مزید لکھتے ہیں۔ 1912ء ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنی نشو و نما کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اسی سال ان کے دو مشہور ہفتہ وار اخبار جاری ہوئے۔ ان میں سے الہلال اردو میں اور کامریڈ انگریزی میں شائع ہوتا تھا۔ الہلال، ابوالکلام آزاد نے جاری کیا تھا، یہ اس وقت چوبیس سال کے ایک نوجوان تھے۔ ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار اخبار الہلال'' میں ان (مسلمانوں) سے ایک نئی زبان میں خطاب کیا۔ صرف ان (آزاد) کے خیالات اور نقطہ نظر ہی میں جدت نہ تھی بلکہ ان کی تحریر کا رنگ بھی نیا تھا۔ ان کا اسلوب بیان جاندار اور پر زور تھا، البتہ کسی قدر دقیق ضرور تھا۔ اس نو جوان مصنف اور اخبار نویس نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں ایک ہلچل مچادی۔ اگر چہ بوڑھوں نے بہت کچھ تیوری چڑھائی مگر نوجوان کے دلوں میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔''

محض جدید افکار واخیالات کے حامل افراد نے ہی نہیں بلکہ قدیم تصورات کے حامل افراد نے بھی آزاد کی تحریروں کو پسند کرتے اور دادِ تحسین سے نوازتے تھے۔ ایسے افراد میں مولانا شبلی نعمانی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن جیسے کئی علما شامل ہیں۔ مولانا محمود حسن نے فرمایا کہ ''ابوالکلام آزاد نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے۔''

عبد الرزاق ملیح آبادی آزاد کی کہانی کے دیباچے میں لکھتے ہیں: ''مولانا نے ہمیں کیا نہیں دیا۔ موت کی سی بے حسی ہم پر چھائی ہوئی تھی۔ اجنبی حکومت کی غلامی پر ہم فخر کرتے تھے۔ انگریز کی وفاداری ہی میں اپنی قومی زندگی پر یقین کرتے تھے۔ برطانیہ کو سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہا کرتے تھے۔ سیاست میں ہم صفر تھے اور ہندوستان میں ہماری حیثیت بے بس غلاموں، بے شعور چوپایوں سے زیادہ نہ تھی۔ اور ہم مسلمان ہی کہاں تک تھے۔ قرآن کو جزدانوں میں لپیٹ کر گھروں میں رکھنا ہی ہمارا اسلام تھا، یا پھر اندھی تقلید تھی۔۔۔ دفعتاً ایک صور کی زلزلہ انگیز آواز نے نیند کے ماتوں کو دہلا ڈالا اور ہم آنکھیں ملنا بھی بھول کر دفعتاً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب ہم مسلمان تھے،

انسان تھے، اسلام کا درد پیدا ہو گیا، دین کی محبت جاگ اٹھی، وطن کی عزت و عظمت کے جذبے سے ہم بھر پور ہو گئے۔ جہاد کے ولولوں نے ہمارا خواب و خور حرام کر دیا۔ یہ صور قیامت کس نے پھونکا؟ ابوالکلام کے سوا کون ہو سکتا تھا۔"

ترقی پسند اور آزاد خیال نظریات کے حامل دانشور سجاد انصاری ابولکلام آزاد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ایک طرف تمدن جدید کروٹ لے رہا تھا اور دوسری طرف ایک انسان کی وہ ہمہ گیر قوتیں روبہ کار تھیں جن کی ہر جنبش کنگرہ فرعونیت کو متزلزل اور وقار نمرودیت پامال کر سکتی ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کا دماغ ان معجزات میں سے ہے جو کارکنان قضاوقدر کی حیرت انگیز کرشمہ طرازیوں کو نمایاں کرتے رہتے ہیں۔ الہلال نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس طرح بیدار کر دیا جس طرح نفخۂ صور سے لاکھوں برس کے سوئے ہوئے انسان زندہ ہو جائیں گے۔ اس طرز کی جامعیت ہندوستان میں کبھی اس سطوت و جبروت سے نمایاں نہیں ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ان بلند نظر شخصیتوں میں سے ہے جن کی عظمتوں کا محاصرہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔"

مولانا آزاد کی صحافتی عظمت واضح کرتے ہوئے نیاز فتح پوری کہتے ہیں کہ:"میں جس وقت مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت پر غور کرتا ہوں تو میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرتا ہوں کہ وہ مغربی انداز کی صحافت تو یقیناً نہ تھی کیونکہ اس میں شان خطابت قطعاً نہیں ہوتی۔ مشرق میں البتہ بعض عربی رسائل و اخبارات کا لب ولہجہ خطیبانہ ہوتا ہے لیکن ان میں وہ تنوع نہیں پایا جاتا جو الہلال میں نظر آتا ہے۔ خود ہندوستان میں "زمیندار" ایک بلند بانگ اخبار تھا لیکن اس میں الہلال کی گہرائی سنجیدگی اور علمی وزن کا فقدان تھا۔ بلاشبہ "مسلم گزٹ" کے لب ولہجہ میں ایک قطعیت تھی لیکن اس کا خطاب صرف عوام سے تھا عوام ہی کی زبان میں، اور کوئی دوسری خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی تھی"۔

مولانا آزاد کی صحافت کے متعلق **ڈاکٹر طہ حسین** کہتے ہیں کہ "میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ ان کی صحافت خود ان کی اپنی صحافت تھی جسے خود انھوں نے ایجاد کیا اور جو انہی کے ساتھ ختم ہو گئی۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوبِ صحافت، تحریر و تقریر کی دو خصوصیتیں ایسی تھیں جو کبھی ان سے جدا نہیں ہوئیں۔ ایک اس کی بلند ادبیت، دوسری اس کی شان خطابت، الہلال کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی بلند منارہ پر کھڑا ہو کر پر جوش خطبہ دے رہا ہے اور ایک بے پناہ ذخیرہ الفاظ کا اس کے پاس ہے جسے وہ موتیوں کی طرح بکھیرتا جا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا آزاد ایک عجیب و غریب طرز تحریر کے موجد و مخترع تھے۔ نہ تو ان سے پہلے اس کی کوئی مثال دیکھنے میں آئی اور نہ ان کے بعد کوئی شخص اس کی تقلید کی جرات کر سکا۔

الہلال کے بعد جب مولانا نے البلاغ جاری کیا تو اس کا نصب العین بھی وہی تھا جو الہلال کا لیکن طریق ابلاغ کچھ مختلف تھا۔ تیور وہی تھے لیکن رخ دوسرا تھا، انداز قد وہی تھا مگر لباس بدلا ہوا تھا۔ الہلال نفسیات عملی کا درس تھا اور البلاغ نفسیات ذہنی کا، الہلال حرکت و عمل، جوش وولولہ کا پیام رساں تھا اور البلاغ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کا۔ الہلال میں خون منصور کی شعلہ آہنگی تھی اور دعوت دار

ورسن، البلاغ بشارت روحانی تھی اور پیام طاغوتیت شکن۔

مولانا آزاد کی صحافتی بے باکی اور روشن ضمیری نے ہر فرد کے ذہن و ضمیر کو بیدار کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس چراغ سے اتنے چراغ جلے کہ پورا ملک بقعہ نور بن گیا۔ آزاد نے الہلال کے ذریعہ ملک کے عوام کو جو خواب دکھایا تھا، ہر شخص اس کا اسیر ہو گیا اور اس کی تعبیر کے لیے ملک کے ہر فرد اپنا تن، من، دھن تج دینے کے لیے آمادہ ہو گیا۔

اردو زبان و ادب میں صاحبانِ کمال کے بڑی تعداد میں خطوط کے مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن ادبی نقطہ نظر سے مکتوب نگاری کی تاریخ میں غالب کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کا ہی نام لیا جاتا ہے۔ ان دونوں کے خطوط اور خطوط نگاری کی خصوصیات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ مولانا آزاد کے خطوط کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو خطوط وہ ہیں جو مولانا نے ضرورتاً عام فہم اور سیدھی سادی زبان میں لکھے ہیں۔ ان میں ادبیت اور اشعار کا استعمال بہت کم کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس وہ خطوط ہیں جو غبار خاطر کی زینت ہیں، اُن کا انداز بالکل مختلف اور ادبی ہے۔ بقول خلیق انجم ''یہ خطوط نہیں بلکہ مختلف موضوعات پر انشائیے ہیں۔ ان میں مولانا آزاد کے افکار کی سیاسی جھلک بھی نظر آتی ہے۔''

ان کے مکتوبات کے مجموعے پر خلیق انجم لکھتے ہیں کہ مولانا آزاد کے خطوط کا پہلا مجموعہ غبار خاطر" ہے، جسے اجمل خاں صاحب نے مرتب کر کے 1964ء میں شائع کیا۔ ہندوستان اور پاکستان میں اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہوئے لیکن بعد کے ایڈیشنوں میں مالک رام صاحب کا مرتبہ ایڈیشن بڑی محنت دیدہ ریزی اور متنی تنقید کے جدید اصولوں کے مطابق تیار کیا گیا ہے۔ یہ ایڈیشن 1967ء میں شائع ہوا تھا اور 1983ء میں اس کی دوبارہ اشاعت ہوئی۔ مولانا کے مکاتیب کا دوسرا مجموعہ ''کاروانِ خیال'' ہے جسے عبد الشاہد خاں شیروانی نے مرتب کر کے 1964ء میں شائع کیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے 1958 میں نقش آزاد کے نام سے مولانا کے خطوط کا مجموعہ شائع کیا۔ غلام رسول مہر نے مولانا آزاد کے خطوط کا ایک اور مجموعہ ''تبرکات آزاد'' کے نام سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی مولوی محی الدین قصوری، نیاز فتحپوری، خواجہ حسن نظامی اور دیگر حضرات کے نام خطوط شامل ہیں۔ پاکستان کے ابو سلمان شاہ جہاں پوری نے مختلف حضرات کے نام مولانا کے خطوط کا مجموعہ ''مکاتیب ابوالکلام آزاد'' کے نام سے 1968ء میں کراچی سے شائع کیا۔ ظہیر احمد خاں ظہیر نے اپنے دادا سردار محمد اکبر خاں کے نام مولانا آزاد کے خطوط کے ایک مختصر سا مجموعہ ''نوادر ابوالکلام'' کے نام سے مرتب کر کے پاکستان سے شائع کیا۔ پاکستان سے مکاتیب ابو الکلام" ملفوظاتِ آزاد" اور" افادات آزاد "کے نام سے مولانا آزاد کے مختلف خطوط کے مجموعے شائع ہوئے۔

ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں کہ غبار خاطر کا پہلا خط 3 اگست 1943ء کو اُس وقت لکھا گیا، جب مولانا آزاد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ایک جلسے میں شرکت کے لیے بمبئی جا رہے تھے۔ یہ خط ٹرین میں لکھا تھا۔ 8 اگست 1942ء کو کانگریس کا جلسہ ہوا، جس میں ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع کرنے کی تجویز منظور کی گئی۔ اس لیے 9 اگست کی صبح حکومت نے کانگریس کے کئی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ان رہنماؤں میں مولانا آزاد بھی شامل تھے۔ مولانا آزاد کو احمد نگر کے قلعے میں رکھا گیا۔ یہاں سے انھوں نے اپنے عزیز دوست

مولانا حبیب الرحمن شیروانی کو پہلا خط 10 اگست 1942ء کو اور آخری خط 16 ستمبر 1943ء کو لکھا۔

جیل کی تنہائی میں جہاں مطالعہ کی سہولیات فراہم نہ ہوں دل کا غبار نکالنے کا بہترین ذریعہ مکتوب نگاری تھا۔ ان مکاتیب کے بارے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں: یہ مکاتیب نجی خطوط تھے اور اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ شائع کیے جائیں گے، لیکن رہائی کے بعد جب مولوی محمد اجمل خاں صاحب کو ان کا علم ہوا تو مصر ہوئے کہ انھیں ایک مجموعے کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ چوں کہ اُن کی طرح ان کی خاطر بھی مجھے عزیز ہے، اس لیے ان مکاتیب کی اشاعت کا سر و سامان کر رہا ہوں، جس حالت میں قلم برداشتہ لکھے ہوئے موجود تھے، اسی حالت میں طباعت کے لیے دے دیے گئے ہیں۔ نظر ثانی کا موقع نہیں ملا۔

3.5 مولانا آزاد کے ارتحال پر معاصرینِ عالم کا خراج عقیدت

19 فروری 1958ء کی صبح مولانا پر اچانک فالج کا حملہ ہو گیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ تین دن تک مولانا بے ہوش رہے۔ اس دوران کبھی کبھار ہوش آیا۔ لیکن اکثر بے ہوش رہے کچھ دیر کے لیے ہوش آیا تو بولے۔ مجھے پنجرے میں کیوں بند کر رکھا ہے۔ بس اللہ پر چھوڑیے" آخر 22 فروری کی صبح دو بج کر روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ 22 فروری کی سہ پہر تین بجے مولانا احمد سید مرحوم نے دہلی کے پریڈ گراؤنڈ میں نماز پڑھائی اور اسی گراؤنڈ میں جامع مسجد اور لال قلعے کے درمیان انھیں دفن کر دیا گیا۔ اس ایک عالم کی موت پر پورا عالم سوگوار ہو گیا۔

مصر کے سابق صدر جمال عبد الناصر نے اظہارِ تعزیت کرتے ہوئے کہا تھا"آہ! روشنی کا مینار اور عزم و حوصلہ کا سرچشمہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم اہل مشرق اپنی تاریک راہوں کو کس طرح چراغ سے روشن کر سکیں گے اور مغرب کی سامراجی قوتوں سے کس طرح اپنا لوہا منوا سکیں گے۔ مصر 1956ء کے نہر سویز کے معرکہ میں اپنی کامیابی پر سب سے زیادہ مولانا ابوالکلام کا شکر گزار ہے۔ وہ عرب اور ایشیائی اقوام کی آزادی کے سب سے بڑے علم بردار تھے، عرب دنیا اور ایشیا نے گزشتہ پچاس سال میں جو کچھ حاصل کیا وہ مولانا ابوالکلام کی سعی مشکور کا ہی نتیجہ ہے۔ ہندوستان کے اس غم میں ہم اہل مصر اور اہل عرب پوری طرح شریک ہیں۔" مصر کے سابق وزیر تعلیم نے کہا تھا۔ مولانا ابوالکلام کی جدائی ساری دنیا کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ "

ترکی کے سابق صدر عصمت انونو نے مولانا کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا تھا"ترک عوام انہیں نہیں بھلا سکتے، جنگ بلقان اور پہلی عالمی جنگ (1914ء) کے موقع پر ایشیاء کے وہ واحد شخص تھے جنہوں نے نہایت دلیری اور بے باکی کے ساتھ ترکوں کی حمایت کی اور اس حق گوئی کی پاداش میں انگریزوں کی قید و بند کی سختیاں برداشت کیں وہ ترک عوام کو اتنے عزیز تھے کہ انہیں ترکی میں آکر قیام کرنے اور ترکوں کی رہنمائی کرنے کی دعوت دی گئی۔ ترکی اپنی آزادی اور بقا کی جد وجہد میں ان کی حمایت کو ہمیشہ قدر و احترام کی نظر سے دیکھتا رہے گا۔ ان کی وفات سے ہمیں بھی اتنا ہی صدمہ پہنچا ہے جتنا اہل ہند کو۔"ترکی کے مشہور عالم **پروفیسر فواد کبیر** نے اپنے پیغام میں کہا تھا"مولانا آزاد مشرق و مغرب کے ثقافتی علوم کا خزانہ تھے اور جنگ آزادی کے ہیرو۔"

ہم عصر روسی حکومت نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا تھا کہ:

"مولانا ابو الکلام آزاد کی موت کا غم ہندوستان ہی کو نہیں بلکہ روس کے عوام کو بھی ہے۔ وہ ایسے مجاہد تھے جنہوں نے دنیا کی سب سے بڑی استبدادی قوت برطانیہ کے خلاف سب سے پہلے علم جہاد بلند کیا اور ظالم کے خلاف مظلوموں کی صف بندی کی۔ انقلاب روس کے رہنماوں نے ان کی پر جوش جد وجہد آزادی سے بہت زیادہ حوصلہ پایا تھا۔ روس میں انقلاب کی کامیابی ان کی صدائے انقلاب کی بھی رہین منت ہے۔ روس کے عوام اس عظیم انسان کو سلام کرتے ہیں۔"

چینی حکومت نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا تھا:

"چین کے عوام کے لئے آج صدمہ کا دن ہے۔ وہ اپنے ایسے ہمدرد سے محروم ہو گئے ہیں جس نے ہر مشکل وقت میں ان کی حمایت کی۔ چین پر جاپان کی جارحیت کے خلاف انہوں نے بحیثیت صدر کانگریس آواز بلند کی۔ انقلاب چین کی انہوں نے پر زور حمایت کی۔ اقوام متحدہ کے ادارہ، یونیسکو میں انہوں نے سب سے پہلے چین کی نمائندگی کی آواز اٹھائی۔ ہمارے سر اس عظیم انقلابی اور عوام کے دوست کے سامنے خمیدہ ہیں۔

عرب کے مشہور مصنف ودانشور حسنین ہیکل نے اپنے درد وکرب کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا"علم آج سیہ پوش اور ماتم کناں ہے۔ علم کا شہسوار مر گیا ہے اب دل ودماغ کی تشنگی کہاں سے بجھائی جائے گی؟ آہ! دنیا پر کیا اس سے بڑا بھی کوئی سانحہ گزرا ہے؟

برطانیہ کے مشہور فلاسفر برٹرینڈ رسیل نے کہا تھا"یہ خبر سن کر (مولانا ابو الکلام کی وفات کی خبر) مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں یکا وتنہا رہ گیا ہوں، جیسے وہ دریا خشک ہو گیا جس کی موجوں سے ہمیں ذہنی اور فکری سرور حاصل ہو جایا کرتا تھا۔ فیثا غورث، سقراط اور ہیگل کے بعد شاید سب سے بڑے انسان کی موت ہے۔"

مشہور برطانوی مورخ، ٹائن بی لکھتا ہے"تاریخ کی گتھیاں سلجھانے والا ہاتھ شل ہو گیا۔ ماضی حال اور مستقبل پر دور تک نظر رکھنے والا چلا گیا۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا ایک ایسی روشنی سے محروم ہو گئی جس سے انسانی تاریخ کی پر پیچ اور تاریک راہوں کا سراغ لگانا ممکن ہو جاتا تھا۔"

راج گوپال اچاریہ نے مولانا آزاد کی وفات کے موقع پر کہا تھا۔ کہ عربی وفارسی اور اردو کے وہ نامور، جید عالم تھے ہی، بلکہ ایشیا میں ان کا ثانی نہیں تھا، انگریزی کی بھی وہ مشکل اور ادق کتابیں پڑھا کرتے تھے، فرانسیسی زبان کا بھی انہیں علم تھا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے مولانا آزاد کے بارے کہتے ہیں،، فارسی میں ایک مقولہ ہے۔ بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال وتوانگری بدل است نہ بہ مال،، ہماری تاریخ میں یہ بات مولانا آزاد پر سب سے زیادہ صادق آتی ہے۔

پنڈت نہرو نے مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا۔"ہمارے درمیان عظیم ہستیاں رہی ہیں اور رہیں گی، مگر میں یہ کہنا چاہتا

ہوں کہ مولانا آزاد جس نادر عظمت کی علامت تھے وہ اب ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پورے عالم میں دوبارہ نہیں دیکھی جائے گی۔"

ہندوستان کی عظیم شخصیت اور سیاسی رہنما سعید احمد صاحب سابق ایم ایل اے و سابق ریاستی وزیر اپنی کتاب زندگی کا کارواں میں، مولانا آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "ان کے علم و فضل کے باب میں تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ صرف ترجمان القرآن کا کام ہی ایسا ہے کہ وہ دنیا کے علماء میں ممتاز ہیں۔"

3.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کے ان اہم چنندہ رہنماؤں میں سے ایک ہیں جن کے بارے میں ہر عہد اور ہر زمانے میں ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا میں ان کے ناقدین اور مداحوں نے ان کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد بھی ان کی شخصیت، کردار، علمی وقار، سیاسی سماجی، ملی اور ملکی خدمات پر بہت کچھ لکھا ہے۔
- مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی وادبی اور سیاسی خدمات کے بارے میں بر صغیر ہند و پاک کے ہمعصر ممتاز ادیبوں، مصنفوں اور دانشوروں کے خیالات وافکار کے جو مختصر اقتباسات پیش کیے گئے ان سے اُن کی عظمت اُن کے بے داغ کردار اور اُن کی پر خلوص خدمات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
- مولانا کو صحیح معنی میں بین الاقوامی شہرت اور ناموری حاصل تھی۔ اس لیے ان کے انتقال کے بعد بیرونی ممالک کے سربراہان مملکت اور دوسرے مشاہیر نے ان کی بین الاقوامی خدمات کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔
- شیو شنکر کے بقول "مولانا آزاد ایک جید عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند آہنگ مقرر بھی تھے۔ جنھوں نے اپنے پر وقار اندازہ تخاطب سے ہندوستانی قوم کو للکارا تھا اور لاکھوں کروڑوں ہندوستانیوں کے خون کو گرمایا تھا۔ ان کے دل و دماغ کو آزادی اور حب الوطنی کے جذبات سے سرشار کیا تھا۔
- مولانا آزاد نے آزادی کے متوالوں پر مشتمل اس عظیم کارواں کی رہنمائی مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو کے دوش بدوش کی جو آزادی وطن اور عوامی جمہوریت کے حصول کا باعث بنی۔ یہ ایک ایسی تاریخ ہے جسے ہندوستانی قوم کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔
- مولانا آزاد جیسا کہ آپ سب پر واضح ہے، جنگ آزادی کے ایک جانباز مجاہد، نئے ہندوستان کے معمار، آزادی کی بقاء اور جمہوریت کے استحکام کے علمبردار، دردمند دل رکھنے والے، دور اندیش، مفکر اور رہبر تھے۔
- بلاشبہ وہ ایک ایسے عظیم انسان دوست اور قوم پرست رہنما تھے جن کی حب الوطنی اور سیکولرازم کی آج بھی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ ہمارے ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے شانہ بشانہ مولانا نے نئے ہندوستان کی تعمیر و ترقی اور قومی یک جہتی کے فروغ کے لیے جو بیش بہا خدمات انجام دیں۔ وہ ہماری قومی تاریخ کا محض ایک روشن باب ہی نہیں بلکہ ایک قیمتی قومی ورثہ بھی ہیں۔

- مولانا آزاد نے نہ صرف ہندوستانی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ عہدِ حاضر کے قائدین میں سے ایک تھے جنہوں نے متحدہ قومیت کو فروغ دیا۔ جمہوری سیکولر اور عوامی تحریک کی نمائندگی کی۔
- مولانا ابوالکلام آزاد نے انسانی ہم آہنگی، مذہبی امن و آشتی، جمہوری طرزِ فکر، انسانی حقوق کے پاسدار، عدل و انصاف پر مبنی نظام کی وکالت کی۔ ان کا بنایا ہوا نصب العین آج بھی ہمارے ملک اور قوم کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

3.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
ڈلہوزی اسکوئر	:	کلکتہ میں لارڈ ڈلہوزی کے نام الفنسٹن چوک پر واقع ایک علاقہ۔
مسلم گزٹ	:	مدراس سے نکلنے والا روزنامہ جس کے بانی محمد کریم الدین تھے۔
زمیندار	:	ظفر علی خان کا جاری کردہ اردو اخبار
الہلال	:	1912 میں مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی بیداری کے لئے جاری کیا گیا رسالہ۔
البلاغ	:	الہلال پر پابندی لگنے کے بعد نومبر 1915 سے جاری ہونے ولا رسالہ
رجز	:	وہ اشعار جو عرب کے لوگ لڑائیوں میں اپنی تعریف اور اپنے قبیلے کی شرافت، بہادری اور بزرگی کے اظہار کے لیے پڑھتے تھے۔
زغلول پاشا	:	مشہور مصری محبِ وطن لیڈر
کمال اتاترک	:	سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد جدید ترکی کا بانی رہنما

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا ابوالکلام آزاد بچپن میں ہی پچاس سال کے تھے کس کا قول ہے؟
2. کس نے کہا تھا کہ مولانا آزاد نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا؟
3. تلاشِ ہند یا ڈسکوری آف انڈیا کس کی تصنیف ہے؟
4. مولانا آزاد ہندوستان کب تشریف لائے؟
5. لال ڈوگی کہاں پر واقع ہے؟
6. حافظ ولی اللہ کون تھے؟
7. پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کس کی پالیسی تھی؟

8. مولانا آزاد کا تاریخی نام کیا تھا؟
9. آزاد ہندوستان میں مولانا آزاد کو کون سی وزارت دی گئی تھی؟
10. مولانا آزاد کا انتقال کب ہوا؟

3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کے بارے میں گاندھی جی کے بیان کی وضاحت کیجیے۔
2. مولانا آزاد کی علمی قابلیت پر جوہر لال نہرو کے خیالات بیان کیجیے۔
3. مولانا آزاد کی خطابت کی بابت غلام رسول مہر کے محسوسات کا جائزہ پیش کیجیے۔
4. مولانا آزاد کی صحافت کے بارے میں نیاز فتح پوری کے خیالات بیان کیجیے۔
5. مولانا آزاد سے پہلی ملاقات پر علی میاں ندوی کے تاثرات پیش کیجیے۔

3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کی خودی کے بارے میں خواجہ غلام السیدین کے بیان کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔
2. مولانا آزاد کی مفکرانہ حیثیت کے بارے میں آل احمد سرور کے بیان پر روشنی ڈالیے۔
3. مولانا آزاد کی نثر کی لطافت پر سجاد انصاری کے بیان کی وضاحت کیجیے۔

3.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی	مرتبہ: مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی
2. آثار ابوالکلام	قاضی عبدالغفار
3. مولانا ابوالکلام آزاد: تحریک آزادی و یک جہتی	مرتبہ: خان عبدالودود خان
4. مولانا ابوالکلام آزاد	عابد رضا بیدار
5. ترجمان القرآن	ابوالکلام آزاد
6. غبار خاطر	مرتبہ: مالک رام
7. آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت	رشید الدین خاں

اکائی4: مولانا آزاد کا عہد

اکائی کے اجزا

4.0		تمہید
4.1		مقاصد
4.2		مولانا آزاد کے عہد کا سیاسی ماحول
4.3		ادبی ماحول
4.4		عالم اسلام کی صورت حال
4.5		اکتسابی نتائج
4.6		کلیدی الفاظ
4.7		نمونہ امتحانی سوالات
	4.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	4.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	4.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
4.8		تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

مولانا آزاد کی شخصیت کی تشکیل میں ان کے خاندان، تعلیم اور عہد کا کردار انتہائی حیثیت کا حامل ہے۔ مولانا آزاد نے جس زمانے میں آنکھ کھولی وہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی لحاظ سے مسلمانوں کی شکست وریخت کا دور تھا۔ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد ہندوستانی قوموں کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ لہٰذا مولانا آزاد بھی ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مولانا ابوالکلام آزاد(1888) کی پیدائش کے وقت سرسید تحریک اپنے عروج پر تھی۔ جس کا اثر مولانا کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ وہ سرسید کے مذہبی اور ادبی افکار و نظریات کو اپناتے ہیں لیکن ان کے سیاسی نظریات سے اجتناب کرتے ہیں۔ مولانا آزاد ایک ممتاز ہندوستانی قوم پرست رہنما، اسلامی اسکالر، اور نو آبادیاتی دور میں

ہندوستان کی آزادی کے زبردست حامیوں میں سے تھے۔ ان کا عہد کئی دہائیوں پر محیط تھا جس میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے مختلف مراحل، زبان وادب کی مختلف تحریکیں، خلافت عثمانیہ کا خاتمہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس اکائی میں ہم مولانا آزاد کے عہد کا سیاسی، ادبی اور عالمی تناظر میں مطالعہ کریں گے۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مولانا آزاد کے سیاسی ماحول سے واقف ہو سکیں۔
- مولانا آزاد کے زمانے میں ادبی تحریکوں، ماحول کا جائزہ لے سکیں۔
- مولانا آزاد کی شخصیت پر ان کے عہد نے کیا اثرات مرتب کیے، اس کو بیان کر سکیں۔
- مولانا آزاد کے عہد میں عالم اسلام کی صورت حال کا مطالعہ کر سکیں۔

4.2 مولانا آزاد کے عہد کا سیاسی ماحول

انیسویں صدی کے آخر تک انگریز ہندوستان کے بڑے حصے پر قبضہ کر چکے تھے اور اپنے اقتدار کی بنیادوں کو مزید مستحکم کرنے کے لیے مختلف اقدامات کر رہے تھے۔ برصغیر کے باشندوں کے ساتھ ان کا رویہ ہتک آمیز تھا اور بطور فاتح ان میں احساس برتری نمایاں تھا۔ اس احساس تفاخر اور اپنی سیاسی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے کئی ایسے اقدامات کرنے شروع کر دیے جن کو اہل ہند پسند نہیں کر رہے تھے۔ لہٰذا ہندوستانیوں کے اندر انگریزوں سے نفرت بڑھتی گئی۔

جب برصغیر کی عوام غلامی کے جبر واستبداد کے شکنجے میں جکڑ دی گئی تو کئی رہنماؤں نے اپنے اپنے انداز میں اصلاحی تحریکیں چلائیں جن میں بنگال میں حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک اور تیتو میر کی تحریکیں شامل ہیں۔ گو یہ تحریکیں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکیں لیکن انہوں نے ٹھہرے ہوئے سماجی ماحول میں تموج ضرور پیدا کیا۔

1757ء میں سراج الدولہ نے انگریزوں سے جنگ کی لیکن انگریزوں نے اپنی بدنام زمانہ حکمت عملی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کو کام میں لاتے ہوئے میر جعفر کو اپنے ساتھ ملا لیا اور سراج الدولہ کو شکست دے دی۔ اس جنگ کی کامیابی سے کمپنی نے تجارت کے ساتھ ساتھ حکومت کی بنیاد بھی رکھ دی اور اس طرح ان تاجروں نے اپنے آپ کو ہندوستان کا حکمران سمجھنا شروع کر دیا۔ جنگ پلاسی میں ہندوستانی عظمت کا ایک ستون گر گیا۔ اس جنگ سے ہندوستانی سیاست پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے اور انگریزوں نے پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی اور مختلف مقامی طاقتوں کی مدد سے مقامی نوابوں کو دبانا شروع کر دیا۔

دوسرا اہم سیاسی واقعہ جس نے برصغیر کی سیاست پر دور رس اثرات مرتب کیے وہ ٹیپو سلطان کی شکست ہے۔ دکن میں اس وقت صرف دو قابل ذکر قوتیں باقی تھیں ایک مرہٹے اور دوسری ریاست میسور جس کا حاکم سلطان حیدر علی کا لائق اور بہادر سپوت سلطان ٹیپو تھا۔ سلطان ٹیپو نے آخری دم تک انگریزوں کے جبر سے ہندوستان کو پاک کرنے کی پرزور کوشش کی۔

انگریزوں کی اپنی تہذیب وثقافت تھی جس ہر وہ عمل پیرا تھے اور مقامی تہذیب، کلچر اور رسوم وعقائد کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ عیسائیت کے فروغ کے لیے ہندوستان میں مشنریوں کو انگریزوں کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ انہوں نے اودھ کے بادشاہ نواب واجد علی شاہ کو بغیر کسی وجہ کے معزول کر دیا۔ وہ انصاف کے لیے ایک عرصہ تک کلکتہ میں منتظر رہے ہیں۔ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر بھی لال قلعہ میں نظر بند تھے۔ رہی سہی کسر 1857 کی ناکام جنگ آزادی نے پوری کر دی۔ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لیے انگریزوں نے اس جنگ آزادی کا ذمہ دار بھی مسلمانوں کو قرار دیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو شدید مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ انگریزوں نے بڑی سفاکی سے ہندوستانی مسلمانوں کو تباہ وبرباد کر کے رکھ دیا۔

ہندوستان کی عوام شدید معاشی مشکلات کا شکار تھی پیداوار کے ذرائع ختم ہو کر رہ گئے تھے اور کسی قسم کا روزگار میسر نہ تھا۔ صرف معمولی تجارت، کاشتکاری یا سرکاری نوکری تھی مگر عام لوگوں کے لیے مادی ذرائع مسدود تھے۔ بھوک اور جہالت کا دور دورہ تھا۔ یہ وہ حالات تھے جس نے برصغیر کے باشندوں کو مضطرب کر رکھا تھا اس لیے انہوں نے غلامی کا طوق اتار پھینکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سرسید احمد خان نے تمام حالات کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیا اور پھر نہایت ہی دیانتداری سے یہ فیصلہ کیا کہ موجودہ حالات میں انگریزوں سے تصادم کا راستہ اختیار کرنا مسلمانوں کے لیے مزید تباہی لائے گا۔ اس لیے انہیں ساتھ لے کر آگے بڑھنا مفید و مناسب ہو گا۔ سرسید کے بنائے ہوئے سارے تعلیمی و سماجی ادارے، سوسائٹیاں اور کانفرنسیں اسی سوچ اور اسی نقطہ نظر کی علمبردار تھیں۔ سیاسی سطح پر وہ ہر قسم کے نزاع سے مسلمانوں کو دور رکھنا چاہتے تھے تاکہ مسلمان دوسری بار انگریزوں کے مد مقابل نہ آئیں اور انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا نہ ہو۔ اسی لیے سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس پارٹی میں شامل ہونے سے منع کیا۔

مولانا آزاد سرسید کے مذہبی اور ادبی افکار وخیالات سے متاثر ہوئے مگر سیاسی مسائل پر انہوں نے اپنا ایک الگ نقطہ نظر قائم کیا جو عام مسلمانوں کے نقطہ نظر سے مختلف تھا۔ جس کا اعتراف انہوں نے 20 فروری 1949ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں خطاب کرتے ہوئے کیا تھا:

> "عوام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات سرسید کے تہذیب الاخلاق نے چھوڑے ہیں ہندوستان میں کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے۔۔۔ اردو نے اس رسالے کی بدولت اتنا فروغ پایا کہ دقیق سے دقیق مطالب کا اظہار اس زبان میں ہونے لگا۔ اس دور کا کوئی مسلمان ادیب ایسا نہ تھا جو تہذیب الاخلاق کے حلقہ ادب سے متاثر نہ ہوا ہو، دور جدید کے بلند معیار مصنفین نے

اسی خانہ نعمت سے لقمے چنے، اسی حلقہ اثر و نفوذ سے نقد و بصر کی نئی قدریں اور فکر و نظر کے نئے زاویے متعین ہوئے"۔ (مولانا آزاد کی تقریریں، ص204)

بیسویں صدی کی ابتدا بہت سی تبدیلیوں سے ہوئی۔ اس زمانے کے متحدہ اتر پردیش کے گورنر نے اردو دشمنی کا ثبوت دیتے ہوئے ہندی کو عدالتی زبان قرار دے دیا۔ مسلمان جو پہلے ہی سے زخم کھائے ہوئے تھے اس اقدام سے انہیں مزید تکلیف پہنچی اور ان کے جذبات مجروح ہوئے۔

برصغیر کی سیاسی تاریخ کا اہم واقعہ بنگال کی تقسیم ہے۔ لارڈ کرزن نے 1905ء میں بنگال کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ بظاہر اس تقسیم کا مقصد بنگال کی انتظامی حکومت کا بوجھ ہلکا کرنا تھا لیکن پس پردہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کو ختم کرنے کی سازش تھی۔ چونکہ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی آبادی 66 فیصد تھی۔ لہٰذا اس کا براہ راست فائدہ مسلمانوں کو پہنچا۔ کیونکہ اس علاقے میں افسران جانے سے کتراتے تھے۔ تعلیم کا فقدان، جرائم زیادہ اور زمینداروں کا ظلم و ستم انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ بنگال کی تقسیم سے مسلمانوں کے حالات میں بہتری کی امید جاگی تھی لیکن ہندوستانی عوام کی اکثریت کی مخالفت کے سبب اس تقسیم کو منسوخ کرنا پڑا۔

تقسیم بنگال کی منسوخی سے مسلمانوں کی سیاست ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔ قوم نے سر سید کی سیاست سے دور رہنے کے نظریے کو ترک کر دیا اور نوجوان طبقہ سیاست میں کود پڑا۔ مسلمانوں نے جب اپنی شکست کے اسباب پر غور و خوض کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی آواز حکومت تک پہنچانے کے لیے ان کی الگ سے کوئی سیاسی جماعت ہو۔ بلآخر 1906ء میں "مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا۔

مولانا آزاد نے مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کی شدت سے مخالفت کی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ مولانا مسلمانوں کے کچھ مخصوص مسائل سے واقف تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ مسلمان بھی دیگر برادران وطن کے شانہ بشانہ آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیں۔ مولانا آزاد نے جب بلاد اسلامیہ کا دورہ کیا اور وہاں کے انقلابیوں سے ملاقات کی تو انہیں برطانوی استعماریت کے عالمی تسلط اور استحصال کا پتہ چلا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

"مجھے اور بھی زیادہ یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کو ملک کی آزادی کی مہم میں شرکت و معاونت کرنا چاہیے اور اس کی تدبیر کرنی چاہیے کہ برطانوی حکومت اپنی اغراض کے لیے انہیں ناجائز طور پر استعمال نہ کر سکے۔" (ہماری آزادی، ص20)

لارڈ کرزن کے اس اقدام سے جہاں مسلمانوں کو امید کی کرن نظر آئی تھی وہیں ملک کی سیاسی بے چینی میں ایک نئی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وقت نچلے متوسط طبقے کے اندر سیاسی بیداری پھیل چکی تھی اور وہ کانگریس میں شامل ہو رہے تھے۔ لیکن نئے آنے والوں کا یہ طبقہ پرانی قیادت اور اس کے مصالحانہ رویے سے مطمئن نہ تھا۔ پرانے لوگوں کا اب بھی یہ خیال تھا کہ انگریزی حکومت کے ساتھ تعاون کے امکانات باقی ہیں مگر حکومت کا استبداد دستوری احتجاج پر سے لوگوں کے اعتماد کو زائل کر رہا تھا اور تقسیم بنگال کے وقت خود کانگریس کے اندر ایک بائیں بازو کی تشکیل ہو چکی تھی۔ اگرچہ ان کی تعداد کم تھی مگر ان کو صنعتی طبقے کی ہمدردیاں حاصل تھیں۔ بنگال کی تقسیم نے کانگریس

کے دونوں دھڑوں کے درمیان خلیج کو اور بھی بڑھادیا اور بال گنگادھر تلک، بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے کانگریس کے انقلابی گروپ کے لیڈر بن گئے۔ کانگریس کے دونوں گروہوں کا یہ اختلاف کانگریس کے اکیسویں سالانہ اجلاس میں جو بنارس میں دسمبر 1905ء میں ہوا، زیادہ واضح نظر آنے لگا۔ لالہ لاجپت رائے نے کھلے الفاظ میں اس بات کا اعلان کیا کہ انگلستان جاکر دستوری مراعات طلب کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور اگر ہندوستان والوں کو اپنے ملک کی پرواہ ہے تو انھیں آزادی کے لیے خود ہی اقدام کرکے اپنے خلوص کا ثبوت دینا ہوگا۔

تقسیم بنگال کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان جو اختلاف رونما ہوئے اس خلا کو خلافت تحریک نے کافی حد تک پر کیا۔ 1919ء میں تحریک خلافت کا آغاز ہوا۔ خلافت تحریک کے زمانے میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف تحریک چلائی۔ مسلمانوں کے ملی معاملات نے انہیں کانگریس سے مدد حاصل کرنے کے لیے راغب کیا۔ چنانچہ ایک متحدہ محاذ تشکیل دیا گیا۔ کانگریس نے بھی حکومت پر دباؤ بنانے اور اپنی اہمیت کو دکھانے کے لیے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔

ہندوستان کے مسلمان معاشرے میں عالم اسلام سے محبت اور والہانہ لگاؤ اس دور میں اس شدت کے ساتھ ابھرا کہ اس کی زد میں تاریخ، ادب، سیاست اور ثقافت ہر چیز آگئی۔ جب کہ سرسید نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان اسلامی ملکوں اور خاص طور پر ترکی سے اپنا تعلق رکھیں کیونکہ ترکی عالمی سیاست میں برطانیہ کے خلاف تھا اس لیے مولانا آزاد نے اس پالیسی کی مخالفت کرتے ہوئے حسن نظامی کو ایک خط میں لکھا کہ:

> "علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کو عضو شل بنادیا۔۔۔ آج کوئی وطنی یا مقامی تحریک مسلمانوں کو فائدہ نہیں پہنچاسکتی جب تک کہ تمام دنیائے اسلام میں ایک بین الاقوامی اور عالمگیر تحریک نہیں ہوگی۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چالیس کروڑ مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچاسکتے ہیں۔"
>
> (موج کوثر، ص255)

1920 کی دہائی میں، مہاتما گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی، جس میں ہندوستانیوں سے برطانوی اداروں، اسکولوں، عدالتوں اور سرکاری دفاتر کا بائیکاٹ کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ مولانا آزاد نے عدم تعاون کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس نے عدم تشدد کے ساتھ مزاحمت اور ہندو مسلم اتحاد کی وکالت کی۔

عدم تعاون کی تحریک کے بعد، گاندھی نے 1930 میں ترک موالات (سیول نافرمانی) کی تحریک کی بنیاد رکھی، جس نے ہندوستانیوں پر زور دیا کہ وہ ٹیکس ادا کرنے سے انکار کریں، برطانوی سامان کا بائیکاٹ کریں، اور سیول نافرمانی کی کارروائیوں میں ملوث ہوں۔ مولانا آزاد نے سیول نافرمانی کی تحریک کے لیے حمایت کو متحرک کرنے میں اہم کردار ادا کیا، جس نے پرامن احتجاج اور تشدد کے خلاف مزاحمت کی وکالت کی۔

4.3 ادبی ماحول

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب تجارت سے سیاست کی طرف قدم بڑھایا اور ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا تو نئے حکمرانوں کو ہندوستان میں

جن مسائل سامنا پڑا، ان میں نظم ونسق کی بحالی اور منفعت بخش حکمرانی کے لیے ہندوستانی معاشرے کی تفہیم اور ہندوستانی رعایا کو انگریزی حکومت کا ہمنوا بنانے کے لیے مغربی علوم اور تہذیب کی ترویج شامل تھی۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ہندوستان میں جو ادارے قائم کیے گئے ان میں فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج انگریزوں کو ہندوستانی زبان اور معاشرت سے آگہی مہیا کرنے کا ادارہ تھا اس کے برعکس انگریزی تصورات اور علوم کی تربیت گاہ دلی کالج تھا۔ فورٹ ولیم کالج غیر ملکی نوواردوں کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا جبکہ دلی کالج کا مقصد ہندوستانی عوام کو جدید علوم سے آراستہ کرنا اور ان کے قدیم اور راسخ اعتقادات پر جدیدیت کا اثر مرتسم کرنا تھا۔

فورٹ ولیم کالج کے تربیت یافتہ طلبہ نے انگریزی سامراج کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا جبکہ دلی کالج کے فارغ التحصیل طلبہ نے قوم کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا اور اس کی نشاۃ ثانیہ کو قریب تر لانے میں عمدہ خدمات انجام دیں۔ دونوں کالجوں میں ذریعہ تعلیم چونکہ اردو تھا اس لیے نصاب کی کتابوں کی فراہمی کے لیے تراجم کو اہمیت دی گئی اور یوں بالواسطہ طور پر اردو ادب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے جب آنکھ کھولی تو علی گڑھ تحریک اپنے شباب پر تھی۔ اردو ادب پر سرسید اور ان کے رفقائے کار کا اثر واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ مولانا آزاد نے سرسید کا آخری دور بھی دیکھا۔ محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، الطاف حسین حالیؔ، محسن الملک، چراغ علی اور نذیر احمد وغیرہ اردو زبان وادب کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ لیکن مولانا آزاد کی تعلیم وتربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا جس میں تازہ ہوا کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ مولانا کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ روایتی تعلیم کا یہ ابتدائی سرمایہ انہیں ایک جامد و ناآشنائے حقیقت دماغ سے زیادہ اور کچھ نہیں دے سکتا اور تقلیدی عقائد کی زنجیروں کو توڑے بغیر وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ سرسید کے افکار وخیالات نے مولانا آزاد کو مذہبی اور ادبی سطح پر متاثر کیا۔

1857ء کے غدر میں دہلی کی تباہی وبربادی سے پہلے ہی سرسید علمی، ادبی، سیاسی اور تہذیبی حلقوں میں متعارف ہو چکے تھے اور انہوں نے رفاہ عامہ کے امور اور تصنیف وتالیف کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ 1841 سے لے کر 1857 تک انہوں نے 15 کتابیں تالیف کیں ان کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کو مذہب اور تاریخ سے یکساں دلچسپی تھی۔ سرسید کی ذات میں قدامت اور جدیدیت دونوں کا امتزاج موجود تھا چنانچہ ان کی شخصیت سے ایک ایسی تحریک پھوٹی جس نے اسلامیان ہند کو اپنی جداگانہ حیثیت کا احساس دلایا۔

1857 کے بعد سرسید تحریک کو زیادہ مقبولیت حاصل ہونے لگی۔ اس عرصے میں انہوں نے کئی ایسے امور انجام دیے جس کی وجہ سے لوگ سرسید کی تحریک کی طرف کھنچنے لگے۔ چنانچہ 1860 میں قحط کے دوران انہوں نے مراد آباد میں قحط زدگان کے لیے خوراک اور علاج کا انتظام کیا۔ مذہبی غلط فہمیوں کو رفع کرنے کے لیے مذہبی صحائف کو اساس بنایا اور عبرانی سیکھ کر وہ تمام اصول تلاش کیے جن کی تحریف لفظی اسلام کے خلاف استعمال کی جاتی تھی۔ سرسید اس خطرے سے آگاہ تھے کہ عیسائی مبلغوں کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی اور وہ مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد سے منحرف کرنے کی کوشش میں مصروف تھے چنانچہ انہوں نے اسباب بغاوت ہند میں بغاوت کی ایک اہم وجہ

مذہب میں اسی بے جا دخل اندازی کو بھی شمار کیا اور عیسائی مذہب کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے عیسائی مبلغوں کے طریق عمل کی مذمت کی۔ اس دور میں سرسید کے دو اہم کارنامے مدرسہ غازی پور اور سائنٹیفک سوسائٹی کا قیام ہے۔ مدرسے کا مقصد نونہالان وطن کو نئی تعلیم سے روشناس کرانا تھا اور سوسائٹی کا مقصد بڑوں کو علوم نو سے متعارف کرانا تھا۔

علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کی پسماندگی کو سیاسی انداز میں دور کرنے کی کوشش کی اور مدرسۃ العلوم کے ذریعے ان کی بصیرت کو بدرجہ اتم بڑھایا۔ اخبار "تہذیب الاخلاق کے ذریعہ ذہنی انقلاب کی راہ ہموار کی اور تراجم کے ذریعے ان علمی خزانوں کو مسلمانوں کے گھروں میں پھیلا دیا جو پہلے یورپ کے کتب خانوں میں مدفون تھے اور جن تک مسلمانوں کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ چنانچہ علی گڑھ تحریک کا سیاسی زاویہ نہ صرف متحرک نظر آتا ہے بلکہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور تمدنی زندگی میں بھی انقلاب برپا کیا اور ایک جداگانہ قوم کا احساس پیدا کر کے سیاسی کامیابیوں کی راہ ہموار کی۔

1800ء کے پہلے کا اردو نثری سرمایہ صوفیائے کرام کے ملفوظات اور داستانوں پر مشتمل تھا۔ عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کا غلبہ تھا۔ فورٹ ولیم کالج نے اپنی ضرورت کے حساب سے سادہ نویسی کا آغاز کیا لیکن نثر میں نئی اصناف کا آغاز 1857ء کے بعد ہوا۔ مضمون، ناول، سوانح، تاریخ، تنقید، خاکہ نگاری اور مزاح نگاری کا آغاز علی گڑھ تحریک کے دوران ہوا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں افسانہ نگاری اور پھر انشائیہ اور ڈرامہ بھی اس صنف میں شامل ہوگئے۔ جس کی وجہ سے رنگارنگ اور متنوع موضوعات نظم و نثر میں داخل ہوگئے۔ قومی، تہذیبی، اجتماعی و انفرادی اور سیاسی مسائل پر لکھا جانے لگا جس کی وجہ سے اردو ادب زندگی کی ہمہ جہتی سے آشنا ہوا۔

علی گڑھ تحریک نے عشق و عاشقی کے موضوعات سے خود کو دور رکھا۔ کیونکہ یہ ایک مقصدی تحریک تھی اور برصغیر کی عوام کو زبوں حالی سے نکالنے کی شعوری کوشش کر رہی تھی لہٰذا اس نے شاعری کے مقابلے میں نثر کو ترجیح دی۔ اردو نثر میں عوام تک ان کے مسائل کا حل پہنچانا زیادہ آسان تھا۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ علی گڑھ تحریک نے شاعری کو یکسر مسترد کر دیا ہو۔ اس تحریک نے شاعری کو بھی پروان چڑھایا بلکہ اس میں اپنے مقصدیت کے پہلو کو غالب رکھا۔ سرسید نے خود حالیؔ سے مسدس "مدوجزر اسلام "لکھوایا۔ اس تحریک نے عشقیہ شاعری کے بجائے نیچرل شاعری کو فروغ دیا۔

مولانا آزاد کے عہد کا ایک اور اہم کارنامہ "انجمن پنجاب "کا قیام ہے۔ اس انجمن کا پورا نام "انجمن اشاعت مطالبِ مفیدہ پنجاب" تھا جو بعد میں انجمن پنجاب کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کا قیام 1865ء میں ہوا۔ انجمن پنجاب ایک جامع، ہمہ جہت اور مکمل ادبی تحریک تھی۔ اس تحریک نے اردو نظم و نثر دونوں کو یکساں طور پر متاثر کیا اور شاعری میں غزل کے تسلط کو اور تنقید و تحقیق میں تذکرہ نگاری کی حاکمیت کو ختم کرنے کی سعی کی۔ انگریزی علوم کے فروغ نے اس تحریک کو قوت اور توانائی عطا کی۔ چنانچہ نہ صرف لفظ کا نیا استعمال وقوع میں آیا بلکہ طرز احساس و اظہار میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔ نشر و اشاعت کی سہولت، اخبار و رسائل کی ترقی اور طلبہ اور عوام کے ساتھ براہ راست تعلق نے اس تحریک کے بنیادی مقاصد اور تنقیدی، تخلیقی اور تحقیقی کاموں کو پورے ہندوستان میں پھیلنے کا موقع دیا۔

انجمن پنجاب کے اغراض و مقاصد کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں قدیم مشرقی علوم کے احیا کو اولیت کا درجہ حاصل

تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت کی مدد سے پہلے مدرسۃ العلوم مشرقی قائم کیا گیا پھر اسی ادارے کو اورینٹل کالج بنا دیا گیا۔ مشرقی علوم کی تدریس کے علاوہ تحقیق و تصنیف اور طباعت واشاعت کا کام بھی اسی ادارے کو سونپ دیا گیا۔

مختصر یہ کہ 1857 کے ہنگامے کے بعد مسلمان معاشرہ کا شیرازہ اندرونی و بیرونی طور پر بکھر گیا۔ اقتدار سے مکمل محرومی کے بعد ان کی معاشی و ثقافتی زندگی بھی ٹوٹ پھوٹ گئی۔ ہندوستان کی دوسری اقوام سے ان کے رشتے ختم ہو گئے اور انگریزوں نے انہیں یکہ و تنہا کر دیا۔ ان حالات میں انہوں نے ایک طرف تو اسلام کے شاندار ماضی میں پناہ لی اور دوسری طرف خود کو امت مسلمہ کا ایک حصہ سمجھ کر اپنے میں اعتماد پیدا کرنا چاہا۔

شبلی نے محسوس کیا کہ مسلمانوں میں اسلامی تاریخ کی شان و شوکت کی یاد کو راسخ کرنے کی شدت کے ساتھ ضرورت ہے۔ یوں تو ہندوستان کی بہت سی تاریخیں لکھی گئیں اور مغلیہ اور تیموریہ دور کے کارنامے بڑی آب و تاب سے بیان کیے گئے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی مجموعی تاریخ بھی ہماری قومی تاریخ کا ایک بہت چھوٹا حصہ ہے۔ عبدالحلیم شرر، راشد الخیری اور حکیم محمد علی نے تاریخی ناولوں کے ذریعے اسلامی تاریخ کو ابھارا تو عبدالرزاق کانپوری نے شبلی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے البرامکہ اور نظام الملک پر کتابیں لکھیں۔ یہی وہ روایات تھیں جو حالی اور اقبال تک آئیں۔ حالی نے مسدس مدوجزر اسلام لکھ کر اسلامی تاریخ کے عروج وزوال کو بیان کیا تو اقبال کو مسجد قرطبہ میں وہ شان و شوکت نظر آئی جو ہندوستان کی کسی مسجد میں نہیں تھی۔

4.4 عالم اسلام کی صورت حال

مولانا آزاد نے جب ہوش سنبھالا تو عالم اسلام ایک انحطاطی دور سے گزر رہا تھا۔ عرب اقوام عثمانی سلطنت کا حصہ بن جانے کے بعد اپنی آزادی اور خود مختاری کھو چکے تھے۔ ترکی کی ناانصافیوں اور ظلم و ستم کے خلاف وہاں زبردست جذبات تھے جن سے فائدہ اٹھا کر یورپی اقوام انہیں بغاوت پر اکسا رہی تھیں۔ ایران میں قاچار خاندان کی نااہل حکومت کے نتیجے میں بدعنوانیاں اور رشوت زوروں پر تھی اور یورپی سامراجی طاقتیں اس پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔ افغانستان دنیا سے کٹا ہوا انتہائی پسماندہ ملک تھا۔ ترک سلطنت اپنے وسعت کے بوجھ کے نیچے دبی سسک رہی تھی۔ ایسے وقت میں سید جمال الدین افغانی نے ایک عالمی تحریک چلائی اور عالم اسلام کو متحدہ محاذ بنانے کے لیے آمادہ کیا۔

سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم معاشرے کی مردہ رگوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑائی اور اپنی ساری زندگی اسی مقصد کے حصول کے لیے وقف کر دی۔

اٹھارہویں صدی کے زمانے سے ہی مسلمان اور مسیحی علما و مفکرین نے سیاسی، تبلیغی و علمی سطح پر سرگرمیاں انجام دینا شروع کر دی تھیں اور دونوں میں ٹکراؤ پیدا ہو چکا تھا۔ مسیحی نظام چونکہ جدید سائنس اور اس کی متعلقہ ایجادات سے لیس تھا اس لیے اس کا پلہ بھاری رہا۔ مسلم معاشرہ شدید بحرانی کیفیت سے دوچار ہو گیا اور شک و شبہ کی ایک دبی ہوئی سی لہر مسلم مفکرین کے ہاں خود پیدا ہو گئی ان کے مذہبی

معتقدات کی بنیادیں ہل گئیں۔ بقول محمود الحق:

"اب پیچ در پیچ مقدمات، منطقی اصطلاحات اور فقہی توجیہات کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔" (مجلہ علوم اسلامیہ، جون 1922، ص62)

مسلم ممالک مغربی استعمار کی جارحانہ سیاست کا شکار ہو کر محکومی یا نیم محکومی میں گرفتار ہو گئے اور ان کے اندر سیاسی ضعف پیدا ہو گیا۔ اس صورتحال میں بنیادی طریقہ پر دو لازمی سوالات مسلمانوں کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ سب سے پہلا سوال تو یہ تھا کہ اس سیاسی ضعف اور کمزوری کا تعلق کس حد تک مذہب اسلام کی کمزوریوں سے ہے اور دوسرا سوال یہ تھا کہ کیا اسلام موجودہ سائنسی دور کے تقاضوں کا ساتھ دے بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر دے سکتا ہے اور اس میں ہر دور کے تقاضوں کا ساتھ دینے اور انہیں پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہے تو کیا وجہ ہے کہ گزشتہ چار پانچ صدیوں میں سیاست، فکر اور تہذیب کی بساط پر اسلام کے مہرے مات کھاتے رہے۔ شکوک و شبہات کے یہ عناصر تمام مذہبی، سیاسی اور اسلامی تحریکوں کے پیچھے کارفرما تھے جو اس عرصے میں ظہور پذیر ہوئیں۔

وہابی اور سنوسی تحریکات جس نے مسلمانوں میں قرآن کے علاوہ دیگر تمام احکامات کو رد کرنے کی دعوت دی اور جس نے مسلم ممالک میں سیاسی اعتبار سے بھی مستحکم ہونے کی کوشش کی اسی بحرانی کیفیت کا رد عمل تھیں۔ ترکی میں استبداد کے مقابلے دستوری اصلاحات کا مطالبہ، شمالی افریقہ میں سنوسیوں کا زور، ایران کی بابی تحریک، شام، عراق، لبنان اور تیونس میں قوم پرست تحریکوں کی ابتدا یہ سارے کے سارے مظاہرے اسلام کے مذہبی اور سیاسی انتشار کی غمازی کرتے ہیں۔ ان تمام تحریکات کے اثرات مرتب ضرور ہوئے مگر ان کا دائرہ عمل ایک مخصوص علاقے تک محدود رہ گیا اور ان کا نصب العین فوری تقاضوں کو پورا کرنے کی حد تک باقی رہا لیکن جس شخص نے تمام اسلامی ممالک کے مسائل کو باہم مربوط کر کے حل کرنے کی کوشش کی اور جس کی تخم ریزیوں نے تمام اقصائے اسلام میں لبرل ازم، تجدیدیت اور قومیت کی لہلہاتی فصل کھڑی کر دی وہ جمال الدین افغانی تھے جو بقول مولانا آزاد:

"اپنے اندر ایسی قوت تخلیق رکھتا تھا کہ جہاں جاتا تھا اپنی تحریک کو زندہ رکھنے کے لیے نئے جمال الدین پیدا کر لیتا تھا۔" (الہلال، 13 جولائی، 1912، ص5)

وہ چاہتے تھے کہ تمام مسلم ممالک ایک مرتبہ مغربی تسلط اور ان کی دستبرد سے چھٹکارا حاصل کر لیں اور اسلام میں ایسی اصلاحات نافذ کر دی جائیں جو زمانہ حاضر کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ سیاسی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے جدید عسکری تعلیم اور عصری آلات حرب کے استعمال پر انہوں نے زور دیا اور مسلمانوں کی اخلاقی، تعلیمی اور مذہبی اصلاح کے لیے علوم جدیدہ کی تعلیم کے حصول کو انہوں نے مقدم بتایا۔ چنانچہ مسلمانوں کی سیاسی برتری کے لیے انہوں نے پہلی بار عالم اسلام کو اسلامی قومیت کا نعرہ دیا اور اسلامی ملکوں میں اٹھنے والی مختلف تحریکوں کو ایک پلیٹ فارم پر آنے کی دعوت دی۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک اسلامی حکومتیں ایک اتحادی زنجیر میں منسلک نہیں ہو جاتیں ان کی ترقی غیر ممکن ہے۔ انہوں نے نہ صرف مغربی تسلط کے بڑھتے ہوئے خطرے کو پہچانا اور عالم اسلام کو اس سے خبردار کیا بلکہ جدید سائنسی

تعلیم کی شدید ضرورت کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی اور اپنے تعلیمی نصاب میں علوم اسلامیہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ کیمیا، نباتات، ریاضی، علم ہندسہ وغیرہ کی شمولیت پر بھی زور دیا۔ لیکن ان کے نزدیک محض ان علوم کا حصول کسی قوم کے لیے مفید نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ ان علوم کو قومی اصلاح کا آلہ کار نہ بنایا جائے۔ انہوں نے اپنی تقریروں، تحریروں اور گفتگو سے ایک آگ سی لگا دی۔ مسلمانوں کے ماضی کا تذکرہ، اس کا موجودہ پستی سے مقابلہ مسلمانوں کے صحیح مقام کی یاد دہانی اور ان تمام باتوں کو خالص خطیبانہ جذباتی اتار چڑھاؤ اور مرعوب کن لب ولہجہ کے ساتھ ادا کرنا سید جمال الدین افغانی کا مخصوص اسلوب ہے۔ کچھ تو جمال الدین افغانی کی پر اثر شخصیت، ان کا علم و فضل اور کچھ اس عہد کی پکار کے ساتھ افغانی کی آواز کا ہم آہنگ ہونا یہ ان کی مقبولیت کے اہم اسباب تھے۔

جمال الدین افغانی نے چند ہی برسوں میں پورے مشرق وسطیٰ کو اپنا ہم نوا بنالیا اور ان کے خیالات کی گونج ایران، ترکی، مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں سنائی دینے لگی۔ انہوں نے ترکی میں انجمن معارف اور انجمن دانش کے علماء کو اپنے نقطہ نظر سے حالات کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی۔ تحسین آفندی صدر جامعہ قسطنطنیہ، حنیف پاشا وزیر تعلیمات، عالی پاشا، فواد پاشا سلیمان بلخی جیسے مدبرین ان سے متاثر ہوئے۔ مصر میں جامع ازہر کا با اثر حلقہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔ محمد بک مویلمیٰ،، ابراہیم بن مویلیٰ، ادیب اسحاق، شیخ ابراہیم الاعافی، عبداللہ پاشا، سید احمد پاشاہ، وہبی پاک شاہ اور شیخ محمد عبدہ جنہوں نے مصر کی جد وجہد آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ سب کے سب ان سے متاثر ہوئے۔ ایران میں شیخ علی قزوینی، مرزا آغا خان، مرزا محمد علی تہرانی، شیخ احمد کرمانی، جمال الدین واعظ اصفہانی، شیخ ہادی نجم آبادی، آقائے طباطبائی، امین الدولہ، مشیر الدولہ، مرزا نصر اللہ خان، محمد حسن امین الغرب، مرزا حسن علی، عبدالعظیم ہراتی، پرنس مالکم خاں وغیرہ جنہوں نے ناصر الدین شاہ قاچار کے استبداد کے خلاف قومی احساسات کے جذبے کو بیدار کیا۔ سب کے سب جمال الدین افغانی کے خیالات کے پروردہ تھے۔ یہ درست ہے کہ افغانی کا مشن ان کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا لیکن انہوں نے جس بیداری کا آغاز کیا تھا اس کا اثر تقریباً زندگی کے ہر پہلو میں محسوس کیا گیا اور ان کی موت کے بعد ایران، ترکی، مصر اور دوسرے عرب ملکوں میں جو قومی تحریکات پیدا ہوئیں اتحاد اسلامی اور عرب قومیت کے جو نعرے اٹھے ہیں ان سب کا رشتہ افغانی کی فکر سے منسلک نظر آتا ہے۔

> "نہ صرف اسلامی قومیت کا احساس دلانے میں انہوں نے پیش قدمی کی تھی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ جمال الدین افغانی کی پہلی ہستی تھی جس نے مغرب کے مقابلے میں ایشیا کی وحدت، ایشیائی وقار اور مشرق کے وجود پر اصرار کیا۔" (انور معظم، جمال الدین افغانی کا مقام، ص18)

جمال الدین افغانی کی تعلیمات کے اخلاقی پہلو کو ان کے شاگرد شیخ محمد عبدہ نے پروان چڑھایا اور مصر میں جدید اصلاحی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں انہوں نے ایک مجاہد وطن کی طرح 1882 کی اعرابی بغاوت میں حصہ لیا اور جلاوطن کر دیے گئے۔ جلاوطنی کے دوران میں وہ بیروت ہوتے ہوئے فرانس چلے گئے اور جمال الدین افغانی کی معیت میں پیرس سے مشہور اخبار "العروۃ الوثقیٰ" نکالنے لگے۔ اس اخبار کے ابھی چودہ پرچے ہی نکلے تھے کہ یورپ کے سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہندوستان، مصر، الجزائر، تیونس وغیرہ میں یہ ممنون الاشاعت قرار دے دیا گیا۔

پانچ سال کے بعد وہ واپس آئے اور اپنی مذہبی اور تعلیمی اصلاح کا سلسلہ شروع کر دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمان عالم پر آج بلا استثنا جو ادبار اور تنزل چھایا ہوا ہے وہ قومی زندگی کے ہر شاخ سے نمایاں ہو رہا ہے مگر اس کا سبب وحید مذہبی جہل کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ تعلیم قرآنی کی جس روح المقدس نے تیرہ سو برس ہوئے مردہ لاشوں کو زندہ کر دیا تھا، وہ آج بھی نیم جانوں کو طاقت وہ توانائی بخش سکتی ہیں اس لیے انہوں نے اپنی اصلاحی تحریک کی بنیاد دعوت قرانی قرار دی اور سر سید احمد خان کی طرح انہوں نے بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انگریزوں کا تعاون حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ مسلمانوں کے اندر صدیوں کے جمود اور تعطل کو ختم کرنا انہیں جدید مغربی تہذیب کی برکتوں سے فیض حاصل کرنے کے لیے آمادہ کرنا ان کی تحریک کے بھی محرکات تھے۔ لیکن اس تاریخی مشن سے ہم آہنگی کے باوجود بھی یہ کہنا صحیح ہو گا کہ سر سید احمد خان نے اسلام کو مغرب کے نقطہ نظر سے دیکھا اور محمد عبدہ نے مغرب کو اسلام کے نقطہ نظر سے دیکھا۔ سر سید کی تعلیمات میں معذرت خواہانہ انداز غلبہ زیادہ ہے۔ وہ اسلام کو عہد حاضر کی مغربی تہذیب کے مطابق ڈھالنے کی ہر ممکن یا نا ممکن کوشش کو روا رکھتے ہیں اس کے برعکس شیخ محمد عبدہ ایک مخصوص حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ وہ سلف کے مسلک پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلام کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں کہ ان کا اصلاحی مقصد نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔

دونوں تحریکات کا یہ فرق دراصل اس ماحول کی بنا پر تھا جس میں دونوں کی تربیت ہوئی تھی۔ بال جان نے صحیح لکھا ہے کہ محمد عبدہ کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی اس میں الہیاتی علوم سے گہری واقفیت ایک عالم کے لیے ضروری تھی مگر سر سید احمد خان اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو ایرانی تہذیب میں گھرا ہوا تھا جو مغل دربار سے وابستہ تھا۔ شیخ محمد عبدہ قوم کو پستی سے نکال کر عزت و وقار کی سطح پر لانا چاہتے تھے لیکن ان کا مطلب ہر گز یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کو مغربی تہذیب کا سطحی علم مہیا کیا جائے اور مغرب کی اندھی نقالی کی جائے۔

اس کے برخلاف سر سید احمد خان مسلمانوں کو کھانے پینے اور رہن سہن وغیرہ تمام معاشرتی معاملات میں حکمراں طبقے کے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے تاکہ ان کا احساس کمتری دور ہو جائے اور انگریز انہیں عزت کی نظر سے دیکھنے لگیں۔

عبدہ کے جملہ کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد جب ہم ایک مجموعی رائے قائم کرتے ہیں تو ان کا اصلاحی اور اخلاقی پہلو سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ عقل کی حاکمیت اور روشن خیالی کی تلقین کر کے مذہبی کٹرپن اور تنگ نظری پر شدید ضرب لگاتے ہیں مگر اسی کے ساتھ وہ اسلام کی ابتدائی عظمت کو بحال کرنے کی بھی سعی کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کے لیے قرون اولی کی طرف مراجعت کی تلقین کرتے ہیں۔ مگر قرون اولی کی طرف یہ مراجعت تنگ نظری اور کٹرپن سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ جدید تقاضوں اور عصر حاضر کے حقائق سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سولہویں صدی میں جو صنعتی اور سائنسی ترقی یورپ میں ہوئی وہ دراصل اسلام کی تعلیمات کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی جھلک پروٹسٹنٹ مذہب کے ماننے والوں میں دیکھی تھی۔

ان کی تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی علوم، لبرل خیالات اور سائنسی نقطہ نظر کی ترویج و اشاعت کے لیے زمین ہموار ہوئی۔ شیخ محمد عبدہ نے اپنے رسائل العروۃ الوثقیٰ اور الوقائع المصر دونوں کو اصلاح معاشرہ کا ذریعہ بنایا اور اپنے معاشرے کے رسم و رواج اور دیگر نقائص

پر کڑی تنقید کی۔ مصر کے مفتی اعظم کی حیثیت سے انہوں نے جو فتاوے جاری کیے ان کے اندر بھی اصلاحی جذبہ کار فرما تھا۔ انہوں نے اپنی تفسیر کو مسلم معاشرے کی اصلاح کے سلسلے میں ایک فعال وسیلہ بنایا۔ انہوں نے اپنے زمانے کے جھوٹے علماء وفقہاء اور صوفیاء کو بے نقاب کیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علمائے ازہر شیخ محمد عبدہ کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے اور انہیں کافر اور سلف کا دشمن قرار دے دیا گیا لیکن تمام روشن خیال طبقہ ان کے ساتھ ہو گیا اور ان کی پارٹی حرب الاصلاح کا ہمدرد بن گیا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"اس مصلح عظیم کو اپنے آخری وقت میں بھی سب سے زیادہ خوف اسی مصیبت کا تھا جو طربوش اور ہیٹ کی طرف سے نہیں بلکہ عمامہ و دستار کے پیچوں سے نکل کر تمام عالم اسلام پر چھائی ہوئی تھی۔"

اور جن کے خلاف انہوں نے اپنی ساری عمر جہاد کیا۔ یہ علمائے سو نہ صرف ان کی اصلاح پسندی کے دشمن تھے بلکہ ان کے جوتوں کی وضع اور بالوں کی تراش پر بھی معترض تھے وہ کہتے تھے:

"یہ کیا شیخ ہے جو فرانسیسی زبان میں باتیں کرتا ہے یورپ کا سفر کرتا ہے۔ علمائے فرنگ کی تحریروں کا ترجمہ کرتا ہے۔ ایسے فتاوے دیتا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہ دیے تھے۔۔ امدادی انجمنوں میں حصہ لیتا ہے۔ غرباء و مساکین کے لیے چندے جمع کرتا ہے۔ اگر یہ شخص اہل دین میں سے ہے تو اس کی جولانگاہ مسجد سے گھر تک ہونی چاہیے اگر وہ دنیادار لوگوں میں سے ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس میدان میں تنہا سب سے زیادہ مصروف عمل ہے۔"

(تاریخ استاذی العلام 3، ص368)

مولانا آزاد کی کمسنی نے شیخ جمال الدین کا آخری زمانہ پایا تھا اور وہ شیخ محمد عبدہ اور رشید رضا کی تعلیمات سے بھی خاطر خواہ متاثر تھے۔ مشرق وسطیٰ کے سفر میں ان لوگوں کے لائحہ عمل اور سیرت کا مطالعہ کرنے کے لیے کافی مواقع ملے تھے۔ کلکتہ میں بھی شیخ کا ایک منظم گروہ سرگرم عمل تھا اور عبدالغفور شہباز نے شیخ موصوف کی اجازت سے 1884 میں شیخ کے مقالوں کا اولین مجموعہ رین پریس کلکتہ سے شائع کیا تھا۔ چنانچہ مولانا آزاد نے اپنی راہ نمائی کی مشعل اسی آگ سے جلائی جو شیخ نے مشرق وسطی میں روشن کر رکھی تھی۔ احمد حسین خان بی اے کے ایک سوال کے جواب میں جو انہوں نے میلاد کی مجلسوں کے متعلق مولانا سے کیا تھا مولانا فرماتے ہیں۔

"میں جو ہمیشہ شیخ محمد عبدہ اور ان کے متبع طریقت سید رشید رضا کی تعریف کرتا ہوں اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بہ نسبت ہندوستان کے مصلحین جدید کے اس نقطے (تطبیق، عقل و نقل کے سلسلے میں قرآن و حدیث کے اصول و فوائد، علم و فن اور زبان سے واقفیت) کا خیال کا زیادہ خیال رکھا ہے۔ حالانکہ ضرورت ان کے سامنے وہی تھی جو یہاں درپیش ہے۔"

(ولادت نبوی، صفحہ 95)

اسی کے ساتھ مولانا آزاد کا ذہن معتزلہ کے نظریات کی طرف بھی مائل ہوا۔ چونکہ ان کا ظہور اور ان کے خیالات کی نشو و نما انہی

حالات اور زمانے میں ہوئی تھی جو سر سید اور ان کے رفقاء کو پیش آئے۔ اس لیے ان کا اعتراف و اعتقاد مولانا کے دل میں روز بروز بڑھتا گیا اور جس قدر ان کے اقوال و افکار مولانا کے مطالعے میں آئے معتزلہ کا مسلک مولانا کو پسندیدہ نظر آیا۔

4.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- انیسویں صدی کے آخر تک انگریز ہندوستان کے بڑے حصے پر قبضہ کر چکے تھے۔ برصغیر کے باشندوں کے ساتھ ان کا رویہ ہتک آمیز تھا اور بطور فاتح ان میں احساس برتری نمایاں تھا۔ لہٰذا ہندوستانیوں کے اندر انگریزوں سے نفرت بڑھتی گئی۔
- اس زمانے میں کئی رہنماؤں نے اپنے اپنے انداز میں اصلاحی تحریکیں چلائیں جن میں بنگال میں حاجی شریعت اللہ کی "فرائضی تحریک اور تیتو میر کی تحریکیں شامل ہیں۔
- 1757ء میں سراج الدولہ کو انگریزوں نے اپنی دیرینہ حکمت عملی "لڑاؤ اور حکومت کرو" کو بروئے کار لاتے ہوئے میر جعفر کو اپنے ساتھ ملا کر سراج الدولہ کو شکست دے دی۔ اس جنگ کی کامیابی سے کمپنی نے تجارت کے ساتھ ساتھ حکومت کی بنیاد بھی رکھ دی۔ جنگ پلاسی میں ہندوستانی عظمت کا ایک ستون گر گیا۔
- دوسرا اہم سیاسی واقعہ جس نے برصغیر کی سیاست پر دور رس اثرات مرتب کیے وہ ٹیپو سلطان کی شکست ہے۔ سلطان ٹیپو نے آخری دم تک انگریزوں کے جبر سے ہندوستان کو نجات دلانے کی پرزور کوشش کی۔
- اودھ کے بادشاہ نواب واجد علی شاہ کو بغیر کسی وجہ کے معزول کر دیا گیا۔ وہ انصاف کے لیے ایک عرصہ تک کلکتہ میں منتظر رہے ہیں۔ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر بھی لال قلعہ کی حد تک محدود تھے۔ رہی سہی کسر 1857 کی ناکام جنگ آزادی نے پوری کر دی۔
- انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اس لیے انگریزوں نے اس جنگ آزادی کا ذمہ دار بھی مسلمانوں کو قرار دیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں پر شدید ترین قسم کے تشدد کیے گئے اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا گیا۔
- 1857 کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد سر سید احمد خان نے تمام حالات کا بغور مطالعہ کیا اور مسلمانوں کو انگریزوں سے تصادم کا راستہ ترک کر کے مصالحت کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔
- مولانا ابوالکلام آزاد سر سید کے مذہبی اور ادبی افکار و خیالات سے متاثر ہوئے مگر سیاسی مسائل پر انہوں نے اپنا ایک الگ نقطہ نظر قائم کیا۔
- لارڈ کرزن نے 1905ء میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ بظاہر اس تقسیم کا مقصد بنگال کی انتظامی حکومت کا بوجھ ہلکا کرنا تھا لیکن پس پردہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کو ختم کرنے کی سازش تھی۔
- بنگال کی تقسیم سے مسلمانوں کے حالات میں بہتری کی امید جاگی تھی لیکن ہندوستانی عوام کی اکثریت کی مخالفت کے سبب اس تقسیم کو منسوخ کرنا پڑا۔

- 1906ء میں "مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے دو قومی نظریہ پیش کیا۔ مولانا آزاد نے مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کی شدت سے مخالفت کی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔
- فورٹ ولیم کالج انگریزوں کو ہندوستانی زبان اور معاشرت سے آگہی مہیا کرنے کا ادارہ تھا اس کے برعکس انگریزی تصورات اور علوم کی تربیت گاہ دلی کالج تھا۔ فورٹ ولیم کالج غیر ملکی نوواردوں کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا جبکہ دلی کالج کا مقصد ہندوستانی عوام کو جدید علوم سے آراستہ کرنا تھا۔
- علی گڑھ تحریک کے عروج کے زمانے میں مولانا آزاد کی پیدائش ہوئی۔ اردو ادب پر سرسید اور ان کے رفقائے کار کی اصلاحی تحریروں کا اثر واضح طور پر نمایاں تھا۔
- مولانا آزاد نے سرسید کا آخری دور بھی دیکھا۔ محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، الطاف حسین حالیؔ، محسن الملک، چراغ علی اور نذیر احمد وغیرہ اردو زبان وادب کی خدمت انجام دے رہے تھے۔
- مولانا آزاد کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا اور کسی ہوا کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ باوجود اس کے سرسید کے افکار وخیالات نے مولانا آزاد کو مذہبی اور ادبی سطح پر متاثر کیا۔
- عالمی سطح پر مولانا آزاد سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کے افکار و نظریات سے متاثر تھے۔
- سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں مسلم معاشرے کی مردہ رگوں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑائی اور اپنی ساری زندگی اسی مقصد کے حصول کے لیے وقف کر دی۔
- جمال الدین افغانی نے پورے مشرق وسطی کو اپنا ہم نوا بنالیا اور ان کے خیالات کی گونج ایران، ترکی، مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں سنائی دینے لگی۔ انہوں نے ترکی میں انجمن معارف اور انجمن دانش کے علماء کو اپنے نقطہ نظر سے حالات کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی۔
- تحسین آفندی صدر جامعہ قسطنطنیہ، حنیف پاشاوزیر تعلیمات، عالی پاشا، فواد پاشا سلیمان بلخی جیسے مدبرین ان سے متاثر ہوئے ہیں۔ مصر میں جامع اظہر کا بااثر حلقہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔ محمد بک مویلحیٰ، ابراہیم بن مویلحیٰ، ادیب اسحاق، شیخ ابراہیم الاعافی، عبداللہ پاشا، سید احمد پاشاہ، وہبی پاک شاہ اور شیخ محمد عبدہ جنہوں نے مصر کی جدوجہد آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ سب کے سب ان سے متاثر ہوئے۔
- ایران میں شیخ علی قزوینی، مرزا آغاخان، مرزا محمد علی تہرانی، شیخ احمد کرمانی، جمال الدین واعظ اصفہانی، شیخ ہادی نجم آبادی، آقائے طباطبائی، امین الدولہ، مشیر الدولہ، مرزا نصراللہ خان، محمد حسن امین الغرب، مرزا حسن علی، عبدالعظیم ہراتی، پرنس مالکم خاں وغیرہ جنہوں نے ناصر الدین شاہ قاچار کے استبداد کے خلاف قومی احساسات کے جذبے کو بیدار کیا۔ سب کے سب جمال الدین

افغانی کے خیالات کے پروردہ تھے۔

4.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
مدمقابل	:	آمنے سامنے، حریف، دشمن
دقیق	:	باریک، مشکل
کاشت کاری	:	کھیتی باڑی
منسوخ کرنا	:	ختم کرنا
عدم تعاون	:	کسی طرح کی مدد نہ کرنا
منفعت بخش	:	فائدہ پہنچانے والا
رفاہ عامہ	:	عام لوگوں کی بھلائی
انحطاط	:	پستی، تنزلی
دستبرد	:	تباہی، غارت گری، لوٹ پاٹ

4.7 نمونہ امتحانی سوالات

4.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. حاجی شریعت اللہ نے کس نام سے تحریک شروع کی؟
2. سراج الدولہ نے انگریزوں سے کس سن میں جنگ کی؟
3. ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کب واقع ہوئی؟
4. لارڈ کرزن نے بنگال کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا؟
5. مسلم لیگ کا قیام کب عمل میں آیا؟
6. ہندوستان میں خلافت تحریک کا آغاز کب ہوا؟
7. سرسید کے رفقائے کار میں سے کسی ایک کا نام بتایئے؟
8. مسدس مدوجزر اسلام کس کی تصنیف ہے؟
9. انجمن پنجاب کا پورا نام کیا تھا؟
10. سید جمال الدین افغانی کے شاگرد کا نام کیا تھا؟

4.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کے عہد کے ادبی ماحول کو اختصار سے لکھیے۔
2. شیخ محمد عبدہ کی خدمات کو بیان کیجیے۔
3. مولانا آزاد کے عہد میں عالم اسلام میں اٹھنے والی تحریکوں کا اجمالی خاکہ پیش کیجیے۔
4. تقسیم بنگال کی وجوہات پر مختصر نوٹ لکھیے۔
5. 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کی وجوہات بیان کیجیے۔

4.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کے عہد کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیجیے۔
2. مولانا آزاد کی زندگی پر سرسید تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ مفصل بیان کیجیے۔
3. سید جمال الدین افغانی کے نظریات کو قلمبند کیجیے۔

4.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. مولانا ابوالکلام آزاد، شخصیت، سیاست اور پیغام	رشید الدین خاں
2. ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت	رشید الدین خاں
3. مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے	خلیق انجم
4. کچھ ابوالکلام کے بارے میں	مالک رام
5. مولانا آزاد کے مراسلات کا کیلنڈر	پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین
6. مولانا ابوالکلام آزاد، فکر و فن	ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد
7. مولانا آزاد کے مراسلات کا کیلنڈر	سید محمد عزیز الدین حسین

بلاک II :مولانا آزاد کے افکار

اکائی 5: مولانا آزاد کے سیاسی تصورات

اکائی کے اجزا

5.0		تمہید
5.1		مقاصد
5.2		مولانا آزاد کے عہد کا سیاسی منظر نامہ
5.3		مولانا آزاد کے سیاسی تصورات
	5.3.1	مولانا آزاد کی سیاسی زندگی
	5.3.2	تصور سیاست اور مذہب
	5.3.3	تصور قوم اور متحدہ قومیت
	5.3.4	تصور سیکولرازم
	5.3.5	تصور آزادی
	5.3.6	تصور جمہوریت
5.4		اکتسابی نتائج
5.5		کلیدی الفاظ
5.6		نمونہ امتحانی سوالات
	5.6.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	5.6.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	5.6.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
5.7		تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

مولانا ابوالکلام آزاد مختلف النوع شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت ایک اچھے ادیب، ممتاز عالم، عمدہ صحافی اور عظیم رہنما تھے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں مولانا آزاد نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ بیسویں صدی کے نصف اول کے افق پر جو سیاسی شخصیتیں ابھر کر سامنے آئیں ان میں مولانا آزاد نہایت ممتاز مقام پر نظر آتے ہیں۔ مولانا آزاد ایک ممتاز سیاست داں ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ پایہ کے سیاسی مفکر بھی تھے۔ انہوں نے تمام مجاہدین آزادی سے فیضان حاصل کیا تھا، جن کی جھلک ہمیں ان کے تمام سیاسی تصورات میں صاف طور سے نظر آتی ہیں۔ اس اکائی میں ہم مولانا آزاد کے انہیں سیاسی تصورات کا مطالعہ کریں گے۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

- مولانا آزاد کے عہد کا سیاسی منظر نامہ بیان کر سکیں۔
- مولانا آزاد کی سیاسی زندگی سے واقف ہو سکیں۔
- مولانا آزاد کے تصور سیاست اور مذہب کو سمجھ سکیں۔
- مولانا آزاد کے تصور قوم اور متحدہ قومیت کو بیان کر سکیں۔
- مولانا آزاد کے تصور سیکولرازم کو سمجھ سکیں۔
- مولانا آزاد کے تصور آزادی اور تصور جمہوریت کو بیان کر سکیں۔

5.2 مولانا آزاد کے عہد کا سیاسی منظر نامہ

مولانا ابوالکلام آزاد جس وقت سیاست میں قدم رکھ رہے تھے وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا ایک عہد ساز دور تھا۔ اس وقت ہندوستان میں ایک نئے اور جمہوری قومی تشخص کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ اس عہد میں ہندوستان کی کئی اہم شخصیتیں تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ ان عظیم شخصیتوں میں راجہ رام موہن رائے، سرسید احمد خاں، دادا بھائی نوروجی، سوامی وویکانند، گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگا دھر تلک، موہن داس کرم چند گاندھی، بی۔ آر۔ امبیڈکر، جواہر لال نہرو وغیرہ شامل تھے۔ یہ ایسی ایسی شخصیتیں تھیں، جنہوں نے بے لوث ہو کر اپنا تن، من، دھن سب کچھ قوم پر نچھاور کر دیا تھا۔

اس عہد میں قومی قیادت کے مختشم گروہ میں نہ صرف سیاسی رہنما پیش پیش رہے بلکہ دیگر صاحب فکر و نظر بھی شامل تھے، جن میں ادبا و شعرا، انشا پرداز و صحافی، معالج و فنکار، ہنر مند و ہنر پیشہ، وید اور پنڈت، شیخ و برہمن غرض کہ قوم کے مختلف طبقے آزادی کی جستجو میں ہم قدم ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔

اس عہد میں کئی اہم تاریخی شخصیتیں ایسی ہیں، جن کے نام مخصوص تحریکوں، انقلابوں، سماجی تبدیلیوں، نئی قدروں اور عہد

سازیوں کے ساتھ منسلک اور مربوط ہیں۔اس عہد کی جن شخصیتوں میں جنگ آزادی اور تحریک قومی کے ساتھ جو نام جزو لاینفک کا مقام رکھتے ہیں، ان میں مولانا آزاد کا نام سر فہرست ہے۔ ان کا کردار سیاسی اعتبار سے تو تھا ہی اس کے علاوہ اخلاقی اور علمی اعتبار سے بھی تھا۔ مولانا آزاد ان نادر شخصیتوں میں سے تھے جن کا دامن کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل تھا۔ رشید الدین خان اس تعلق سے لکھتے ہیں:

"تحریک آزادی میں مشاہیر اپنے ایک ایک وصف اور صلاحیت کے اعتبار سے ممتاز تھے۔ کوئی سیاست میں، کوئی مذہبی امور میں، کوئی سماجی کارکردگی میں، کوئی اصلاحی مشاغل میں، کوئی انشا پردازی اور شاعری میں، کوئی فن کاری اور ہنرمندی میں، کوئی صحافت میں، کوئی خطابت میں، کوئی بغاوت میں، کوئی مروت میں، کوئی فکر وفلسفہ میں، کوئی عمل و قربانی میں، مگر مولانا آزاد کی جامع شخصیت میں اتنی صلاحیتیں مرکوز ہو گئی تھیں کہ جیسے انہوں نے ایک ہی زندگی میں بہت سی زندگیوں کو سمیٹ لیا ہو۔"

(رشید الدین خان، مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت، سیاست، پیغام، این سی پی یو ایل، ص 15)

مولانا آزاد کا تعلق جس خاندان سے تھا، اس خاندان کے بزرگوں میں حضرت جمال الدین شیخ بہلول دہلوی بھی تھے۔ بہلول دہلوی نے مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے "دین الٰہی" کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ بہلول کے صاحب زادے شیخ محمد بھی جہانگیر کی حکم عدولی کی پاداش میں قید و بند کی صوبتیں اٹھائی۔ مطلب یہ کہ مولانا آزاد کا خاندان ہمیشہ ہی سے حق و صداقت کا علمبردار رہا ہے اور ظلم و جبر کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا رہا ہے۔ یہی مزاج مولانا کا بھی رہا ہے اور انہوں نے اپنے عہد میں ان سامراجی طاقتوں کے خلاف اپنی آواز بلند کی جو ملک کی قومیت اور سالمیت کو نقصان پہنچا رہے تھے۔

5.3 مولانا آزاد کے سیاسی تصورات

مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی تصورات ان کے مختلف علمی، ادبی اور صحافتی کارناموں میں موجود ہیں، جو مولانا آزاد کی تقاریر، خطبات، مضامین، خطوط اور صحافتی اداریے پر مشتمل ہیں۔ ذیل میں ان کے تمام سیاسی تصورات پر علاحدہ علاحدہ گفتگو کی گئی ہے۔

5.3.1 مولانا آزاد کی سیاسی زندگی:

مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1. پہلا دور 1906 سے 1915 تک
2. دوسرا دور 1920 سے 1923 تک
3. تیسرا دور 1923 سے 1958 تک

مولانا آزاد کی حیات سیاسی کا پہلا دور 1906 سے 1915 پر مشتمل ہے۔ اس وقت ان کی عمر 18 سے 28 سال کی تھی۔ اس دور میں

مولانا بحیثیت صحافی، مدیر، انشاپرداز اور خطیب کے طور پر ابھرتے ہیں۔ مولانا آزاد نے پندرہ سال کی عمر ہی میں اپنا پہلا رسالہ "لسان الصدق" جاری کیا تھا، جس میں اعلیٰ پائے کے علمی، معلوماتی اور اصلاحی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان مضامین کی وجہ سے اس وقت کے مشاہیر مولانا وحید الدین سلیم، مولانا حالی اور شبلی وغیرہ مولانا آزاد سے غائبانہ طور پر متعارف ہو چکے تھے۔ 1904 میں جب مولانا آزاد انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں لاہور گئے تو وہاں پر ان مشاہیر سے ملاقاتیں بھی ہوئیں اور وہ لوگ مولانا آزاد کے افکار و خیالات سے بہت متاثر بھی ہوئے۔

مولانا آزاد کی حیات سیاسی کے پہلے دور کے واضح تصورات مشہور زمانہ اخبار "الہلال" میں ملتے ہیں۔ "الہلال" کا پہلا شمارہ 12 جولائی 1912 کو جاری ہوا اور اشاعت کے کچھ ہی ہفتوں میں اس کی تعداد گیارہ ہزار سے تجاوز کر گئی۔ الہلال کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے انگریز حکومت کو اس بات کا اندیشہ ہونے لگا کہ یہ مسلمانوں کے اندر ایک شعور پیدا کر رہا ہے، جو ان کو بغاوت کی طرف لے جا سکتا ہے، لہٰذا انہوں نے الہلال پر پابندی لگا دی اور یہ اخبار 18 نومبر 1914 کو بند ہو گیا۔ الہلال کے بند ہونے کے محض ایک سال بعد یعنی 12 نومبر 1915 کو مولانا آزاد نے ایک دوسرا جریدہ "البلاغ" کے نام سے جاری کیا، جس میں انہوں نے اپنے سیاسی تصورات کو آگے بڑھایا۔ اس اخبار میں مولانا خالص اسلامی سیاست کی تبلیغ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ اخبار نامساعد حالت کی وجہ سے پانچ مہینے بہت مشکل سے چلا اور 17 شمارے کے بعد 3 اپریل 1916 کو بند ہو گیا۔ اس طرح مولانا آزاد کی سیاست کا پہلا دور اختتام کو پہنچا۔

مولانا آزاد کی سیاست کے پہلے دور کے بعد دوسرے دور کے شروع ہونے میں چار سال (1916-1919) کا وقفہ ہے۔ اس وقفے میں مولانا آزاد رانچی میں بحالت حراست میں رہے۔

مولانا آزاد کی سیاست کا دوسرا دور 1920 سے 1923 کو محیط ہے۔ اس وقت ان کی عمر 32 سے 35 برس کی تھی۔ اس عہد میں مولانا آزاد ہندوستان کی سیاست میں بھرپور انداز میں شامل ہوئے اور وہ تحریک خلافت اور ترک موالات کے رہنما کی حیثیت سے ابھرے۔ اسی دور میں مولانا آزاد کی ملاقات مہاتما گاندھی سے ہوئی۔ گاندھی جی سے تفصیلی تبادلہ خیال کے بعد مولانا آزاد کے سیاسی نظریات میں وسعت پیدا ہوئی اور وہ مسلم حب الوطنی کے دائرے سے آگے بڑھ کر متحدہ ہندوستانی قومیت کے وسیع میدان میں داخل ہوئے۔ مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کے یہ تین سال بہت اہم تھے۔ اس دور میں انہوں نے تحریک خلافت کی قیادت کی۔ اس کے علاوہ مولانا نے ہندوستان کی سیاست اور سیاسی شعور کی بالیدگی کو حاصل کیا۔ ہندوستان کی سیاست میں خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کی عوامی سیاست میں تحریک خلافت نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کا تیسرا دور 1923 سے لے کر 1958 تک یعنی ان کی عمر کے 35 سال سے ان کی وفات تک ہے۔ اس عہد میں مولانا آزاد متحدہ ہندوستانی قومیت کے علمبردار اور قومی قیادت کے صف اول کے رہنماؤں میں شامل تھے۔

اس طرح سے دیکھا جائے تو مولانا آزاد کی زندگی کے دو برابر 35 سالہ دور ہیں۔ پہلے 35 سال میں انہوں نے زندگی کے مختلف النوع کاموں میں مشغول رہے، جیسے صحافت، ادارت، شاعری، انشاپردازی وغیرہ۔ اس کے علاوہ تبلیغ اسلام، تفسیر قرآن، مسلمانوں کی

سماجی ترمیم وترقی اور اسلامی حب الوطنی کی سیاست بھی کرتے رہے۔

مولانا آزاد کی زندگی کا دوسرا نصف حصہ جو ان کی عمر کے 35 سال میں شروع ہوا۔ اس عہد میں انہوں نے اپنا پورا کا پورا وقت ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ قومیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں لگا دیا۔ یعنی انہوں نے اپنی زندگی کا دوسرا بڑا حصہ ہندوستانی قومیت کے ملے جلے ورثے کی حفاظت اور نگہداشت اور قوم کے مزاج میں جمہوریت، سیکولرزم اور سیاسی قدروں کو پروان چڑھانے میں صرف کر دیا۔ اس طرح سے مولانا آزاد کی سیاسی زندگی ہندوستانی مسلمان اور ہندوستان کی قوم وملت کی فلاح وبہبود کی لیے پوری طرح سے وقف تھی۔ مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کے مختلف ادوار کے بارے میں رشید الدین خان لکھتے ہیں:

> "مولانا آزاد کی انوکھی زندگی میں مختلف راستوں پر چلنے کا اتفاق ہوا۔ 1915 تک علاحدہ مسلم حب الوطنی کے راستہ پر، پھر 1920 سے 1923 تک علاحدہ مسلم حب الوطنی اور قومی سیاست میں اشتراک کی ڈگر پر، پھر 1923 کے بعد ایک نئی جسارت اور سیاسی وجدان سے وہ متحدہ قومیت کی شاہراہ پر گامزن ہو گئے۔ مولانا پہلی منزل سے بتدریج دوسری منزل اور تیسری منزل تک یوں چلے جیسے منزل مقصود کی تلاش میں یہی ایک واضح، واجب اور معقول طریق سفر تھا۔"

(رشید الدین خان، مولانا ابو الکلام آزاد: شخصیت، سیاست، پیغام، این سی پی یو ایل، ص 22)

5.3.2 تصور سیاست اور مذہب:

مولانا آزاد سیاست میں اخلاقیات کا ہونا ضروری تصور کرتے تھے۔ وہ ایک عظیم دانشور تھے اور انہیں اسلامی تاریخ، منطق اور فلسفے پر زبردست عبور حاصل تھا، لیکن انہوں نے کبھی مذہب اور سیاست میں تفریق نہیں کی۔ ان کی یہی خصوصیت انہیں دوسرے مفکرین سے الگ کرتی ہے اور وہ عام سیاست دانوں سے بلند وبالا نظر آتے ہیں۔ وہ قانون اسلام اور جمہوری حکومت کو الگ تصور نہیں کرتے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کہتے ہیں:

1. دین اسلام ایک جامع اور مکمل نظام حیات ہے۔
2. اس نظام میں دین ودنیا کی تفریق نہیں۔
3. اسلامی نظریہ سیاست مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے لیے کافی ہے۔
4. اس نظریے کے تقاضے ہیں: (الف) آزادی، (ب) جمہوریت، (ج) پر امن جدوجہد۔

اس کے علاوہ مولانا آزاد اپنے سیاسی نقطہ نظر پر روشنی ڈالتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

> "ہم نے تو اپنے پولٹیکل خیالات بھی مذہب سے سیکھے ہیں... اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی توحیدی تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی

دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالم گیر مذہب نہ ہو سکتا....."

(منشی مشتاق احمد، مضامین مولانا ابو الکلام آزاد، حصہ چہارم، ص18)

درج بالا عبارت سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد سیاست کو مذہب سے الگ تصور نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کی ہر سرگرمی کو مذہب کی کسوٹی پر پرکھا۔ ان کا نظریہ سیاست مذہبی کسوٹی پر کسا ہوا تھا، لہٰذا ان کے سیاسی طرز فکر کو مذہب سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہندوستان کے عصر حاضر کے سیاسی مسائل کا حل تلاش کیا اور اسلام کی روح کو عصر حاضر سے ملانے کی کوشش کی۔ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی نے جب "الہلال" پر اعتراض کیا کہ اس میں مذہب اور سیاست کی حدیں مل گئی ہیں تو مولانا آزاد نے انہیں جواب میں لکھا کہ:

"بے شک وہ تعلیم اور پالی ٹکس، جس پر اب تک معلمین ملت عامل رہے ہیں، مذہب کے ساتھ ایک دائرے میں نہیں آسکتے۔ کیوں کہ عالمی اور توحید، حق اور باطل، کفر اور اسلام کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہوئے۔ لیکن شاید مولانا کی نظر اس پر نہیں گئی کہ "الہلال" جس تعلیم اور پالی ٹکس کی طرف بلاتا ہے وہ تو یکسر قرآن ہی سے ماخوذ ہے اور جب دعوت قرآنی اس کا مقصد ہے تو لازمی طور پر وہ بھی اس کے دائرہ بحث میں ہے اور جب تک دنیا باقی ہے، ہمیشہ رہے گا۔"

(عبید اللہ، سہ ماہی فکر و نظر، آزاد نمبر، اگست 1989، ص147)

مولانا آزاد کا سیاسی نقطہ نظر سر تا سر اسلامی تعلیمات پر مبنی تھا۔ وہ زندگی کے ہر شعبے پر زندگی کا اطلاق کرتے تھے اور اسی روشنی میں اپنے سیاسی طریقہ کار کا تعین کرتے تھے۔ وہ مذہب اسلام کو پولی ٹکیل تعلیم کا ارفع ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دوسروں کی سیاسی تعلیمات پر عمل کرنا غیر اسلامی ہے، جسے اسلام کسی بھی صورت میں روا نہیں رکھتا۔

مولانا آزاد اخوت اور انسان کے عالم گیری اصولوں کے قائل تھے، جو دراصل اسلام ہی کا عنصر ہے۔ وہ فرقہ وارانہ اتحاد کو محض سیاسی ضرورت ہی نہیں بلکہ مستقل انسانی ضرورت اور انسانیت کی اخلاقی بنیاد تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قومی اتحاد کے بغیر ہندوستان کی تعمیر و ترقی ممکن نہیں ہے۔ ان کا متحدہ قومیت کا تصور محدود نہیں تھا بلکہ اس میں آفاقیت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ وہ عالمی انسانیت کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک دیگر قوموں کا محض نسل و خاندان، رنگ و زبان اور زمین کی جغرافیائی تقسیم کی وجہ سے انسانی رشتہ ختم نہیں ہوتا۔ ان کا اصرار تھا کہ مسلمان اسلام کی اصل روح کو سمجھیں اور احکام شرعیہ پر کاربند رہتے ہوئے ہندو بھائیوں سے اتحاد و اتفاق قائم کریں اور ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔ ان کے نزدیک یہ فعل عین مذہبی تھا کیوں کہ اسلام انسانیت اور آزادی کا درس دیتا ہے۔

مولانا آزاد نے قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر اپنے سیاسی اصول متعین کیے اور انہی اصولوں کی روشنی میں انہوں نے متحدہ قومیت، سیکولرازم اور جمہوریت کے تصور کو واضح کیا۔ ملک و قوم کی بیداری کے لیے انہوں نے یہی راہ اپنائی اور مذہب و سیاست کے حسین امتزاج کی مثال دنیا کے سامنے پیش کی۔ مولانا آزاد کی یہی خصوصیت انہیں دوسرے مسلمان لیڈروں میں ممتاز کر دیتی ہے کہ انہوں نے خالص اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ قومیت کے تصور کو اپنایا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا آزاد نے سیاست اور مذہب کو کبھی الگ نہیں کیا۔

5.3.3 تصور قوم اور متحدہ قومیت:

تصور قوم یا متحدہ قومیت ایک ایسا تصور ہے، جو یہ ثابت کرتا ہے کہ ہندوستانی قوم مختلف ثقافتوں، ذاتوں، برادریوں اور مسلکوں کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ ہندوستان میں محض مذہب کے ذریعہ قوم پرستی کی تعریف نہیں کی جاسکتی ہے۔ ہندوستانی شہری اپنی مخصوص مذہبی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے وہ ایک متحدہ ہندوستانی قوم کے رکن ہیں۔ مولانا آزاد نے خالص اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قوم پرستی اور متحدہ قومیت کے تصور کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جب مولانا ابوالکلام آزاد نے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھا تب بھی ان کے ذہن پر مذہبیت کا رنگ غالب تھا۔ چناں چہ اس میدان میں بھی انہوں نے اسی نظریے کی تبلیغ کی کہ مذہب اتحاد سکھاتا ہے اور نااتفاقی سے قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ قومی یکجہتی کے انہی تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے صحافت کو اپنایا۔ "الہلال" کے ذریعے انہوں نے ملک و قوم کی تعمیری خدمات انجام دیں اور ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی پھرپور جدوجہد کی۔ اپنے قول و فعل سے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے قومی یکجہتی کے تصور کو عام کیا۔ اپنے ایک خطبے میں مولانا آزاد کہتے ہیں کہ:

> "درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ اگرچہ رنگ و زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے، لیکن اس کو وہ کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد قرار نہیں دیتا اور انسان کے تمام دینوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے اور وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے، پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔" (خطبات آزاد، مرتبہ مالک رام، ص16)

اس اقتباس سے مولانا آزاد کے متحدہ قومیت کے تصور کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ خالص قرآنی تعلیمات کی روشنی میں مذہب اسلام کا سرا عالم انسانیت سے ملاتے ہیں اور انہی اخلاقیات کی حدوں کو آگے بڑھا کر سیاست سے جوڑ دیتے ہیں۔ ان کا متحدہ قومیت کا تصور محدود نہیں تھا۔ وہ رنگ و زبان، وطن و مقام اور جنس و نسل کی تفریق کے سخت متنفر تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قرآن انسانی تفریق و تقسیم کی حد

بندی نہیں کرتا۔ یہ حدود تو خود انسانوں نے قائم کیے ہیں، لہٰذا ان حدود کو توڑ کر مسلمانوں کو دوسری قوموں کے ساتھ محبت، اخوت اور بھائی چارگی سے پیش آنا چاہیے۔ مولانا آزاد اپنے وطن سے حد درجہ محبت کرتے تھے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اگر تمام عالم ہمارا وطن ہے اور اس لیے محترم ہے تو وہ خاک تو بدرجہ اولیٰ ہمارے احترامِ محبت کی مستحق ہے، جس کی آب و ہوا میں ہم صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ اگر تمام فرزندانِ انسانیت ہمارے بھائی ہیں، تو وہ انسان تو بدرجہ اولیٰ ہمارے احترامِ اخوت کے مستحق ہیں جو اس خاک کے فرزند اور مثل ہمارے اس کی سطح پر بہنے والے پانی کے پینے اور اسی فضاء میں محبوب کو پیار کرنے والے ہیں۔" (منشی مشتاق احمد، مضامین مولانا ابوالکلام آزاد، حصہ چہارم، ص57)

مولانا آزاد ابتدا ہی سے ہندوستان کی آزادی کے علمبردار تھے وہ یہ بھی سمجھ چکے تھے کہ جدوجہد آزادی میں ہندوستان کے تمام فرقوں کی شمولیت ضروری ہے۔ چناں چہ ہندوستان کے تمام فرقوں میں باہمی اتحاد پیدا کرنے کے لیے انہوں نے انتھک کوششیں کیں۔ مسلمانوں کی بے حسی اور خام خیالی کو دور کر کے انہیں ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہنے پر زور دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مولانا آزاد نے اپنے مسلمان ہونے پر فخر محسوس کیا اور تمام مسلمانوں کو متحد ہونے کا مشورہ بھی دیا۔ ایک خطبے میں مولانا آزاد کہتے ہیں کہ:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برسوں کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے، لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

(خطباتِ آزاد، ص297-298)

مولانا آزاد کے اس بیان کی روشنی میں اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ قومیت "قوم پرستی" نہیں ہے بلکہ انسانوں کے اجتماعی رشتے کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ یہ کوئی مستقل حالت نہیں ہے۔ اسلام آفاقیت کا درس دیتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر معاملے میں توازن اور اعتدال کا راستہ اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔ چناں چہ عصر حاضر میں برطانوی سامراج سے نپٹنے کے لیے متحدہ قومیت اور ملک گیر جدوجہد کی

ضرورت ہے۔ نئے حالات میں نئے آفاقی نظریے کی ضرورت ہو گی۔ اس طرح انہوں نے قومیت کا سرا انسانی یکجہتی سے ملا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ عصر حاضر میں ملک کی آزادی سے انسانیت کی نئی اور بہتر تعمیر و تشکیل ہو سکتی ہے۔ مولانا آزاد متحدہ قومیت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بہ خود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قسمت کی اس پر مہر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور نا قابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علاحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا دے سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔" (خطباتِ آزاد، ص300)

مولانا آزاد متحدہ قومیت کے ذریعے جمہوریت اور مساوات انسانی کا حل تلاش کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے پورے اعتماد کے ساتھ متحدہ قومیت پر زیادہ زور دے رہے تھے۔ ملک میں پھیلے ہوئے انتشار کو مد نظر رکھ کر انہوں نے مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو للکارا۔ ماضی کی تاریخ کے اوراق پلٹ کر انہوں نے مسلمانوں کو ان کے اسلاف کے کارنامے یاد دلائے۔ متحدہ قومیت کے متعلق ان کا خیال تھا کہ ایسے سانچے قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں، ایسے سانچے بنائے نہیں جاتے۔ چناں چہ مسلمانوں کو چاہیے کہ ہندوؤں کے ساتھ باہمی اتحاد قائم کر کے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ مولانا آزاد قومی یکجہتی اور متحدہ قومیت کو ملک کی آزادی کے ساتھ عالم انسانیت کی فلاح کے لیے بھی ناگزیر سمجھتے تھے۔ انہوں نے محض ہندوستان کے سیاسی حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہی قومی یکجہتی اور متحدہ قومیت پر زور نہیں دیا تھا بلکہ وہ اسے مسلمانوں کا مذہبی فریضہ بھی سمجھتے تھے۔

5.3.4 تصور سیکولرازم:

سیکولرازم سرکاری اداروں اور ریاستی نمائندوں کو مذہبی اداروں اور مذہبی شخصیات سے جدا کرنے کا نام ہے۔ سیکولرازم کا ایک مظہر یہ ہے کہ یہ مذہبی حکومت یا مذہبی تعلیمات سے آزاد رہنے کے حق پر زور دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک ریاست میں غیر متعصبانہ مذہبی ذاتی و شخصی نظریات رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ سیکولرازم کا ایک اظہار یہ نقطہ نظر بھی ہے کہ اجتماعی فکر اور فیصلوں میں خصوصاً سیاسی معاملات میں مذہبی عقائد و نظریات کو دخل نہیں۔ مولانا آزاد کے سیاسی نظریے کا ایک پہلو سیکولرازم اور قومی اتحاد بھی تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور یہاں پر انصاف کے لیے کوئی خاص مذہب کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> "انصاف کا نہ تو کوئی وطن ہے، نہ کوئی قومیت۔ اس کی قومیت اگر ہو سکتی ہے تو وہ صرف بالاتر اور عالمگیر انسانیت ہے۔" (خطباتِ آزاد، ص164)

مولانا آزاد ہندوستانی قومیت اور سیکولرازم کی بنیاد پر ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار سمجھے جاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی

مسلمانوں کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ ہندوستانی قومیت اور سیکولرازم کو قبول کرلیں۔ ان کا کہنا تھا کہ:

"اگر ہمارے پیش نظر عالمی اتحاد کا حصول ہے اور اس چیز پر متفق ہیں کہ ایسے اتحاد کے بغیر انسان کا مستقبل تاریک رہتا ہے تو ہماری تمام تر کوششیں آفاقی شہرت کی خاطر نئی پودھ کی تعلیم پر مرکوز ہونی چاہیے۔ (مولانا آزاد کی تقریریں، ص218)

مولانا آزاد کے تصور سیکولرازم کی شدید خواہش نے مسلمانوں میں اتحاد قائم کردیا۔ انہوں نے اپنی سیاسی صلاحیتوں کی بناپر سیکولر قومیت کے تصور کو مذہبی بنیادوں سے الگ کردیا۔ مولانا آزاد جس مذہبی سیاست کے حامی تھے اسی کو سیکولرازم کے لیے قربان کردیا اور سیکولرازم کو انسانی ترقی کے لیے ضروری قرار دینے لگے۔ وہ اپنی ایک تقریر میں کہتے ہیں:

"انیسویں صدی میں جو قومیت، حریت اور حریت پسندی کا ایک مضبوط قلعہ تھی، آج انسانی ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ اس کے اثرات اتنے قوی ہیں کہ ہم عالمی اتحاد پر کامل یقین و اعتماد کے باوجود جب تک قومیت کی قیود سے آزاد اور اس کی سطح سے بلند وبالا نہیں ہوں گے انسان کا مستقبل تاریک رہے گا۔" (مولانا آزاد کی تقریریں، ص222)

سیکولر قومیت کی خدمت اور حمایت میں مولانا آزاد کس حد تک گئے اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں سے کہا کہ وہ یاد رکھیں کہ ہندو گائے کے ذبیحہ اور اس کے گوشت کے استعمال سے سخت رنجیدہ ہوتے ہیں اور خاص طور پر عیدالاضحیٰ کے موقعے پر گائے کی قربانی ان کی ناراضگی کا خاص سبب ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ گائے کی قربانی کے ذبیحہ خواہ وہ "قربانی" کے مقدس فریضے کے لیے ہی کیوں نہ ہو بہر حال اسلام کی بنیادی تعلیمات کا حصہ نہیں۔ اسی طرح ابوالکلام نے اپنے ہندو رفقا کو یقین دلایا کہ کئی ایسے مسلم گزرے ہیں، جو نہ صرف یہ کہ خود کبھی گائے کا گوشت نہیں کھایا بلکہ اپنے دوستوں کو بھی اس کے کم از کم استعمال کا مشورہ دیا۔ دراصل مولانا اس بات کی امید رکھتے تھے کہ مستقبل قریب میں ہندو اور مسلمان اس طرح کے متنازعہ رسوم اور مسائل پر قابو پالیں گے جو دونوں کو باہم جدا رکھتے ہیں۔

5.3.5 تصورآزادی:

انسانی مساوات کا مشہور مبلغ روسو(Rousseau) کہتا ہے کہ "Man is born free but is everywhere in chains." یعنی انسان آزاد پیدا ہوا ہے، لیکن ہر طرف وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مولانا آزاد بھی اسی خیال کے حامی تھے۔ انہوں نے اس تعلق سے ایک خطبے میں کہا تھا کہ:

"میرا عقیدہ ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور ہر قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی (خوش نما) نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں، وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے

خلاف ہے۔پس وہ موجودہ گورنمنٹ کو جائز تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض
سمجھتاہوں کہ اس کی محکومی کو نجات دلاؤں۔"(مولانا ابوالکلام آزاد، قول فیصل، ص102)

مولانا آزاد، تصورآزادی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ آزادی اور اتحاد کی تحریک کے پر جوش اور سر گرم داعی تھے۔اس راہ میں انہوں نے دوست ودشمن سبھی کے طعنے سنے، ظلم وستم کانشانہ بنے، قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں اور اپنے مال ومتاع کی قربانی بھی دی، لیکن وہ کبھی آزادی اور حریت کی آواز بلند کرنے اور تصور آزادی کو عام کرنے سے باز نہ آئے۔ وہ مینار پر کھڑے ہو کر بھی یہی نعرہ بلند کرتے اور صدائے حق کو دنیا کو سناتے رہے۔ انگریزوں کا جبر وتشدد اور ان کی چیرہ دستیاں بھی ان کے عزم وارادے کو تبدیل نہ کر سکیں۔

مولانا آزاد ابتدا ہی سے ہندوستان کی آزادی کے علم بردار رہے۔ان کے سیاسی سفر کا آغاز 1912 میں ہوا، اسی وقت انہوں نے کلکتہ سے "الہلال" جاری کیا۔ اسی الہلال کے ذریعے مولانا آزاد نے مسلمانوں کو آزادی وحریت کا درس دیا۔ وہ عزم واستقلال کے پہاڑ تھے۔ اسی لیے ابتدا میں مولانا آزاد نے جو راستہ اختیار کیا اس پر تمام عمر گامزن رہے۔حالاں کہ اس طویل مدت میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے اور ان کی وجہ سے اچھے اچھے لوگوں کے قدم ڈگمگا گئے اور خود مولانا آزاد کے رفقائے کار نے فکر وعمل کی نئی راہیں تلاش کر لیں، مگر انہوں نے اپنے اختیار کیے ہوئے راستے سے منہ نہ موڑا۔ بالآخر 1947 کے بعد کے اوقات نے مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت، ہوش مندی، فہم وفراست اور اصابت رائے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

مولانا آزاد نے آزادی کا صور پھونک کر ہندوستان کے مسلمانوں کو حق کے غلبے کا یقین اور آزادی کے متوالوں کو فتح وکامرانی کی نوید سنائی۔ یہ ان کے الفاظ کا جادو اور تحریروں کا سحر ہی تھا جس نے طرابلس کے مسلمانوں کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں تڑپ پیدا کر دی، ترک شہیدوں کے لیے ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو رواں کر دیے، کان پور کی مسجد کے انہدام پر مسلمانوں کے ہر گھر کو ماتم کدہ بنا دیا۔

الہلال کے ذریعے مولانا آزاد نے انقلاب و آزادی کا جو پر شور نعرہ بلند کیا تھا اس کی گونج ہندوستان کے باہر بھی سنائی دینے لگی۔ انہوں نے الہلال کے ذریعے ملکی سیاست اور وطنی آزادی کا جو صور پھونکا، اس سے انگریزوں کے تعمیر کردہ غلامی کے طلائی قصر کی بنیادیں ہل گئیں اور مسلمان بھی خواب غفلت سے بیدار ہو گئے، ان کے لہو میں گرمی وحرارت آگئی اور ان کا جمود وتعطل حرکت وانقلاب میں بدل گیا۔ وہ الہلال کے صحافت میں الجہاد، الجہاد فی سبیل الحریت کا نعرہ لگا کر مسلمانوں کو یہ بتاتے رہے کہ:

"وہ دنیا میں اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ ان زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا انسانوں کی گردنوں میں نہیں ڈالی جاسکتی ہیں، ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، وہ اس لیے نہیں پیدا کیے گئے ہیں کہ غلامی کی سب سے بھاری زنجیر کو خود اپنی گردن کا زیور بنائیں۔" (الہلال، 8/دسمبر 1912)

اسی ضمن میں 1913 کے ایک خطبے میں مولانا آزاد مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ:

"ایک چراغ جو روشن ہو کر پھر نہیں بجھتا وہ حریت صحیحہ کا چراغ ہے، مسلمان ہندوستان میں رہتے

ہیں، ہندوستان کی خدمت ان کا دینی فرض ہے، جس کی بجا آوری لازم ہے، انہوں نے جس جوش وایثار سے جنگ طرابلس وبلقان اور مسجد کان پور کے معاملہ میں حصہ لیا تھا اس معاملہ میں بھی اسی طرح حصہ لیں، انسانیت اور حق و عدل کے پرستاروں کے لیے امتیاز ایں وآں نہیں ہے۔ مسلمانوں کا نصب العین خدمت عالم ہے، وہ انسانیت کے خادم ہیں، ان کے لیے خدا کی زمین کا ہر ٹکڑا مقدس اور اس کے بندوں کا ہر گروہ محترم ہے۔"

مولانا آزاد، آزادی کی جدوجہد کو حق وانصاف اور عدل ومساوات کی جدوجہد سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ بالآخر اس کو کامیابی نصیب ہوگی۔ وہ ہوا کی رفتار دیکھ کر اور نوشہ تقدیر پڑھ کر اس کا بھی اعلان کرتے تھے کہ آزادی وحریت کے سیلاب کو جبر واستبداد سے روکا نہیں جا سکتا۔ آزادی کی ہوائیں ہر طرف چل رہی ہیں، غلاموں نے غلامی کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکنے کا فیصلہ کر لیا ہے، جذبہ حریت کو نہ زور و قوت سے مٹایا جا سکتا ہے اور نہ داد و دہش سے روکا جا سکتا ہے۔ ان کی فراست نے الہلال کی ادارت ہی کے زمانہ میں یہ سمجھ لیا تھا کہ آزادی کے شیدائیوں کو نہ سیم وزر کے انبار متاثر کر سکتے ہیں اور نہ جاہ ومنصب کے وعدے انہیں راہ حق سے ہٹا سکتے ہیں۔ مولانا آزاد کہتے تھے کہ ظالم حکمرانوں کے مظالم کی داستانوں سے تاریخ کے اوراق بھرے ہوئے ہیں۔ قید وبند، دار ورسن، کسی تشدد سے کبھی حریت پسند مرعوب نہیں اور بالآخر وہ وقت آجاتا ہے جب ظالموں کے تخت ہائے عظمت وجلال سرنگوں ہو جاتے ہیں اور مظلوم آگے بڑھ کر حکومت کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔ ممکن ہے ظالموں کی رسی کچھ عرصے کے لیے دراز ہو جائے، لیکن وہ وقت ضرور آئے گا جب ظلم وستم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ظالم فنا ہو جائیں گے اور عدل ومساوات اور حق وانصاف کا دور دورہ ہوگا۔

مولانا آزاد، آزادی اور اتحاد کی جس راہ پر گامزن تھے اسے حق وصداقت کی راہ سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ حق ضرور کامیاب ہوگا اور باطل خواہ وہ کتنا ہی طاقت ور اور ساز وسامان سے لیس کیوں نہ ہو، اسے فنا اور معدوم ہونا ہے۔ اس کی چمک دمک عارضی ہے، حق کے نمودار ہوتے ہی باطل کو راہ فرار اختیار کرنی ہوگی۔ مولانا آزاد کا یہ یقین بالکل درست نکلا اور انہوں نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوئی، چناں چہ انگریزی حکومت اپنی شان وشوکت اور جلال وجبروت کے باوجود سرنگوں ہوگئی اور غلام ہندوستان آزاد ہو گیا۔

5.3.6 تصور جمہوریت:

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے جسے آسان الفاظ میں عوام کی حکومت کہا جا سکتا ہے۔ آمریت کے برخلاف اس طرز حکمرانی میں تمام فیصلے عوامی نمائندے کرتے ہیں۔ جمہوریت کی دو بڑی قسمیں ہیں: بلاواسطہ جمہوریت اور بالواسطہ جمہوریت۔ بلاواسطہ جمہوریت میں قوم کی مرضی کا اظہار براہ راست افراد کی رائے سے ہوتا ہے۔ اس قسم کی جمہوریت صرف ایسی جگہ قائم ہو سکتی ہے جہاں ریاست کا رقبہ بہت محدود ہو اور ریاست کے عوام کا یکجا جمع ہو کر غور وفکر کرنا ممکن ہو۔

مولانا آزاد بھی بلاواسطہ جمہوریت کے حامی تھے۔ انہوں نے جس زمانے میں آزادی کی لَو لوگوں کے دلوں میں جلائی اور ایسی تیز و تند تقریریں اور اشتعال انگیز تحریریں لکھیں، اس زمانہ میں کانگریس کا کوئی رہنما اور دوسرے لیڈر ایسی جوش وخروش سے بھری ہوئی باتیں

کہنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ تحریک آزادی میں مولانا آزاد کی اس سبقت اور پیش قدمی کا اعتراف اس زمانہ کے لیڈروں نے بھی کیا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر نے کہا کہ "انہوں نے لیڈری ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی شاعری سے سیکھی۔" مولانا محمود حسن دیوبندی نے کہا "ہم اپنا سبق بھولے ہوئے تھے جو ہمیں الہلال نے یاد دلایا۔" پنڈت جواہر لال نے اپنی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" میں لکھا ہے:

> "مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار الہلال میں مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا انداز تخاطب تھا جس سے ہندوستان کے مسلمان نہ آشنا تھے۔ وہ علی گڑھ کے قیادت کے محتاط لہجہ سے واقف تھے، سر سید، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے انداز بیان کے علاوہ ہوا کا زیادہ گرم جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا، الہلال مسلمانوں کے کسی مکتبہ خیال سے متفق نہ تھا، وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔"

مولانا آزاد کی یہ باتیں قومی تحریک اور جمہوریت کے تصور کو فروغ دیتی ہیں۔ اس زمانے میں کانگریس نے آزادی کی جو تحریکیں چلائیں اور ہندو مسلم اتحاد کے جو منصوبے اور نقشے تیار کیے ان میں مولانا آزاد خود بھی شریک تھے اور ان کی کوششوں سے مسلمان بھی ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اس طرح 1930 تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ دراصل ملک کی سیاست اور آزادی کی جدوجہد میں مولانا آزاد کا امتیازی کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے آزادی کی تحریک کو قومی اور جمہوری تحریک بنا دیا۔

1930 کے بعد کے حالات نے ایک نیا موڑ لیا اور انگریزوں نے ایسا افسوں پھونکا کہ مسلمان مولانا آزاد کی بتائی راہ سے منحرف ہونے لگے۔ موہوم خدشات اور شبہات نے انہیں گھیر لیا۔ وہ وقتی جذبات کے سیلاب میں بہنے لگے۔ ہنگامی نعروں اور من پسند وعدوں پر ایسا فریفتہ ہوئے کہ ان کی اکثریت قوم پرستی اور جمہوریت کے تصور سے دور ہوتی گئی۔ مگر مولانا آزاد اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم رہے اور مزاحمت کرنے والوں کے تمام شکوک و شبہات بھی دور کرتے رہے۔ انگریزوں کے اشارے پر مذہبی حلقوں اور دینی رہنماؤں کی طرف سے جب آزادی و اتحاد کی تحریک کو دین و مذہب کے خلاف ثابت کرنے کی مہم شروع ہوئی تو مولانا آزاد نے اس غلط بیانی کا پردہ فاش کیا اور بتایا کہ آزادی اور جمہوریت انسان کا فطری حق ہے۔ کوئی مذہب اپنے پیروؤں کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔ وہ مسلمانوں کو خاص طور پر اس بات کی تلقین کرتے تھے کہ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد تمہارا دینی فرض ہے، تم نے ظلم و استبداد کو مٹا کر دنیا میں عدل و مساوات کو فروغ دینے کے لیے کیسی عظیم الشان جدوجہد کی ہے۔ تم ہی نے دنیا کو اصلی جمہوریت کا چہرہ دکھایا تھا، پھر آج لیت و لعل کیوں ہے؟ وہ الہلال میں لکھتے ہیں:

> "ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے یہ ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے، اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے، جو حق و صداقت اور انسانی بندو استبداد و غلامی کو توڑنے کے لیے کی جائے۔" (الہلال، 18/ دسمبر 1912)

مولانا آزاد کے نزدیک اسلام، قومیت اور جمہوریت میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ مسلمان کے لیے ملک کی خدمت اور اس کی فلاح و بہبود کی فکر اسلام کا حکم ہے۔ وہ کاروان آزادی و حریت میں اسی لیے شامل ہوئے تھے کہ وہ اسے اپنا مذہبی فریضہ اور اسلامی تقاضا سمجھتے تھے۔ وہ مذہب و سیاست اور دین و دنیا کی تفریق کے قائل نہ تھے۔ مولانا آزاد جمہوریت کے لیے ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس تعلق سے وہ اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"تحریک خلافت سے تقریباً دس سال پہلے میں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرائض انجام دینا چاہیے ہیں تو بحیثیت ہندوستانی انہیں انجام دینا چاہیے۔ یہ بھی ایک سچی حقیقت ہے مگر سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہو جائیں... میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتفاق نہ کر لیں... فی الحقیقت یہ وہ چیز ہے، جو اگر ایک طرف ترکِ مواسلات کے اصول کو ہمارے سامنے نمایاں کرتی ہے تو دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے مسئلے کو واضح کرتی ہے۔" (خطباتِ آزاد، ص47)

مولانا آزاد ملک کے عظیم ترین قومی رہنما تھے۔ وہ اپنے دور کے سب سے زیادہ ممتاز، سنجیدہ، وسیع النظر اور انسان دوست سیاسی مفکر تھے۔ ان کی رہنمائی صرف ہندوستانی مسلمانوں یا ہندوؤں تک محدود نہیں تھی اور ان کا متحدہ قومیت کا تصور اور جمہوریت کے تصور کو بھی بین الاقوامی طرز فکر کا صرف ایک پہلو تھا۔ در حقیقت مولانا آزاد عالمی برادری کے قائل تھے۔ ان کا سیاسی نقطہ نظر آفاقی تھا۔ انہوں نے برصغیر کی ممتاز سیاسی شخصیتوں اور مجاہدین آزادی کے حالات و واقعات کا بغور مطالعہ کیا تھا اور ان ہستیوں سے فیضیاب بھی ہوئے تھے، لیکن انہوں نے مذہب، ادب اور صحافت کی طرح سیاست میں اپنی ایک الگ راہ نکالی تھی، جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔

5.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مولانا ابوالکلام آزاد مختلف النوع شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت ایک اچھے ادیب، ممتاز عالم، عمدہ صحافی اور عظیم رہنما تھے۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں مولانا آزاد نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔
- مولانا آزاد ایک ممتاز سیاست داں ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ پایہ کے سیاسی مفکر بھی تھے۔ انہوں نے تمام مجاہدین آزادی سے فیضان حاصل کیا تھا، جن کی جھلک ہمیں ان کے تمام سیاسی تصورات میں صاف طور سے نظر آتی ہے۔
- مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان حیات سیاسی کا پہلا دور 1906 سے 1915 پر مشتمل ہے۔ اس وقت ان کی عمر 18 سے 28 سال کی تھی۔ اس دور میں مولانا بحیثیت صحافی، مدیر، انشاپرداز اور خطیب کے طور پر ابھرتے ہیں۔

- مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاست کا دوسرا دور 1920 سے 1923 کو محیط ہے۔ اس وقت ان کی عمر 32 سے 35 برس کی تھی۔ اس عہد میں مولانا آزاد ہندوستان کی سیاست میں بھرپور انداز میں شامل ہوئے اور وہ تحریک خلافت اور ترک موالات کے رہنما کی حیثیت سے ابھرے۔
- مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کا تیسرا دور 1923 سے لے کر 1958 تک یعنی ان کی عمر کے 35 سال سے ان کے وفات تک ہے۔ اس عہد میں مولانا آزاد متحدہ ہندوستانی قومیت کے علمبردار اور قومی قیادت کے صف اول کے رہنماؤں میں شامل تھے۔
- مولانا آزاد سیاست میں اخلاقیات ہونا ضروری تصور کرتے تھے۔ وہ ایک عظیم دانشور تھے اور انہیں اسلامی تاریخ، منطق اور فلسفے پر زبردست عبور حاصل تھا، لیکن انہوں نے کبھی مذہب اور سیاست میں تفریق نہیں کی۔ ان کی یہی خصوصیت انہیں دوسرے مفکرین سے الگ کرتی ہے۔
- تصور قوم یا متحدہ قومیت ایک ایسا تصور ہے، جو یہ ثبوت کرتا ہے کہ ہندوستانی قوم مختلف ثقافتوں، ذاتوں، برادریوں اور مسلکوں کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ ہندوستان میں محض مذہب کے ذریعہ قوم پرستی کی تعریف نہیں کی جاسکتی ہے۔
- مولانا آزاد نے خالص اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قوم پرستی اور متحدہ قومیت کے تصور کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔
- مولانا آزاد کے سیاسی نظریے کا ایک پہلو سیکولرازم اور قومی اتحاد بھی تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور یہاں پر انصاف کے لیے کوئی خاص مذہب کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔
- انسانی مساوات کے مشہور مبلغ روسو (Rousseau) کہتا ہے کہ "Man is born free but is everywhere in chains." یعنی انسان آزاد پیدا ہوا ہے، لیکن ہر طرف وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مولانا آزاد بھی اسی خیال کے حامی تھے۔
- جمہوریت ایک طرز حکومت ہے جسے آسان الفاظ میں عوام کی حکومت کہا جاسکتا ہے۔ آمریت کے برخلاف اس طرز حکمرانی میں تمام فیصلے عوامی نمائندے کرتے ہیں۔ جمہوریت کی دو بڑی قسمیں ہیں: بلاواسطہ جمہوریت اور بالواسطہ جمہوریت۔
- مولانا آزاد بھی بلاواسطہ جمہوریت کے حامی تھے۔ انہوں نے جس زمانے میں آزادی کی لَو لوگوں کے دلوں میں جلائی اور ایسی تیز و تند تقریریں اور اشتعال انگیز تحریریں لکھیں، اس زمانہ میں کانگریس کا کوئی رہنما اور دوسرے لیڈر ایسی جوش و خروش سے بھری ہوئی باتیں کہنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔
- مولانا آزاد کی یہ باتیں قومی تحریک اور جمہوریت کے تصور کو فروغ دیتی ہیں۔ اس زمانے میں کانگریس نے آزادی کی جو تحریکیں چلائیں اور ہندو مسلم اتحاد کے جو منصوبے اور نقشے تیار کیے ان میں مولانا آزاد خود بھی شریک تھے اور ان کی کوششوں سے مسلمان بھی ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔

5.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
مال ومتاع	:	روپیہ پیسہ، سازوسامان
حریت	:	آزادی، خود مختاری
چیرہ دست	:	فتح مند، چابک دست، غالب
استقلال	:	ثابت قدم، قائم رہنا
صور	:	آواز، صور پھونکنا
طرابلس	:	ایک شہر کا نام
نصب العین	:	پیش نظر مقصد، مقصد اصلی
استبداد	:	ظلم وجور سے حکومت کرنا، خود داری
قلادہ	:	گلے کا ہار، پٹا
افسوں	:	دغابازی، دھوکا
لیت ولعل	:	ٹال مٹول، آج کل، بہانہ
مناقشہ	:	باہمی لڑائی، نزاع
اسلاف	:	اگلے زمانے کے لوگ، باپ دادا

5.6 نمونہ امتحانی سوالات

5.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کا آغاز کتنے برس کی عمر میں ہوا؟
2. مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے؟
3. مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کا دوسرا دور کس سنہ سے شروع ہوتا ہے؟
4. مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کے پہلے اور دوسرے دور کے درمیان کتنے برس کا وقفہ تھا؟
5. "الہلال" کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا؟
6. "البلاغ" کے کتنے شمارے شائع ہوئے؟
7. مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کا آغاز کس سنہ میں ہوا؟

8. "انسان آزاد پیدا ہوا ہے، لیکن ہر طرف وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔" کس کا قول ہے؟
9. ایوان اردو، دہلی کا مولانا ابوالکلام آزاد نمبر کب شائع ہوا؟
10. " مولانا آزاد: ایک سیاسی ڈائری" کس کی تصنیف ہے؟

5.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالیے۔
2. مولانا آزاد کے تصور سیاست اور مذہب پر تبصرہ کیجیے۔
3. مولانا آزاد کے تصور قوم اور متحدہ قومیت پر مضمون لکھیے۔
4. مولانا آزاد کے تصور سیکولرازم پر اظہار خیال کیجیے۔
5. مولانا آزاد کے تصور جمہوریت کو بیان کیجیے۔

5.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کے عہد کا سیاسی منظر نامہ بیان کیجیے۔
2. مولانا آزاد کے تصور آزادی پر نوٹ لکھیے۔
3. مولانا آزاد کے سیاسی تصورات پر روشنی ڈالیے۔

5.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت، سیاست، پیغام	رشید الدین خان
2. مولانا ابوالکلام آزاد: تحریک آزادی و یکجہتی	عبدالودود خان
3. مولانا ابوالکلام آزاد: ایک سیاسی مطالعہ	ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری
4. مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندوستانی قومی تحریک	ڈاکٹر اجے انوپم
5. مولانا آزاد: ایک سیاسی ڈائری	اثر بن یحییٰ انصاری
6. مضامین مولانا ابوالکلام آزاد	منشی مشتاق احمد
7. ایوان اردو، مولانا ابوالکلام آزاد نمبر	دہلی اردو اکادمی، دہلی 2014

اکائی6: مولانا آزاد کے مذہبی تصورات

(ترجمان القرآن کے حوالے سے)

اکائی کے اجزا

6.0		تمہید
6.1		مقاصد
6.2		مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت
6.3		تعارف ترجمان القرآن
6.4		ترجمان القرآن کی اشاعت
6.5		تفسیر سورہ فاتحہ
6.6		ترجمان القرآن کی خصوصیات
6.7		مولانا آزاد کے مذہبی تصورات
6.8		مولانا آزاد کے مذہبی افکار کی عصری معنویت
6.9		اکتسابی نتائج
6.10		کلیدی الفاظ
6.11		نمونۂ امتحانی سوالات
	6.11.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	6.11.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	6.11.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
6.12		تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستانی مسلمانوں کے ایک ایسے رہنما ہیں جو ہمہ جہت صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ تحریک آزادی کے عظیم سپہ سالار، دور اندیش سیاست داں، بے باک صحافی، مایہ ناز خطیب، صاحب طرز ادیب و تذکرہ نگار اور اسلامی علوم کے ماہر تھے۔ مولانا آزاد

کو مذہبی علوم کے ساتھ اس زمانے کے مروجہ جدید علوم اور اردو کے علاوہ عربی، انگریزی اور کئی دیگر زبانوں پر بھی دسترس حاصل تھی۔ اگر چہ مولانا کو اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے بہت کم لکھنے کا موقع ملا لیکن جو وقت بھی ملا اور اس میں جو کچھ لکھا وہ انتہائی اہم ہے۔ مولانا جس وقت تحریک آزادی کی جدوجہد کے دوران قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے اس دوران بھی علمی، تصنیفی اور تحقیقی کاموں کو جاری رکھا۔ ان کی تالیفات میں قرآن مجید کی تفسیر "ترجماں القرآن" کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہے۔ یہ تفسیر ان کے وسعت مطالعہ، علمی معیار، جذبۂ تحقیق، اجتہاد فکر اور مذہبی بصیرت کی شاہکار ہے۔ ترجمان القرآن کی مقبولیت کے تعلق سے مولانا خود لکھتے ہیں:

"شاید اردو مطبوعات کی تاریخ میں "ترجمان القرآن" پہلی کتاب ہے جسے لوگوں نے اس ذوق عشق کے ساتھ خریدا ہو اور پڑھا ہو، لوگوں کا یہ حال ہے کہ اپنی شیروانی بیچ کر "ترجمان القرآن" خریدنا چاہتے تھے۔"

اس اکائی میں ترجمان القرآن کے حوالے سے مولانا ابو الکلام آزاد کے مذہبی تصورات بیان کیے گئے ہیں۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت کو سمجھ سکیں۔
- ترجمان القرآن کا تعارف پیش کر سکیں۔
- ترجمان القرآن کی اشاعت پر تبصرہ کر سکیں۔
- سورہ فاتحہ کی تفسیر پر گفتگو کر سکیں۔
- ترجمان القرآن کی خصوصیات بیان کر سکیں۔
- مولانا آزاد کے مذہبی تصورات کو سمجھ سکیں۔
- مولانا آزاد کے مذہبی افکار کی عصری معنویت بیان کر سکیں۔

6.2 مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت

مولانا آزاد قرآن مجید کے ساتھ گہری وابستگی، شغف اور خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ ان کا علمی و فکری شعور اور پختگی قرآن فہمی کا نتیجہ تھی۔ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اسی سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ جیسا کہ خود مولانا رقم طراز ہیں:

"ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہی ہے۔ اس کے سوا ہم اور کچھ نہیں جانتے۔ ساری دنیا کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں۔ اور تمام آوازوں سے کان بہرے ہیں۔ اگر دیکھنے کے لیے روشنی کی ضرورت ہے، تو یقین کیجیے کہ ہمارے پاس تو (سراج منیر) کی بخشی ہوئی ایک ہی روشنی ہے، اسے

ہٹا دیجیے گا تو بالکل اندھے ہو جائیں گے۔"

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ مطالعہ قرآن پر صرف کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"کامل ستائس برس قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے۔ اس کی ایک ایک سورہ، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کیں ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں۔ تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں جس کی طرف سے حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو۔"

ابتدا ہی سے مولانا کی زندگی کی تمام تر سرگرمیوں کا محور و مرکز قرآن مجید ہی تھا۔ الہال اور البلاغ کو جاری کرنے کا اصل مقصد بھی قرآن کی دعوت و تبلیغ تھی۔ صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے سید وصی احمد بلگرامی کے ایک استفسار کے جواب میں تحریر کیا تھا:

"الہلال اور البلاغ دونوں دعوت الی القرآن کے ترجمان تھے، عملی میدان میں حزب اللہ اور اس کے ذیلی ادارے، دار الارشاد، نظارۃ المعارف القرانیہ، سب کا محور و مرکز دعوت الی القرآن تھا۔"

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت کا اعتراف کرتے ہوئے علی اشرف صاحب لکھتے ہیں:

"ان کی نظر قرآنی تعلیم کے ان پہلوؤں پر زیادہ تھی جن تک انیسویں صدی کے کسی اسلامی مفکر کی نگاہ نہیں جا سکتی تھی۔ انہوں نے ربوبیت، رحمت اور عدل کو صفات الٰہی میں پہلی مرتبہ ایسا بلند مقام عطا کیا۔ وحدت ادیان، مذہبی جتھ بندیوں کی مخالفت اور پوری انسانیت کی ایک برادری کا سبق قرآن کی زبانی ایسے دلنشیں طریقے سے پڑھایا، فطری اور سماجی علوم کی تحصیلات کو قرآن کی خدمت میں ایسی عمدگی سے لگایا کہ ترجمان القرآن ترجمہ و تفسیر کی ایک بلند پایہ دینی و علمی کتاب کے علاوہ ایک لاثانی ادبی شاہکار بن گئی۔ جس کا جواب اردو تو کیا دنیائے اسلام کا کوئی بھی تفسیری ادب پیش نہیں کر سکا۔"

6.3 تعارف ترجمان القرآن

ہندوستان کے اردو مفسرین میں مولانا آزاد کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ اس لیے وہ قرآن مجید کی زبان کے مزاج اور اسلوب بیان سے بخوبی واقف تھے اور اسلامی علوم میں گہرا مطالعہ اور عصر حاضر سے کماحقہ آگاہی بھی تھی۔ ان کی مختلف مذاہب، تہذیبوں، ثقافتوں اور اقوام عالم کی تاریخ پر بھی گہری نگاہ تھی ساتھ ہی ذہانت اور زورِ بیان کی خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس لیے وہ اس کے زیادہ حقدار تھے کہ قرآن کریم کے معانی و مطالب کی تشریح و تفسیر کریں۔ مولانا نے سابقہ تمام تر تفسیری کتب کے مطالعہ

اور تجزیے کے بعد قرآن پاک کو سمجھنے اور سمجھانے کا اپنا ایک علاحدہ اور مخصوص تفسیری منہج اختیار کیا۔ جس میں اجتہادی جدت کی شان بھی ہے اور اسلاف کی روایت کا پاس و لحاظ بھی موجود ہے۔ مولانا کی اسی قرآنی بصیرت کی تفسیر و تعبیر ترجمان القرآن ہے۔ مولانا قرآن شناسی کے لیے قدیم بنیادی سرچشموں سے استفادہ پر زور دیتے ہوئے ترجمان القرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"قرآن فہمی اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں جس اعلیٰ معیار پر تھی اسے بعد کے مفسرین قائم نہ رکھ سکے۔ لہذا قرآن شناسی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے معانی و مفاہیم کے قدیم ترین سرچشموں تک رسائی حاصل کریں اور بعد کے مفسرین نے قرآن کے مطالب کے بیان میں لفظی گورکھ دھندوں اور قیاس آرائیوں سے کام لے کر اس کے مفہوم پر جو نقابیں ڈال دی ہیں ان کو دور کر دیا جائے۔"

خالق کائنات کے آخری نسخہ کیمیا قرآن مجید سے بحیثیت مجموعی امت کی بے اعتنائی مولانا کے لیے بہت ہی تکلیف دہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ مذہبی بگاڑ کی اصل وجہ قرآن سے دوری ہے اس لیے وہ مسلمانوں میں قرآن کی تعلیم کو عام کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس مقصد سے انہوں نے ترجمان القرآن لکھا اور اس کی پہلی جلد کے دیباچے میں اس کا ذکر بھی کیا کہ "مذہبی اصلاح کے لیے سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ وقت کی ضروریات کے مطابق قرآن کی تعلیم و اشاعت کا سر و سامان ہو، لیکن بدقسمتی سے اس کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔"

اس بات کا احساس دلاتے ہوئے مولانا آزاد نے 25 جولائی 1932 کو غلام رسول مہر کو بھی لکھا تھا:

"عزیز من! محض باتوں سے تو کچھ بنتا نہیں۔ اصل چیز عمل ہے۔ آج مسلمانوں کی زندگی و سعادت کے لیے کوئی کام اس درجہ اہم اور ضروری نہیں ہے، جس قدر یہ کام کہ قرآن کی تعلیم اپنی حقیقی شکل و نوعیت میں نمایاں ہو اور مسلمانوں میں اس کی عالمگیر اشاعت عمل میں آئے۔ لیکن آپ نے ترجمان القرآن کے لیے کیا کیا؟۔"

گویا ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان ہندوستان میں ایک طرف سماجی، معاشی اور مذہبی لحاظ سے پس ماندگی کا شکار تھے اور دوسری جانب مغربی علوم و فنون اور تہذیب سے متاثر و مرعوب تھے، مولانا نے ان کے اندر بیداری اور فکری انقلاب پیدا کرنے کے لیے نسخہ علاج قرآن میں تلاش کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے رسالہ معارف میں تبصرہ کیا تھا:

"مصنف ترجمان القرآن کی یہ دیدہ وری داد کے قابل ہے کہ انہوں نے وقت کی روح کو پہچانا اور اس فتنہ فرنگ کے عہد میں اس طرز و روش کی پیروی کی جس کو ابن تیمیہ اور ابن قیم نے فتنۂ تاتار میں پسند کیا تھا اور جس طرح انہوں نے اس عہد کے مسلمانوں کی تباہی کا راز فلسفہ یونان کی دماغی پیروی کو قرار دیا۔ اسی طرح اس عہد کے مسلمانوں کی بربادی کا سبب ترجمان القرآن کے مصنف نے فلسفۂ فرنگ و یونان کی ذہنی غلامی کو قرار دیا اور نسخۂ علاج وہی تجویز کیا کہ کلام الٰہی کو رسول کی زبان و اصطلاح اور فطرت کی عقل و فلسفہ سے سمجھنا چاہیئے۔ ترجمان القرآن وقت کی اہم چیز

ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے۔ مولانا سے بھی عرض ہے کہ وہ اس ضروری تالیف کی تکمیل کو اپنی عمر کا اہم کارنامہ سمجھیں اور دوسرے کاموں سے وقت بچا کر سب سے پہلے اسے انجام تک پہنچائیں۔"

6.4 ترجمان القرآن کی اشاعت

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کے بعد ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے ان کی تمام کتابوں اور تحریروں کو نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں ان کی تفسیر ترجمان القرآن سر فہرست ہے۔ اس سے پہلے یہ تفسیر مولانا کی زندگی میں تین جلدوں میں ترجمہ و تشریحی نوٹ کے ساتھ 1931 سے 1936 کے درمیان شائع ہوئی تھی۔ پہلی جلد میں مقدمہ اور سورہ فاتحہ کی تفسیر تھی، دوسری جلد سورہ البقرہ سے لے کر سورہ الانعام تک اور تیسری جلد سورہ الاعراف سے سورہ المومنون تک تفسیری ترجمہ و حواشی پر مشتمل تھی۔ اس میں مولانا نے پہلے ہر مضمون کو اختصار کے ساتھ حاشیہ میں لکھ دیا ہے پھر اوپر آیت لکھ کر نیچے صفحہ میں تفسیری ترجمہ لکھا ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی نے قارئین کے مطالعہ کی سہولت کے پیش نظر جلد اول کو تو یوں ہی رہنے دیا جو مقدمہ اور سورہ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ بقیہ دو جلدوں کو چار جلدوں میں کر کے مالک رام کے حواشی کے ساتھ طباعت کے اعلیٰ معیار کے مطابق بہت ہی اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اب اس میں سورہ نور کا ترجمہ اور تفسیری و توضیحی حواشی بھی شامل ہیں۔

اکیڈمی کی اس اشاعت میں قرآن مجید کے ایک مصری نسخہ کے مطابق آیات پر نمبر لکھے گئے ہیں اور اعراب کی تصحیح کی گئی ہے۔ اسی طرح اردو الفاظ کے املاء میں جو غلطیاں تھیں انہیں بھی درست کر دیا گیا ہے۔ ترجمان القرآن کے پہلے دونوں ایڈیشنوں میں مولانا نے جو ترمیم و تنسیخ کی تھی یا اس حوالے سے جو تحریریں الگ سے شائع کی تھیں انہیں بھی اکیڈمی نے اس میں شامل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ تفسیر میں مذکور یورپی مصنفین اور ان کی تصنیفات کے نام رومن میں بھی لکھ دیے گئے ہیں۔ آخر میں اشخاص اور قبائل کے ناموں کی فہرست اور شروع میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا پیش لفظ شامل ہے۔

مولانا آزاد اپنی تحریروں میں کثرت سے قرآن مجید کی آیات مع ترجمہ و تشریح نقل کیا کرتے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر نے ترجمان القرآن کی تکمیل کی غرض سے الہلال، البلاغ اور مولانا کی دوسری تحریروں کی مدد سے سورہ النور سے سورہ الناس تک متفرق آیات کا ترجمہ اور تفسیر و تشریح کو جمع کر کے "باقیات ترجمان القرآن" کے نام سے 1971 میں شائع کیا ہے۔ اس اشاعت کے بعد ترجمان القرآن تشنۂ تکمیل تھا۔ چنانچہ جو حصہ ترجمہ و تفسیری حواشی کے لحاظ سے اب بھی ناتمام تھا مولانا ابو سعود اظہر ندوی نے اس کی تکمیل بالترتیب ترجمہ شیخ الہند اور تفسیر ابن کثیر کی مدد سے مکمل کر کے "تلخیص ترجمان القرآن" کے نام سے 2006 میں شائع کر دیا ہے۔

6.5 تفسیر سورہ فاتحہ

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں سورہ فاتحہ کی نہایت تفصیلی تفسیر لکھی ہے۔ اب تک کسی بھی زبان کی تفسیر میں اس سورہ کی اتنی

مفصل تفسیر نہیں لکھی گئی ہے۔ پورے قرآن مجید کا نچوڑ انہوں نے اس سورہ میں بیان کر دیا ہے۔ سورہ فاتحہ ترتیب کے لحاظ سے پہلی سورہ ہو نے کی وجہ سے ایک طرح سے قرآن مجید کا مقدمہ و پیش لفظ ہے۔ گویا قرآن مجید میں جو دین اسلام بیان کیا گیا ہے سورہ فاتحہ اس کی تلخیص ہے۔ اس لیے مولانا نے سوچا کہ قرآن کریم کے اس دیباچہ کی تشریح و تفسیر اس طرح کر دی جائے کہ لوگ اس کو پڑھ کر قرآن کی اصل روح اور اس کے مقاصد سے پوری طرح واقف ہو جائیں۔ چوں کہ اتنی شرح وبسط کے ساتھ پورے قرآن مجید کی تفسیر و تشریح ممکن نہیں تھی۔ اس لیے دوسری سورتوں کی تفسیر میں مختصر اور ضروری تشریح وحواشی پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ البتہ سورہ فاتحہ کے علاوہ دوسری سورتوں کی تفسیر کے مقابلے میں سورہ یوسف کی تفسیر بھی نسبتاً مفصل ہے۔

مولانا نے سورہ فاتحہ میں مذکور اللہ تعالیٰ کی تینوں صفات ربوبیت، رحمت اور عدالت کی بہت ہی موثر اور دلنشیں انداز میں تشریح کی ہے اور صفات باری تعالیٰ کے قرآنی تصور پر محققانہ طریقے سے معرکتہ الآرا بحث کی۔ تفسیر سورہ فاتحہ دراصل مولانا کی ایک مکمل تصنیف ہے۔ اس میں قرآن کے بنیادی تصورات توحید، رسالت اور آخرت کی ایسی جامع تشریح و توضیح کی ہے کہ قرآن کا منشاء واضح ہو جاتا ہے۔ مولانا کے مذہبی افکار و نظریات کی تفہیم کے لیے ان مباحث کا مطالعہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی سورہ فاتحہ کی تفسیر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اس میں سورہ فاتحہ کی ایک ایک لفظ کی ایسی دلنشیں تشریح اور بصیرت افروز تفسیر ہے کہ اس سے سورہ کے ام الکتاب ہونے کا مسئلہ مشاہدہ معلوم ہونے لگتا ہے اور اسلام کے تمام مہمات مسائل اور اصول دین پر ایک تبصرہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً قرآن پاک کے طرز استدلال، خالق کائنات کی ربوبیت ورحمت کے آثار و دلائل اتنی تفصیل سے لکھے ہیں کہ مصنف کی وسعت علم و نظر کی داد بے اختیار دینی پڑتی ہے اور امام غزالی نے "الحکمۃ فی مخلوقات اللہ تعالیٰ" میں اور ابن قیم نے "مفتاح دار السعاد "میں اس مبحث پر جو کچھ لکھا ہے اس سے زیادہ بسط و تشریح اور مقتضائے زمانہ کی مطابقت سے "ترجمان القرآن" میں یہ بحث آگئی ہے۔"

6.6 ترجمان القرآن کی خصوصیات

مولانا ابو الکلام آزاد بلاشبہ قرآن کریم کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے اس میدان میں بہت قیمتی علمی و تحقیقی سرمایہ چھوڑا ہے۔ ان کی تفسیر "ترجمان القرآن" نہ صرف اپنی ضخامت کے لحاظ سے بلکہ قدر و قیمت کے اعتبار سے بھی عظیم الشان ہے۔ انہوں نے اپنا سب سے زیادہ وقت اسی تصنیف پر صرف کیا ہے۔ ان کی علمی، ادبی اور دینی شخصیت پوری آب و تاب کے ساتھ اس میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ تفسیر ترجمان القرآن کی بعض خصوصیات اختصار کے ساتھ پیش ہیں:

اسلوب بیان کا حسن:

ترجمان القرآن اردو کے ایک صاحب طرز ادیب اور انشاپرداز کے قلم کا شاہکار ہے۔ لہٰذا اس تفسیر کا ایک حسن اس کی

خوبصورت زبان ہے۔یوں تو ان کی ساری تحریریں بہت عمدہ ہیں، لیکن پیرایہ بیان کی شگفتگی اور اسلوب کی دلکشی کے لحاظ سے ترجمان القرآن بے مثال ہے۔ سجاد انصاری کے بقول "اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو مولانا آزاد کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی۔ "مولانا آزاد نظام کائنات کی موزونیت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے فطرت کے جمالیاتی حسن کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ خالق کائنات کی صناعی کمال پر دل عش عش کرنے لگتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"گیہوں کا ایک دانہ اٹھاؤ، پھول کی ایک کلی توڑو، گھاس کی ایک پتی سامنے رکھ لو اور دیکھو ان کی ساری باتیں کس طرح تلی ہوئی اور کس دقیقہ سنجی کے ساتھ سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ اگر حجم ہے تو اس کا ایک مقررہ اندازہ ہے، لاکھ مرتبہ بوؤ، کروڑ مرتبہ بوؤ، اس اندازہ میں کوئی فرق آنے والا نہیں، اگر شکل ہے تو اس کا ایک خاص اندازہ ہے، وہ چیز اگے گی اسی شکل میں اگے گی، اگر رنگت ہے، خوشبو ہے، مزہ ہے، خاصہ ہے، تو سب کا ایک مقررہ اندازہ ہے اور یہ اندازہ قطعی ہے، دائمی ہے، اٹل ہے، انمٹ ہے اور ہمیشہ اس یکسانیت کے ساتھ ایک ایک پتے، ایک ایک پھل کو تول تول کر بانٹ رہا ہے، ممکن نہیں کہ اس تول میں کوئی خرابی پڑے۔"

ادبی زبان کی چاشنی:

یقیناً مولانا کی زبان نہایت فصیح و بلیغ تھی اور ان کی تمام تحریریں اسی نہج پر ہیں لیکن ترجمان القرآن کی زبان سیدھے سادھے الفاظ میں تفسیری ادب کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ کوہ طور پر جب حضرت موسیٰؑ نے جمال خداوندی کی خواہش ظاہر کی تو خدا نے فرمایا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ اس واقعے کی ادبی چاشنی سے لبریز تصویر کشی مولانا کی زبانی ملاحظہ ہو:

"جب خدا نے موسی سے کلام کیا تو اس نے کہا میرے سامنے آجا کہ بس ایک نگاہ دیکھ لوں۔ یعنی جب غیب سے ندائے حق سنی تو جوش طلب میں بے خود ہو گئے اور لذت سماع کی محویت میں لذت مشاہدہ کے حصول کا ولولہ پیدا ہو گیا۔۔۔ حکم ہوا پہاڑ کو دیکھ۔ اگر یہ تاب لا سکا تو تو بھی تاب لا سکے گا۔ یعنی جو بات نظارہ سے مانع ہے وہ خود تیری ہی ہستی کا عجز ہے یہ بات نہیں کہ نمود حق میں کمی ہو۔"

ایک معنیٰ کا تعین:

اس سے پہلے مختلف زبانوں میں جو تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ ان کا طریقہ یہ رہا ہے کہ کسی آیت کی تشریح و توضیح میں متقدمین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں ان سب کو نقل کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے عام لوگوں کا ان سے استفادہ دشوار ہوتا ہے اور قرآن کے سمجھنے کا جو مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہو پاتا ہے۔ مولانا نے ترجمان القرآن میں اس کے برخلاف یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ عربی زبان کے اسلوب اور قدما کے اقوال و مفسرین کی تشریحات کی روشنی میں آیت پر خود غور و فکر کر کے ایک معنیٰ متعین کرتے ہیں پھر اسے عمدہ طریقے سے بیان کرتے ہیں تاکہ قاری بآسانی سمجھ جائے اور اس کے ذہن میں کسی طرح کا اضطراب باقی نہ رہے۔

قرآنی طریق استدلال:

ترجمان القرآن کی ایک خوبی یہ ہے کہ مولانا نے قرآن پاک کو اس کے اصل اسلوب میں سمجھنے کی عمدہ کوشش کی ہے تاکہ قرآنی پیغام کے حقیقی مفہوم تک رسائی حاصل ہو سکے۔ ان کا خیال ہے کہ دور اول کے مفسرین نے اس طرف کم توجہ دی ہے۔ وہ قرآن مجید کے طرز استدلال کے متعلق لکھتے ہیں:

> "اس صورت حال کا سب سے زیادہ افسوس ناک نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کا طریق استدلال دور از کار دقیقہ سنجیوں میں گم ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کے تمام بیانات کا مرکز و محور اس کا طریق استدلال ہے۔ اس کے ارشادات و بصائر، اس کے قصص و امثال، اس کے مواعظ و حکم، اس کے مقاصد و مہمات سب اسی چیز سے کھلتے اور ابھرتے تھے۔ یہ چیز کیا گم ہوئی گویا اس کا سب کچھ کھو گیا۔"

مجتہدانہ انداز:

مولانا کا خیال تھا کہ تفسیر میں تقلید کا رجحان عام ہو گیا ہے اور بعد کے مفسرین نے عام طور پر اپنے پیش رو مفسرین کی پیروی کی ہے اور کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لیے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے؟ اس لیے مولانا نے اپنی تفسیر تقلید سے آزاد مجتہدانہ انداز میں لکھی ہے۔ چنانچہ بہت سے نئے نکتوں کی جانب پہلی مرتبہ توجہ دلائی اور متعدد نئے خیالات پیش کیے۔ وہ مولانا غلام رسول مہر کو اس حوالے سے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "ترجمان القرآن کے معاملے میں سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ مقاصد و مطالب، وجوہ و دلائل نظم و اسلوب اور نظر و استنباط کی سر تا سر از سر نو تدوین ہے۔ کوئی نوٹ ایسا نہیں جو ایک نیا پردہ نہ اٹھا رہا ہو۔ دلائل قرآنی کا معاملہ تو بالکل از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ قدیم ذخیروں میں اس کے لیے کوئی مواد موجود نہیں، بلکہ غلط طریق نظر نے تمام ادلہ وجوہ کو کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔"

فقہی مباحث سے اجتناب:

مفسرین کا ایک طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ جس فقہی مسلک و مذہب سے ان کا تعلق ہوتا ہے کوشش یہ رہتی ہے کہ قرآنی آیات سے وہ اپنے مسلک کی تائید کریں اور دوسرے مکتب فکر کی تردید ہو۔ اس کے نتیجہ میں قرآن فقہی بحثوں کا محور بن جاتا ہے اور اس کی تعلیمات کی جامعیت و مقصدیت ختم ہو جاتی ہے۔ ترجمان القرآن کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ مولانا نے اس میں فقہی اختلاف سے اجتناب برتا ہے کیونکہ وہ مسلکی اور فقہی گروہ بندیوں کے سخت مخالف تھے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ شریعت میں کتاب اللہ اور سنت رسول کو رہنما بنایا جائے اور فقہائے اسلام سے حسن ظن رکھا جائے۔ انہوں نے لکھا ہے:

> "صحیح راہ حق اور اعتدال کی یہ ہے کہ دو اصل ہیں اور دونوں کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ ہر حال میں کتاب و سنت و نصوص شرعیہ کو مقدم رکھنا چاہیئے اور اس پر حکم و عمل کرنا چاہیئے۔ دوسری یہ

کہ ائمہ اسلام اور علماء حق سے حسن ظن اور محبت وارادت رکھنی چاہیئے۔ اور ان کے مراتب و حقوق کی رعایت سے کبھی غافل نہ ہونا چاہیئے۔ یہی دو اصل ہیں جن کے توازن اور تناسب کو باعتدال ملحوظ نہ رکھنے سے ساری مصیبتیں پیش آتی ہیں۔"

جدید تحقیقات سے استفادہ:

ترجمان القرآن کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں قرآن مجید میں مذکور بعض چیزوں کو سمجھنے کے لیے جدید تحقیقات سے بھر پور استفادہ کیا گیا ہے۔ مولانا کی ان تحقیقات کو اہل علم کے حلقوں میں قبول بھی کیا گیا۔ مثلاً قرآن میں مذکور شخصیت ذوالقرنین کے متعلق مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے سکندر مقدونی مراد ہے۔ قرآن نے ذوالقرنین کو ایک خدا ترس شخصیت کے طور پر پیش کیا ہے۔ جب کہ سکندر مقدونی ان اوصاف کا حامل نہیں تھا۔ لہذا مولانا نے تحقیق کے بعد دلائل سے یہ ثابت کیا کہ یہاں ذوالقرنین سے مراد ایران کا بادشاہ کیخسرو ہے جو نیک خصلت اور ان اوصاف سے متصف تھا، جو قرآن میں بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح مولانا نے آثار قدیمہ کی تحقیقات کی روشنی میں ثابت کیا کہ سورہ کہف میں مذکور کہف (غار) اردن میں عمان کی پہاڑیوں میں موجود غاروں میں سے ایک ہے جو پوری طرح قرآن میں ذکر کیے گئے غار سے مشابہ ہے۔ وغیرہ۔

مستشرقین کے اعتراضات کا جواب:

مولانا نے اپنی تفسیر میں مشتشرقین کی جانب سے قرآن پر کیے جانے والے اعتراضات اور الزامات کا رد کیا ہے اور مدلل انداز میں قرآن کی حقانیت کو ثابت کیا ہے۔ مثلاً ذوالقرنین ہی کے معاملہ میں مولانا لکھتے ہیں:

"ہم نے ذوالقرنین کی بحث میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے۔ کیوں کہ زمانۂ حال کے معترضینِ قرآن نے اس مقام کو سب سے زیادہ اپنے معاندانہ استہزاء کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "ذوالقرنین کی کوئی تاریخی اصلیت نہیں ہے۔ یہ محض عرب یہودیوں کی ایک کہانی تھی جو پیغمبر اسلام نے اپنی خوش اعتقادی سے صحیح سمجھ لی اور نقل کر دی" اس لیے ضروری تھا کہ ایک مرتبہ یہ مسئلہ اس طرح صاف کر دیا جائے کہ شک و تردد کا کوئی پہلو باقی نہ رہے۔"

غیر مسلمین اور جدید ذہن کی تسکین:

مولانا آزاد عصر حاضر کی ضرورتوں اور جدید ذہن کے تقاضوں سے بخوبی واقف تھے۔ خاص طور پر اسلام کے وہ موضوعات جن کے سلسلے میں عام طور پر غیر مسلمین اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں میں اشکال رہتا ہے۔ ترجمان القرآن کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان موضوعات کی بہت ہی حکیمانہ اور دلنشیں تشریحات اس میں پیش کر دی گئی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ میں:

"اس سے پہلے اردو میں کوئی ایسا ترجمہ موجود نہیں تھا جو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے دلوں کو بھی کھینچ سکے۔ ترجمان القرآن نے ایک حد تک یہ کمی پوری کر دی ہے۔ اسے غیر معمولی مقبولیت خصوصاً تعلیم

یافتہ طبقہ میں دو وجہوں سے حاصل ہوئی: ایک تو مولانا کی زبان و بیان میں وہ غضب کی دلکشی ہے جس نے ان کے ترجمے اور تفسیری اشارات میں اردو ادب کے ایک بلند شاہکار کی شان پیدا کر دی ہے، دوسرے وہ روحِ عصر کے مطابق کلام الٰہی کے مطالب کو اس حکیمانہ انداز میں سمجھاتے ہیں جس سے نئے زمانے کے تنقیدی ذہن کی بھی تسکین ہو جاتی ہے۔"

علامہ نیاز فتحپوری بھی ترجمان القرآن کی مذکورہ بالا خصوصیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد کا اصل شاہکار ان کی تفسیر "ترجمان القرآن" ہے یہ تفسیر فہم قرآن کے حوالے سے ذہن و فکر کے نئے نئے دریچے ہی نہیں کھولتی بلکہ اس نے اردو کی تفسیری روایات میں غور و فکر اور جدید ذہن کے تقاضوں کے مطابق قرآنی آیات کی تشریح و تعبیر کی ایک ایسی روایت ڈالی ہے جس نے بعد کے تقریباً سبھی اردو مفسرین کو متاثر کیا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی تصور توحید اور دیگر مذاہب میں توحید کے تصور کا مقابلہ اور اس میں ارتقاء کی تلاش، وحدت ادیان کے نظریے کے خلاف وحدت دین کا تصور، صفات الٰہی کی دل کو چھونے والی تشریحات، ان کا مطالعہ تاریخ خاص طور پر اصحاب کہف، ذوالقرنین اور یاجوج و موجوج کے بارے میں ان کی فکر انگیز تحقیقات سے ان کے بعد کے اردو کے تقریباً سبھی مفسرین نے استفادہ کیا ہے۔"

6.7 مولانا آزاد کے مذہبی تصورات

مولانا آزاد ایک سچے اور پکے مومن تھے اور اپنے مسلمان ہونے کا بار بار برملا اظہار بھی کرتے تھے۔ 1940 میں رام گڑھ کے کانگریس کے اجلاس کی صدارتی تقریر میں انہوں نے کہا تھا:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔"

مولانا ذاتی طور پر شریعت کے بھی سخت پابند تھے اور دنیوی سیاست سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے شغف رکھتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا بیان ہے:

"حضرت مرحوم کی زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا کہ سکون شب و سعادت اولین کی وہ گھڑیاں جب کہ دنیا بستر راحت پر خواب شیریں کے مزے لوٹتی ہے، رجوع و انابت الی اللہ، مراقبہ و عبادت میں نہ گزری ہوں۔ ان کا معمول تھا کہ رات کو بہت جلد (عموماً 9 بجے) سو جاتے تھے اور صبح گاہی تین ساڑھے تین بجے روزانہ ہی بیدار ہوتے اور اول چار رکعت سے آٹھ رکعت تک خدا کے حضور میں سر

بسجود و جبین بہ نیاز رہنے کے بعد خود اپنے شوق چائے سے فارغ ہوتے۔ پھر تفسیر قرآن حکیم یا آیات الٰہی کے کسی عنوان پر غور و فکر میں صبح کی نماز تک مشغول رہتے اور نماز فجر پڑھ کر اپنے دنیوی مشاغل میں مصروف ہو جاتے۔"

مولانا نے اپنی پوری زندگی اس جدوجہد کے لیے وقف کر دی تھی کہ وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہندوستان کے لوگوں کی صحیح رہنمائی کر سکیں جس سے وہ دنیا میں بھی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو سکیں اور آخرت میں بھی۔ اس سلسلے میں ان کی بے شمار تحریریں ہیں، جن سے ان کے ایک صحیح العقیدہ مسلمان اور اسلام و مسلمانوں کے سچے خیر خواہ کی حیثیت سے مذہبی تصورات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سر فہرست قرآن مجید کی تفسیر ترجمان القرآن ہے۔ ذیل میں اس کی روشنی میں مولانا کے چند مذہبی تصورات کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

مذہب کا آفاقی تصور:

انسانی ذہنوں کی صحیح رہنمائی، ہدایت ربانی اور مذہبی تعلیمات ہی فراہم کر سکتی ہیں۔ مادی اور سائنسی ترقیاں انسانیت کے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتی ہیں۔ وہ مذہب ہی ہے جو انسان کو محبت و مروت، عدل و انصاف اور ہمدردی و غم خواری کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے مولانا کا خیال تھا کہ مذہب کا صحیح تصور سب سے پہلے لوگوں کے سامنے آنا چاہیے۔ مولانا کے یہاں مذہبی تصور ایک آفاقی اور عالمگیر تصور ہے۔ وہ جس توحید کے داعی تھے اس میں دنیا کے سارے انسانوں کا معبود ایک ہے اور ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے، جس میں کسی طرح کی قومی، نسلی اور علاقائی تفریق نہیں ہے۔ مولانا ترجمان القرآن میں کہتے ہیں:

"صرف ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا ہے اور وہ خدا پرستی کا مقدس رشتہ ہے۔ تم کتنے ہی الگ ہو گئے لیکن تمہارے خدا الگ الگ نہیں ہو سکے۔ تم سب ایک ہی پروردگار کے بندے ہو۔ تم سب کی بندگی و نیاز کے لیے ایک ہی معبود کی چوکھٹ ہے۔ تمہاری کوئی نسل ہو، تمہارا کوئی وطن ہو، تمہاری کوئی قومیت ہو، تم کسی درجے میں اور کسی حلقے کے انسان ہو، جب ایک ہی پروردگار کے آگے سر نیاز جھکا دو گے تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے تمام ارضی اختلافات مٹا دے گا، تم سب کے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جڑ جائیں گے۔ تم محسوس کرو گے کہ تمام دنیا تمہارا وطن ہے، تمام نسل تمہارا گھرانہ ہے اور تم سب ایک رب العالمین کی عیال ہو۔"

اتحاد و یکجہتی کی دعوت:

دنیا کے سارے مذاہب محبت، اتحاد اور بھائی چارہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ انسانوں کے درمیان رنگ و نسل، ذات پات اور علاقہ و خطہ کی بنیاد پر کسی طرح کا فرق و امتیاز، تعصب و استحصال اور ظلم و جبر جائز نہیں ہے۔ انسانوں کے درمیان اتحاد و باہمی یکجہتی کے قرآنی تصور کو مولانا آزاد اس طرح بیان کرتے ہیں:

" قرآن کہتا ہے: دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں ہوا ہے جس نے ایک دین پر اکھٹے ہونے اور تفرقہ و

اختلاف سے بچنے کی تعلیم نہ دی ہو۔ سب کی تعلیم یہی تھی کہ خدا کا دین بچھڑے ہوئے انسانوں کو جمع کر دینے کے لیے ہے، الگ الگ کر دینے کے لیے نہیں۔ پس ایک پروردگار عالم کی بندگی و نیاز میں سب متحد ہو جاؤ اور تفرقہ و مخاصمت کی جگہ باہمی محبت و یک جہتی کی راہ اختیار کرو۔"

اسلام سے متعلق غلط فہمی کا ازالہ:

اسلام امن و شانتی کا مذہب ہے۔ نہ وہ کسی پر ظلم کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور نہ ظلم برداشت کرنے کو پسند کرتا ہے۔ عام طور پر اسلام اور مسلمانوں کے متعلق یہ غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا اور مسلمان جنگ و قتال کو پسند کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ جہاں ایک طرف یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹے پروپیگنڈہ کیے جاتے ہیں وہیں دوسری جانب اسلامی موقف کی صحیح تفہیم کا نہ ہونا ہے۔ مولانا آزاد نے رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے حوالے سے اسلام کے موقف کی نہایت عمدہ طریقے سے وضاحت کر دی ہے:

"مکہ میں جب پیغمبر اسلام کی دعوت کا ظہور ہوا تو قدرتی طور پر دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک ان لوگوں کا تھا جنہوں نے یہ دعوت قبول کی۔ دوسرا تمام قوم اور اس کے سرداروں کا جو اس کے مخالف تھے۔ غور کرو دونوں میں بنائے نزاع کیا تھی۔ پیروان دعوت حق کہتے تھے انہیں حق ہے کہ جس بات کو درست سمجھیں اختیار کریں۔ مخالف کہتے تھے انہیں یہ حق حاصل نہیں یعنی وہ انسان کے اعتقاد و ضمیر کی آزادی تسلیم نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے بزور شمشیر مسلمانوں کو ان کے اعتقاد سے پھرا دیں۔ پیغمبر اسلام نے تیرہ برس تک ہر طرح کے مظالم برداشت کیے۔ آخر جب مکہ میں رہنا دشوار ہو گیا تو مدینہ چلے آئے لیکن قریشِ مکہ نے یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا پے در پے حملے شروع کر دیے۔ اب پیغمبر اسلام کے سامنے تین راہیں تھیں (الف) جس بات کو حق سمجھتے ہیں اس سے دستبردار ہو جائیں (ب) اس پر قائم رہیں مگر مسلمانوں کو قتل ہونے دیں (ج) ظلم و تشدد کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور نتیجہ خدا کے ہاتھ چھوڑ دیں۔ انہوں نے تیسری راہ اختیار کی اور نتیجہ وہی نکلا جو ہمیشہ نکل چکا ہے۔ یعنی حق فتح مند ہوا اور ظالموں کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ قرآن نے جس لڑائی کو جائز رکھا، اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

قانون فطرت کی یکسانیت:

اللہ تعالیٰ نے تمام اقوام عالم کے لیے کامیابی و کامرانی اور ناکامی و نامرادی کا پیمانہ ایک ہی رکھا ہے۔ لہذا یہ قانون فطرت ہے کہ سیدھا راستہ اختیار کرنے والے کامیاب و کامران ہوتے ہیں اور نافرمانی کرنے والے ناکام و نامراد ہوتے ہیں۔ مولانا کہتے ہیں:

"انقلاب حالت کے تمام مظاہر فی الحقیقت انہی قوانین الہیہ اور نوامیس فطرت کے ماتحت ہیں جنہیں فاطر السمٰوات والارض نے اس عالم کے نظام و قوام کے لیے روز اول ہی سے مقرر کر دیا ہے۔ پھر جن افراد و

اقوام نے ان قوانین کے مطابق راہِ امید اختیار کی ان کے لیے امید کی زندگی، اور جنہوں نے اس سے رو گردانی کی ان کے لیے نامرادی و ناکامی کی مایوسی ہے۔ قانون جرم کی سزا دیتا ہے۔ مجرم کو جرم کرنے پر مجبور نہیں کرتا پس شکایت کار ساز قدرت کی نہیں بلکہ خود اپنی ہونی چاہیئے۔ خدا نے امید کا دروازہ کسی پر بند نہیں کیا اور زمین کی وراثت کسی ایک قوم کو ورثہ میں نہیں دے دی۔ اس نے پھول اور کانٹے دونوں پیدا کیے۔ اگر ایک بدبخت کانٹوں پر چلتا ہے مگر پھول دامن میں جمع نہیں کرتا تو اسے اپنی محرومی پر رونا چاہیئے۔ باغباں کا کیا قصور؟۔"

اعمال کا منصفانہ بدلہ:

دنیا کی زندگی دار العمل ہے۔ اس کار گاہ عمل میں انسان کو بہترین عمل کرنے کے امتحان میں ڈالا گیا ہے۔ جو جیسا عمل کرے گا اس کو ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا۔ اس لیے ہر شخص کو اپنے اعمال کی فکر کرنی چاہیے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"قانونِ الٰہی یہ ہے کہ ہر فرد اور جماعت کو وہی پیش آتا ہے جو اس نے اپنے عمل سے کمایا ہے۔ نہ تو اس کی نیکی دوسرے کو بچا سکتی ہے نہ ایک بد عملی کے لیے دوسرا جواب دہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تم اپنی خبر لو اور اپنے اعمال درست کرو۔"

مولانا کے ان مذہبی خیالات کو جہاں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور حسب حال استفادہ کرتا ہے وہیں ایک گروہ نے ان کے بعض مذہبی رجحان خاص طور پر اسلامی تعلیمات کو جدید تناظر میں سمجھنے کی ان کی کوشش پر بے اطمینانی کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا نے اپنی تفسیر میں اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ قرآن مجید میں جو بات جس طرح بیان ہوئی ہے اسے اسی طرح پیش کر دیا جائے۔ مثلاً سورہ فاتحہ کی آیت "اھدنا الصراط المستقیم" کی تشریح میں مولانا کی عبارت سے ایسا لگتا ہے کہ صرف عمل صالح سے نجات ممکن ہے شریعت محمدی کی اتباع ضروری نہیں ہے۔ جب کہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ عمل صالح سے مراد شریعت محمدی ہے اس لیے اس پر ایمان و عمل کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی ہے۔ حالاں کہ مولانا کا عقیدہ وہی ہے جو عام مسلمانوں کا ہے کہ حضرت محمدؐ کی بعثت اور نزول قرآن کے بعد آخرت میں نجات کا دارومدار صرف شریعت محمدی کی پیروی اور قرآن مجید کی اطاعت پر ہے۔ جیسا کہ سورہ فاتحہ ہی کی آیت "ایاک نعبد" کی تشریح میں مولانا نے لکھا ہے کہ:

"اسلام کی تعلیم کے بنیادی کلمہ میں توحید کے ساتھ پیغمبر اسلام کی اطاعت کا اعتراف بھی کیا گیا ہے جو اس کی اصل و اساس ہے۔ لہٰذا کوئی شخص دائرہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ خدا کی توحید کے ساتھ پیغمبر اسلام کی بندگی اور رسالت کا بھی اقرار نہ کر لے۔"

تفسیر ترجمان القرآن میں مولانا کا سب سے زیادہ منفرد اور متنازعہ فی نظریہ "تصور وحدت دین" ہے یعنی یہ نظریہ کہ نسلی و تہذیبی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر دین سب کا ایک ہی ہے جو ساری انسانیت کے لیے آیا ہے۔ یہ تصور پوری وضاحت اور دلائل

کے ساتھ پہلی مرتبہ مولانا نے سورہ فاتحہ میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہر زمانہ میں دین یا مذہب سب کا ایک ہی رہا ہے البتہ شریعت مختلف زمانوں میں معاشرتی حالات اور ضروریات کے مطابق بدلتی رہی ہے۔"مولانا اخلاق حسین قاسمی نے اپنی تصنیف "مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت "میں اس پر اعتراض کا تشفی بخش جواب فراہم کر دیا ہے۔

مولانا آزاد پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ انہوں نے ترجمان القرآن میں بعض آیات کی تشریح وتوضیح خاص کر معجزات سے متعلق متعدد آیات کی تفسیر جمہور علماء کی رائے سے مختلف کی ہے۔ ذیل میں ان میں سے چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔(1) یوم سبت کی بے حرمتی کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو عذاب کے طور پر بندر بنا دیا گیا تھا۔ مولانا کا کہنا ہے کہ یہاں بندر بنانے سے مراد یہ ہے کہ بندر کی طرح ذلیل ورسوا کر دیا گیا یعنی ان کے دل مسخ ہو گئے تھے جب کہ جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے صورتوں کا مسخ جانا مراد ہے۔ (2)حضرت سلیمانؑ کے لیے ہواؤں کو مسخر کر دیا گیا تھا۔ مولانا کا خیال ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خشکی کے جانوروں کی طرح سمندر کی ہوائیں بھی ان کے لیے باربرداری اور نقل و حرکت کا کام انجام دیتی تھیں جب کہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ ہوائیں باقاعدہ ان کے تابع و فرمان تھیں۔(3)مولانا کی رائے ہے کہ حضرت زکریا اپنے بیٹے حضرت یحیی کی پیدائش سے تین دن پہلے گونگے نہیں ہو گئے تھے بلکہ انہیں خاموشی کے روزے کا حکم تھا۔ جمہور کے نزدیک وہ واقعی بات چیت پر قادر ہی نہیں رہ گئے تھے۔ وغیرہ ۔

ترجمان القرآن میں اس قسم کی مثالیں اور بھی ہیں یہاں ان کا احاطہ مقصود نہیں ہے بلکہ بتانا یہ ہے کہ مولانا نے دراصل آیات کی تشریح وتفہیم میں قرآنی اسلوب کی پیروی کی ہے اور کامل غور وفکر کے بعد مختلف آیات کا مفہوم متعین کیا ہے۔ شاید اس لیے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ انہوں نے جمہور کی رائے سے ہٹ کر تفسیر بالرائے سے زیادہ کام لیا ہے۔

6.8 مولانا آزاد کے مذہبی افکار کی عصری معنویت

مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کو جو قبول عام ہندوستانی مسلم سماج میں حاصل ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا۔ حالانکہ انہوں نے اپنی تفسیر کے ذریعہ علم و تحقیق کی روشنی میں جو افکار وخیالات پیش کیے ہیں وہ مسلمانوں کی اصلاح، اسلام کے دفاع اور ملک وملت کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت پیش کیے۔ اس کے باوجود وہ مقبولیت اور پذیرائی نہ ملی جو اس کا حق تھا۔ مسلمانوں کی اس بے اعتنائی کا احساس خود مولانا کو بھی تھا چنانچہ ترجمان القرآن جلد دوم کی اشاعت کے موقع پر انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا کہ "زمانہ اس کام کا اندازہ شناس ہو یا نہ ہو، مگر مؤلف نے زمانے کی حالت کا پوری طرح اندازہ کر لیا ہے اور اس پر قانع ہے، جو کچھ طلب ہے استفادہ و عمل کی ہے، اعتراف وتحسین کی نہیں۔"مولانا غلام رسول مہر مولانا آزاد کے اس احساس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "مولانا کو زندگی میں بھی یہ احساس رہا کہ بے شک لوگوں نے "ترجمان "کو پڑھا اور پسند کیا، لیکن اصل کام کی نوعیت وحیثیت کا اندازہ نہیں کیا جا سکا ۔ملک میں دو گروہ تھے، جن سے اس باب میں خوش گوار امیدیں وابستہ کی جا سکتی تھیں، اول علماء، دوم جدید تعلیم یافتہ لوگ۔ مولانا خود فرماتے ہیں کہ پہلا گروہ قدیم راہوں سے آشنا ہے اور نظر وتدبر کے نئے تقاضوں سے آشنا نہیں۔ دوسرا گروہ نئے تقاضوں کی تشنگی

رکھتا ہے اور قدیم راہوں سے آشنا نہیں ، نیز اس منزل کی مشکلات سے بے خبر ہے۔ ایسی حالت میں علمی نوعیت کا اندازہ شناس نہ تو پہلا گروہ ہو سکتا ہے، نہ دوسرا اور تیسرا گروہ مفقود ہے۔"

اس عدم توجہی کی ایک وجہ تو شاید یہ ہے کہ مولانا کی شخصیت اتنی ہمہ گیر تھی کہ ان کے سیاسی کارناموں کے مقابلے میں ان کی دوسری خدمات کا تذکرہ نسبتاً کم ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مولانا نے اپنے افکار و نظریات کی اشاعت کے لیے باقاعدہ کوئی جماعت یا ادارہ قائم نہیں کیا ۔ جیسا کہ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"مختلف اصحاب اپنے علوم و معارف کی ترتیب و اشاعت کے لیے ادارے قائم کر گئے ، جن میں سے بعض اداروں نے اب خانقاہی مسندوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ مولانا نے خدا جانے ایسے کتنے اداروں کے لیے شاہانہ امداد و اعانت کا بندوبست کیا، مگر بہترین مواقع کے باوجود اپنے لیے کسی ایسے ادارے کی بنیاد نہ رکھی۔ بے نفسی، حسن کردار، اور اخلاص کی ایسی ایمان افروز نظیریں ہر جگہ نظر نہیں آسکتیں۔"

بہر حال ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی حلقوں کی جانب سے مولانا کی مذہبی فکر اور قرآنی بصیرت سے بے رخی مایوس کن ہے کیونکہ مولانا آزاد کا تعلق یقیناً مذہبی طبقے ہی سے تھا اور انہوں نے جو کچھ لکھا مذہبی خدمت کے جذبہ کے تحت ہی لکھا۔ حالانکہ یہی طبقہ اکثر مولانا آزاد کی سیاسی حیثیت پر سرکاری حلقوں کی بے توجہی پر شکوہ تو کرتا رہتا ہے لیکن اس نے کبھی خود مولانا کے ساتھ اپنے رویے کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی کہ کیا انہوں نے مولانا کے مذہبی افکار و نظریات کو ہندوستانی مسلم سماج میں عام کرنے کی کوشش کی ہے ؟ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم مدارس کے ذمہ داران دیگر تفاسیر کی طرح تفسیر ترجمان القرآن کو بھی نصاب میں شامل کریں تاکہ طلبا واساتذہ مولانا آزاد کی مذہبی بصیرت سے استفادہ کر کے عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کر سکیں۔ اس لیے کہ مولانا نے ہندوستان کے حالات اور ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے قران مجید کی آیات کی ایسی توضیح و تشریح کی ہے جو اسلامی تعلیمات کے مطابق بھی ہے اور ہندوستانی مزاج سے ہم آہنگ بھی ۔ علی اشرف صاحب اپنے مضمون مولانا ابو الکلام آزاد اور ترجمان القرآن میں اس خصوصیات کے تعلق سے لکھتے ہیں :

"پچھلی دو صدیوں میں ہندوستان میں جو تفسیریں لکھی گئی ہیں، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا اہم مقام ہے۔ سر سید احمد خان کی تفسیر قرآن کے بعد اردو میں یہ دوسری کتاب ہے جس نے ہندوستان کے حالات اور جدید ہندوستانی ضرورتوں اور اس کے مسلم اقدار کو سامنے رکھ کر قرآن کے مطالب کو قاری کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔"

بلاشبہ مولانا آزاد ہندوستان کے عظیم قومی رہنما ہیں ۔ اگرچہ ان کی خدمات کے اعتراف میں ملک میں متعدد عمارتیں اور ادارے ان کے نام سے منسوب ہیں لیکن مولانا کے افکار و نظریات جو ہندوستانی قومیت کی اصل بنیاد ہیں اگر انہیں عام نہ کیا گیا تو یہ نہ صرف ہندوستان کا بلکہ انسانیت کا نقصان ہو گا۔ اس لیے عصر حاضر میں ہندوستان میں مولانا آزاد کے افکار و خیالات کو ان کی معنویت کے پیش نظر

عام کرنے کی ضرورت ہے۔

6.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مولانا ابو الکلام آزاد ہندوستان کے ایک ایسے مسلم رہنما ہیں جو مختلف الجہات صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی علمی، عملی اور فکری خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں ان کی بے نظیر تفسیر ترجمان القرآن بھی ہے۔
- مولانا کا قرآن مجید کے ساتھ خاص تعلق اور گہری وابستگی تھی ۔ان کی علمی و فکری پختگی، شعور اور ژرف نگاہی ان کی گہری قرآن فہمی کی عطا تھی، جس سے انہوں نے زندگی کے ہر معاملہ میں رہنمائی، تحریک اور روشنی حاصل کی۔
- مولانا نے اپنی اس قرآن فہمی کو محض وعظ و نصیحت کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اس کے ذریعہ وہ لوگوں کی زندگی اور فکر میں ایک انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ مسلمانوں کی اصلاح، اسلام کے دفاع اور ملک و ملت کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت لکھا ہے۔
- مولانا نے یقینی طور پر قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے کی تمام تر سابقہ کوششوں کے گہرے اور تجزیاتی مطالعہ کے بعد اپنا ایک علاحدہ تفسیری منہج اختیار کیا جس میں اجتہادی جدت بھی ہے اور اسلاف کے طریقے کا پاس و لحاظ بھی۔ ان کی اسی قرآنی بصیرت کا عظیم تفسیر کارنامہ ترجمان القرآن ہے۔
- ترجمان القرآن ویسے تو مولانا آزاد کی حیات ہی میں شائع ہو گئی تھی، لیکن ان کی وفات کے بعد ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے اسے حواشی اور دیگر تصحیحات کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا غلام رسول مہر نے مولانا کی تحریروں سے استفادہ کرتے ہوئے قران مجید کی ان سورتوں کی آیات کے ترجمہ و تشریح کو جو ترجمان القرآن میں نہیں ہیں "باقیات ترجمان القرآن" کے نام سے شائع کیا ہے اور مولانا ابو مسعود اظہر ندوی نے "تلخیص ترجمان القرآن" کے نام سے شائع کی ہے۔
- مولانا نے ترجمان القرآن میں سورہ فاتحہ کی نہایت تفصیلی تفسیر تحریر کی ہے۔ اس میں صفات باری تعالی کے قرآنی تصور اور سورہ فاتحہ میں مذکور تینوں صفات ربوبیت ، رحمت اور عدالت پر بہت ہی مؤثر اور محققانہ بحث کی ہے نیز قرآن کے بنیادی تصورات توحید، رسالت اور آخرت کی ایسی جامع تشریح و تفسیر بیان کی ہے کہ قرآن کا منشاء و مقصد واضح ہو جاتا ہے۔
- ترجمان القرآن مولانا آزاد کا سب سے بڑا علمی ، فکری اور تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو اسے نہ صرف دوسری تمام تفسیروں سے ممتاز کرتی ہیں بلکہ بعد کے تقریباً سبھی اردو مفسرین کو متاثر کیا ہے ۔ مثلاً مولانا کی ادبی زبان اور اسلوب بیان، طرز استدلال، مجتہدانہ انداز، جدید تحقیقات سے استفادہ اور جدید ذہن کو متاثر و مطمئن کرنے کی ان کی کوشش قابل ذکر ہیں۔
- مولانا آزاد صحیح العقیدہ سچے مسلمان تھے اور شریعت کے بھی سخت پابند تھے۔ ان کی بہت سی تحریریں ہیں جن سے ان کے مذہبی

تصورات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سر فہرست تفسیر ترجمان القرآن ہے جس کے ذریعہ جدید زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق انہوں نے مسلمانوں کی دینی و مذہبی رہنمائی کی ہے۔

- ہندوستان کے حالات اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا نے قرآن مجید کی آیات کی جو تشریح اور توضیح کی ہے اس کی بڑی معنویت ہے۔ اس لیے عصر حاضر کے ہندوستان میں مولانا آزاد کے افکار و نظریات کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔

7.10 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
خطیب	:	خطبہ پڑھنے والا، مقرر، واعظ
صعوبت	:	مصیبت، دشواری، تکلیف
اجتہاد	:	کوشش، جدوجہد
دارالارشاد	:	تقریر کرنے کی جگہ
مجتہد	:	کوشش کرنے والا، جدوجہد کرنے والا
اتالیقی	:	تعلیم و تربیت، ادب آموزی
اتباع	:	پیروی، پابندی، تقلید
معجزات	:	معجزہ کی جمع، وہ کام جو طاقت بشری سے باہر ہو
اعانت	:	مدد، سہارا
اعتقاد	:	عقیدمت مندی، پختگی سے کوئی بات دل میں ہونا

6.11 نمونۂ امتحانی سوالات

6.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کی تفسیر کا نام کیا ہے؟
2. رسالہ الہلال کس نے جاری کیا؟
3. مولانا کی وفات کے بعد کس ادارہ نے ترجمان القرآن کو شائع کیا؟
4. "باقیات ترجمان القرآن" کے مصنف کا نام کیا ہے؟
5. مولانا آزاد نے سب سے تفصیلی تفسیر کس سورہ کی لکھی ہے؟
6. ترجمان القرآن مولانا کی حیات میں کتنی جلدوں میں شائع ہوئی تھی؟

7. ترجمان القرآن کی پہلی جلد سب سے پہلے کس سنہ میں شائع ہوئی؟
8. ترجمان القرآن میں سورہ فاتحہ کے علاوہ سب سے طویل تفسیر کس سورہ کی ہے؟
9. تفسیر ترجمان القرآن کس زبان میں ہے؟
10. ساہتیہ اکیڈمی سے شائع شدہ ترجمان القرآن پر پیش لفظ کس نے لکھا ہے؟

6.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. ترجمان القرآن کا جامع تعارف پیش کیجیے۔
2. مولانا آزاد کی تفسیر سورہ فاتحہ پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. مولانا آزاد کے مذہبی افکار کی عصری معنویت پر روشنی ڈالیے۔
4. ترجمان القرآن کی اشاعت کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
5. مولانا آزاد کی مذہبی زندگی پر لوگوں کی آرا کا تجزیہ کیجیے۔

6.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کے مذہبی تصورات تفصیل سے لکھیے۔
2. تفسیر ترجمان القرآن کی خصوصیات بیان کیجیے۔
3. مولانا آزاد کی حیات اور قرآنی بصیرت پر ایک مضمون لکھیے۔

6.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. ترجمان القرآن	مولانا ابو الکلام آزاد
2. تصورات قرآن	مولانا ابو الکلام آزاد
3. مولانا ابو الکلام آزاد۔ مذہبی افکار، صحافت اور قومی جدوجہد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی
4. مولانا ابو الکلام آزاد سیرت و شخصیت اور علمی اور عملی کارنامے	مولانا سعید احمد اکبر آبادی
5. مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت	اختر الواسع، فرحت احساس
6. مولانا ابو الکلام آزاد کی قرآنی خدمات	افضل حق قریشی
7. مولانا آزاد کے مراسلات کا کیلنڈر	سید محمد عزیز الدین حسین

اکائی 7: مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات

اکائی کے اجزا

7.0		تمہید
7.1		مقاصد
7.2		مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات
7.3		مولانا آزاد بحیثیت وزیر تعلیم
	7.3.1	اعلیٰ تعلیم
	7.3.2	اسکولی تعلیم
	7.3.3	مذہبی تعلیم (مدرسہ تعلیم)
	7.3.4	سماجی تعلیم (تعلیم بالغان)
	7.3.5	تعلیم، تہذیب و ثقافت سے وابستہ ادارے
7.4		اکتسابی نتائج
7.5		کلیدی الفاظ
7.6		نمونہ امتحانی سوالات
	7.6.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	7.6.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	7.6.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
7.7		تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

مولاناابوالکلام آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔انھوں نے اس منصب کو سنبھالنے کے بعد تعلیمی نظام کو سنوارنے اور استوار کرنے، تعلیم کو فروغ دینے اوراس کے معیار کو بلند کرنے اوراسے قومی رنگ وآہنگ عطا کرنے کے لیے جو کوششیں کی وہ اپنی مثال آپ ہیں۔انہوں نے تعلیم کو قومی حالات وروایات کے تناظر میں دیکھااور ملک کے مفادات کے تحت اس کی اہمیت اوراس کے عصری

تقاضوں کو سمجھا۔ وہ تعلیم میں گیرائی اور گہرائی دونوں لانا چاہتے تھے۔ ان کے عہد وزارت میں تعلیمی منصوبہ بندی کی ابتدا ہوئی اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام عمل میں آیا۔ وہ تعلیم کا ایک جامع اور ارفع تصور رکھتے تھے۔ ان کی رہ نمائی اور دلچسپی کی بدولت اعلیٰ تعلیم میں سائنسی اور ثقافتی ترقی پر زور دیا گیا۔ کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے زیر اہتمام متعدد نیشنل لیبارٹریز قائم کی گئیں۔ اس طرح سائنس اور سائنسی تحقیق کو خصوصی طور پر فروغ حاصل ہوا۔ وہ فنون لطیفہ کے بغیر نظام تعلیم کو مکمل نہیں سمجھتے تھے۔ وہ خود فنون لطیفہ کے شیدائی تھے۔ ان کی دلچسپی اور توجہ سے ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی اور سنگیت ناٹک اکادمی جیسے ثقافتی اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ انہوں نے اپنے خاص تعلیمی تصورات کے تحت جن میں قدیم اور جدید اخلاق اور سائنس کا امتزاج پایا جاتا تھا تعلیمی نظام کی تنظیم نو کی اور تعلیم کو قومی مقاصد کے حصول کا وسیلہ بنانے کی بھرپور کوشش کی۔

اس اکائی میں ہم مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات کا مطالعہ کریں گے۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال سکیں۔
- مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات کے بنیادی عناصر ترکیبی کی وضاحت کر سکیں۔
- مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات کے مقاصد بیان کر سکیں۔
- سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کے بارے میں مولانا آزاد کے تصورات کی وضاحت کر سکیں۔
- فنون لطیفہ کی تعلیم کے بارے میں مولانا آزاد کے خیالات پر روشنی ڈال سکیں۔
- اسکولی تعلیم، اعلیٰ تعلیم اور مذہبی تعلیم کے بارے میں مولانا آزاد کے نقطہ نظر کا جائزہ لے سکیں۔
- تعلیم بالغان کے بارے میں مولانا کے نظریے کی وضاحت کر سکیں۔

7.2 مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات

مولانا ابوالکلام آزاد بے پناہ علم و ذہانت کے مالک نابغہ روزگار شخصیت، اپنے وسیع علم و معلومات، انسانی تاریخ کے گہرے مطالعہ، مذاہب اور فلسفوں کے عمیق شعور اور تفکر و تدبر کی حیرت انگیز صلاحیتوں کی بدولت وانسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں کے مسائل سے اپنی ایک مجتہدانہ رائے رکھتے تھے جن میں تعلیم بھی شامل ہے۔ اگرچہ مولانا آزاد نے اپنے تعلیمی تصورات کی وضاحت میں کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن مذہب، سیاست اور ادب سے متعلق ان کی تحریروں، تقریروں اور بحیثیت مرکزی وزیر تعلیم ان کی تعلیمی و ثقافتی پالیسیوں اور اقدامات سے ان کے تعلیمی تصورات کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔ رسالہ "آج کل" بابت اپریل 1959 میں جناب خواجہ غلام السیدین نے "مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلیمی فلسفہ" کے عنوان سے نہایت عالمانہ مضمون لکھا تھا جس میں انہوں نے مولانا آزاد کے تعلیمی

تصورات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ذیل کی سطور میں اسی مضمون سے اخذ واستفادہ کرکے مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا آزاد کا شمار ہندوستان کے ممتاز ماہرین تعلیم کی اس صف میں ہوتا ہے جس میں رابندر ناتھ ٹیگور، سروے پلی رادھا کرشن، ساوتری بائی پھولے اور اے۔پی جے عبد الکلام شامل ہیں۔ماہر تعلیم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک تو وہ جو تعلیم کے اصولوں اور نظریوں کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں اور تعلیمی اداروں میں اس کا عملی تجربہ حاصل کرتے ہیں۔ان کو تعلیم کا فنی ماہر سمجھا جاسکتا ہے۔دوسری طرح کے ماہر تعلیم وہ لوگ ہیں جو فلسفہ، مذہب، سیاست وغیرہ میں گہری نظر رکھتے ہیں جو جانتے ہیں کہ دنیا میں انسان کا صحیح مقام کیا ہے۔یہ لوگ زندگی کو نئی قدروں اور سمتوں سے روشناس کرتے ہیں۔ان کے ذہن میں بہتر افراد اور بہتر سماج اور بہتر ملک کا ایک خاص تصور ہوتا ہے۔اس طرح کے افراد کی تربیت اور بہتر سماج اور بہتر ملک کی تعمیر کے لیے وہ تعلیم کو موثر وسیلہ بنانا چاہتے ہیں۔جو تعلیم کے ذریعہ عام آدمی اور پوری قوم کی تقدیر کو سنوارنا چاہتے ہیں۔مولانا آزاد کا شمار انھیں عصر آفریں ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے۔وہ رائج الوقت نظام تعلیم کی خامیوں اور کوتاہیوں سے خوب واقف تھے۔وہ ان خرابیوں کو دور کرکے ایسا نظام تعلیم نافذ کرنا چاہتے تھے جو ہمارے ملک کی ضرورتوں، عصری تقاضوں اور قومی مقاصد کی تکمیل کرسکے۔جس کے ذریعے سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی تو ہو لیکن فرد اور سماج پر مغرب جیسی مادیت پرستی کا غلبہ نہ ہو بلکہ اس میں مشرق کی روحانی اور اخلاقی اقدار کی نشو ونما ہو۔وہ ایسے نظام تعلیم کے خواہاں تھے جس کے تحت تعلیمی اداروں سے ایسے افراد ڈھل کر نکلیں جن کی ذات میں بلند نظری، جرات، رواداری اور دیانت داری کے چراغ روشن ہوں اور ان کے ذریعہ ایک ایسے سماج کی تشکیل ہو جس میں انصاف، محبت، فراخدلی، رواداری اور معقولیت پسندی کا چلن ہو۔مولانا آزاد اپنی تقریروں میں بار بار اس نکتے پر زور دیا اور کہا کہ ہمارے پنج سالہ منصوبوں کا مقصد مادی وسائل اور ذرائع کی توسیع اور ان کا بہتر استعمال نہیں بلکہ نیا ذہن اور نئی سیرت پیدا کرنا ہے اور اس کے لیے صنعت وحرفت، تجارت اور زراعت بجلی اور پانی سے بھی زیادہ ضروری صحیح تعلیم کا رواج ہے۔

مولانا آزاد اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر تھے کہ مغرب اور مشرق کی فکر میں بعض پہلوؤں سے بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔مغرب نے نظر اٹھا کر خارجی ماحول کو دیکھا۔اس نے سائنس کے علمی مزاج کی قدر کی اور اس کی بے اندازہ قوت پر ایمان لایا۔اس نے تقدیر پرستی کا شیوہ اختیار نہیں کیا بلکہ سائنس کو رہنما بنا کر سماج کی تعمیر نو کے لیے زبردست جدوجہد کی اور سائنس، صنعت وحرفت اور سماجی ترقی میں پیش پیش ہے۔اس کے برخلاف مشرق نے نظر جھکا کر اپنے اندر نگاہ ڈالی۔جہاں اسے انسان کی روحانیت اور باطنی حقیقت کا جلوہ نظر آیا۔لیکن مشرق نے اس مقام پر ٹھوکر بھی کھائی۔اس نے انسان کے بلند مقام کو پہچانا لیکن اس کے ذہن کو تقدیر پرستی کے بندھنوں سے آزاد نہیں کیا جس کی وجہ سے مدتوں تک اس کی مادی اور سماجی ترقی مسدود ہو کر رہ گئی اور وہ سیاسی سماجی اور اقتصادی پسماندگی کا شکار ہو گیا۔مولانا آزاد مادہ پرستی اور تقدیر پرستی دونوں کے قائل نہیں تھے۔

مولانا کے تعلیمی فلسفہ کا بنیادی خیال یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے نظریوں میں میل پیدا کیا جائے تاکہ انسان سائنس کا صحیح استعمال کرنا سیکھے اور اس کے ذریعے ان مقاصد کو حاصل کرسکے جو اس کی فطرت کے بہترین تقاضوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔سائنس اور

ٹکنالوجی ایک طاقت ہے جو اپنی ذات سے غیر جانبدار ہے۔ اس کی ایجادات وانکشافات کو تعمیر اور تخریب، آبادی اور بربادی دونوں کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ انسان کون سا راستہ اپناتا ہے، زندگی کا یا موت کا، انصاف اور رحم کا یا ظلم اور خود غرضی کا، یہ اس کی ذہنیت اور نیک وبد کے تصور پر منحصر ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے ذریعے اس کے انداز فکر و نظر اور معیار خیر وشر کو بدلا جائے۔ اور وہ ہر آرزو سے پہلے یہ سوچے کہ سوال آرزو کے پورا ہونے کا نہیں بلکہ آرزو کے مثبت اور صالح ہونے کا ہے۔

مولانا آزاد کا ماننا تھا کہ اگر انسان محض ایک ترقی یافتہ حیوان بن جائے تو وہ سائنس کی قوتوں کے ذریعے صرف انھیں اغراض و مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جن کی بنیاد اس کے حیوانی جذبات اور جبلتوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے برخلاف اگر اس کے ذہن میں یہ بات راسخ کر دی جائے کہ وہ کوئی غیر ذمہ دار اور لذت پرست وجود نہیں بلکہ اس کی ایک روحانی حقیقت بھی ہے۔ اس کا رشتہ اپنے خالق ومالک سے جڑا ہوا ہے اور وہ خدا کا نائب ہے۔ اس حقیقت کے ادراک کے بعد وہ سائنس کو بھی مشیت الٰہی کی تکمیل کا وسیلہ بنائے گا۔ وہ کوشش کرے گا سائنس کے ذریعے دنیا میں امن وسلامتی اور انسان دوستی کا ماحول پیدا ہو۔ اسی تناظر میں مولانا آزاد کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مشرق اور مغرب کے تعلیمی فلسفوں کو ایک وسیع تر تصور میں جمع کر کے ایک ایسے متوازن اور کامل نظام تعلیم کی بنیاد ڈالی جائے جو افراد اور سماج کے مطالبات میں ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ اگر افراد کی شخصیت میں وحدت، ہم آہنگی اور یک جہتی نہ ہو گی تو اس کا اثر معاشرے پر پڑے گا اور سماج میں باہمی اختلافات پرورش پاتے رہیں گے۔ تعلیم کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ایک صالح اور مربوط سماج کے لیے ایسے افراد کی تربیت کرے جن کی شخصیت ہم آہنگ اور مربوط ہو۔

چونکہ مولانا آزاد کے ذہن وفکر اور ان کی شخصیت پر مذہب کا گہرا اثر تھا اس لیے وہ ایک صالح دیانت دار اور دین دار زندگی کی بنیاد مادی خوش حالی کی سرزمین میں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ اس خوش حالی کو کسی خاص جماعت یا گروہ کی میراث نہیں بلکہ سارے لوگوں کا حق مانتے تھے۔ اس لیے ان کے تعلیمی تصور میں مذہب، سائنس، ادب، فلسفہ، ٹکنالوجی، سب کے لیے جگہ تھی۔ یہ وسعت نظر، یہ ہمہ گیری، کثرت میں وحدت کو دیکھنے کی یہ نظر اور وحدت میں کثرت کی اہمیت کا یہ احساس مولانا آزاد کی فکر کے ہر گوشے میں پایا جاتا ہے۔ ان کی نظر میں ادب، آرٹ، سائنس، فلسفہ کی اس دنیا کی ایک امتیازی اور حسین خصوصیت یہ ہے کہ وہ جنگ وجدل کی دنیا نہیں صلح اور میل جول کی دنیا ہے۔

آزادی سے قبل مغربی تعلیم کو اپنانے کا مسئلہ لمبی مدت تک ہندوستانیوں میں زیر بحث رہا۔ ابتدا میں مذہبی خیالات کے حامل لوگوں نے مغربی تعلیم کی سخت مخالفت کی۔ حصول آزادی کے بعد بعض لوگوں نے قومیت کے اندھے جوش میں مغربی تعلیم کو سرے سے ختم کرنا چاہا۔ لیکن ہر موقع پر مولانا آزاد نے اس مسئلے میں ایک متوازن رویہ رکھا۔ جو تنگ نظری سے پاک تھا۔ ان کے نزدیک غلامی کے دور میں انگریزوں کی جو اندھی نقالی ہو رہی تھی وہ بھی اتنی ہی قابل اعتراض تھی جتنی آزادی کے مغربی علوم اور مغربی زبانوں کی مخالفت کا رویہ۔ انھیں احساس تھا کہ وہ مغربی تعلیم ہی تھی جس نے ہندوستانیوں میں قومی شعور پیدا کیا۔ ان کے ذہنوں کو بیدار کیا اور ان کے ذہنوں سے خرافات کی تاریکی کو دور کر کے جدید علمی اور سائنٹفک سوچ کی بنیاد رکھی۔ لیکن مغربی تعلیم کی وجہ سے نقصان بھی ہوا۔ ایک تو یہ کہ اس کی

وجہ سے ہمارے سماج میں عوام اور خواص کے درمیان دوری پیدا ہوئی دوسرے یہ کہ مغربی تعلیم حاصل کر کے دیس کے نوجوان اپنے قومی ورثے سے بے تعلق ہو گئے۔ اس کے پیش نظر مولانا آزاد نے اس بات پر زور دیا کہ ہماری تعلیم کی روح مشرقی اور ہندوستانی ہونی چاہئے تاکہ نوجوان اپنی تہذیبی قدروں کو سمجھیں اور اس کے سرچشموں سے فیض حاصل کریں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مغربی علوم کی تعلیم کے ذریعے ہندوستانیوں میں سائنٹفک ذہن پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر عصر حاضر کے تقاضوں کی تکمیل اور سماجی خوش حالی ناممکن ہے۔ اسی حقیقت کے مد نظر مولانا آزاد نے جو خود تو مشرقی تعلیم کے پروردہ تھے لیکن انھوں نے انگریزی کی تعلیم پر بعض مغربی تعلیم یافتہ لوگوں سے زیادہ زور دیا۔ وہ جانتے تھے کہ انگریزی زبان سے واقفیت نہ صرف مغربی علوم اور سائنس کے لیے بلکہ بین الاقوامی تعلقات کے لیے بھی کنجی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ترقی کے ہر میدان میں کامیابی کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ صالح سیرت و کردار کے نوجوان دستیاب ہوں اور یہ صرف تعلیم کے ذریعے ممکن ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ہمارا تعلیم کا تصور تخلیقی ہو میکانیکی نہ ہو۔

مولانا آزاد اچھی طرح جانتے تھے کہ ایک موزوں نظام تعلیم کے بغیر قوم کی اصلاح و تعمیر کی کوشش ریت پر عمارت بنانے کے مثل ہو گی۔ انھیں یہ بھی اندازہ تھا کہ اس نظام تعلیم کا نقشہ کیسا ہونا چاہیے کہ وہ پوری قومی زندگی کے بوجھ کو بخوبی سنبھال سکے۔ اس میں مضبوطی اور پختگی لانے کے لیے انھوں نے اس میں پانچ بنیادی عناصر کو جگہ دی جو یہ ہیں:

1۔ 9 سے 12 برس کی عمر کے بچوں کے لیے لازمی تعلیم

2۔ ناخواندہ (ان پڑھ) بالغوں کے لیے سماجی تعلیم (تعلیم بالغان) تاکہ ملک میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوں۔

3۔ ثانوی تعلیم (Secondary Education) اور اعلیٰ تعلیم (Higher Education) کی توسیع کے ساتھ ساتھ ان کے معیار کو بلند کرنا۔

4۔ ملک کی ضرورتوں کی مناسبت سے ٹکنیکل اور سائنٹفک تعلیم کا انتظام کرنا۔

5۔ آرٹ اور فنون لطیفہ کی ترویج۔ یہ بھی مولانا آزاد کی بصیرت مند قیادت اور تعلیمی مہارت کا کارنامہ ہے کہ آزادی کے بعد پہلی مرتبہ آرٹ اور کلچر کو مرکزی وزارت تعلیم کا حصہ بنایا گیا ورنہ انگریزی حکومت کے دوران میں اس کا تعلق محض اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم سے ہی رہا تھا۔ مولانا آزاد نے زور دیا کہ ہمارے تعلیمی نظام کو کلچر اور ثقافت کا ایک وسیع تصور رکھنا چاہیے۔

مولانا آزاد ایک روشن دماغ مفکر تھے۔ ہر قسم کی مشکلات و مسائل کے باوجود ان کے عہد وزارت میں تعلیم کے شعبے میں جو ترقی ہوئی اس سے کوئی مورخ اور نقاد انکار نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اپنی وزارت کے ایڈوائزی بورڈ کی آخری میٹنگ میں اس وقت کی تعلیمی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص بے لاگ انداز میں کہا تھا کہ اگر ہم ان مشکلوں پر غور کریں جن سے ہم گزر رہے ہیں اور دیکھیں کہ ہمارے لیے کیا کرنا ممکن تھا تو ہمیں کسی معذرت کی ضرورت نہیں اور ہم سر اونچا کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا۔ لیکن ایک دور اندیش سالار کارواں کی حیثیت سے جس کی نظر میں صرف ماضی ہی نہیں بلکہ مستقبل بھی تھا، جس کو صرف پیچھے کا طے کیا ہوا راستہ ہی نہیں بلکہ منزل مقصود بھی نظر آتی تھی۔ مولانا نے صاف گوئی سے اعتراف کیا کہ ہمیں جو کچھ کرنا ہے اس کے مقابلے

میں ہم بہت کم کر سکے ہیں۔ منزل تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ مادی اور انسانی وسائل اور بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنے ہدف کو حاصل کر سکیں۔

مولانا نے جس دانش مندی اور خوب صورتی کے ساتھ اپنی فکر کا نقش تعلیم و تربیت کے ہر پہلو پر ثبت کیا اس کا اندازہ محض تعلیمی رپورٹوں اور اعداد و شمار کو دیکھ کر نہیں ہوتا بلکہ یہ سوچ کر ہوتا ہے کہ اُس نازک دور میں اور تاریخ کے اس سخت موڑ پر اگر ان کی دانشورانہ قیادت حاصل نہ ہوئی ہوتی تو ہماری تعلیم اور کلچر کا شعبہ حد درجہ مسخ اور مختلف ہوتا۔ اس سلسلے میں ان کے چند اقدامات اور پالیسیوں کا تذکرہ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے جو یہ ہیں:

- مولانا آزاد نے بالغوں کی تعلیم کے تصور میں وسعت پیدا کی اس میں رنگ بھرا اور اس کا رشتہ جمہوریت اور سائنٹفک مزاج سے جوڑا۔
- مشرقی علوم اور ادب میں ریسرچ کو فروغ دیا۔
- فنون لطیفہ کی ترقی و ترویج کے لیے اکادمیاں قائم کیں تاکہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا تحفظ ہو سکے۔
- ہندی کو راج بھاشا مان لیا گیا تھا اس لیے ہندی میں سائنس کی اصطلاحیں بنانے کا کام بڑے پیمانے پر شروع کیا۔
- ذریعہ تعلیم (Medium of Education) کے مسئلے اور ہندی اور غیر ہندی زبانوں کے جھگڑے کو جس میں عقل کی جگہ جذبات نے لے لی تھی بڑی دانشمندی سے سنبھالا اور لوگوں کو افراط و تفریط کے خطروں سے آگاہ کیا۔
- یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم کر کے نہ صرف اعلیٰ تعلیم کو زیادہ وسائل بخشے بلکہ یونیورسٹیوں کی آزادی کا تحفظ کیا۔
- عورتوں کی تعلیم کو مردوں کی تعلیم سے زیادہ اہم ٹھہرایا کیونکہ اس کے ذریعہ قوم میں نئی زندگی اور نیا شعور بیدار ہو سکتا ہے۔
- ہندوستان میں مذہبی تعلیم کا مسئلہ برسوں سے بحث کا موضوع بنا ہوا تھا۔ مولانا کے دل و دماغ میں اس کی اہمیت کا احساس تھا لیکن ملک کے حالات اور مصلحتوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سرکاری طور پر درس گاہوں میں مذہبی تعلیم کو رائج کرنا درست نہ ہوگا۔ ان کا یہ فیصلہ ان کی فراست اور دور بینی پر مبنی تھا۔ کیونکہ ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں جہاں متعدد مذاہب وعقائد کے ماننے والے رہتے بستے ہیں سرکاری سطح پر کسی قسم کی مذہبی تعلیم کا اہتمام نہ تو مناسب ہے اور نہ ممکن۔
- مولانا آزاد کے دل میں استادوں (Teachers) کے لیے بڑی عزت تھی۔ انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ سماج نے استادوں کو وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک ہم استادوں کے معیار کو بلند نہ کریں ہم تعلیم کے معیار کو بہتر نہیں بنا سکتے۔ اس کے لیے انہوں نے استادوں کی مالی اور سماجی حالت سدھارنے اور عام ذہنی اور اخلاقی معیار کو بلند کرنے کے لیے کچھ ذرائع اختیار کیے لیکن ان کا احساس تھا کہ یہ ہرگز کافی نہیں ہیں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ استادوں کی قدر کرنا قوم کا فرض ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار و خیالات کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے تعلیمی تصورات، ہندوستانی قومیت ،

تہذیب وثقافت، اخلاق و روحانیت، سیکولرازم، معقولیت پسندی، سائنسی مزاج، رواداری، انسان دوستی اور عدل و مساوات جیسے عناصر ترکیبی کے امتزاج سے تشکیل پاتے ہیں۔

ایسے ملک میں جہاں صدیوں سے علم کا ایک محدود تصور چلا آرہا ہو جس کی وجہ سے لوگوں کی ذہنی صلاحیتوں کو زنگ لگ گیا ہو اور زندگی کے تمام شعبوں میں انداز نظر محدود ہو گیا ہو، نئی سوچ اور نیا زاویہ نظر پیدا کرنا لوگوں کے منجمد ذہنوں کو فعال اور متحرک بنانا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے صحافت کے ذریعے سوئے ہوئے ذہنوں کو بیداری کا پیام دیا۔ ان کی ساری زندگی انسانوں کی سیرت کی تعمیر اور کردار سازی میں گزری۔ انہوں نے صحافت کو وسیلہ بنا کر عوام کی ذہنی و فکری نشو نما کا اہم فریضہ انجام دیا۔

مولانا آزاد کے خیال میں مکتب کی بندھی ٹکی تعلیم حصول علم اور جہالت سے نجات کا واحد ذریعہ نہیں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ سوجھ بوجھ اور شعور کی پختگی جو زندگی کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کا سلیقہ بخشتی ہے اور فکر و نظر کو گہرائی اور وسعت بخشتی ہے اس تعلیم سے کہیں زیادہ بہتر ہے جو انسان کی عقل پر روایتوں، توہمات اور رسم و رواج کے پردے ڈالتی ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ علم کو زندگی کا وسیلہ بنانا چاہیے اس لیے وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی بہت زیادہ زور دیتے تھے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان میں غربت اور اس سے جڑے ہوئے سماجی و معاشی مسائل کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ناخواندہ (ان پڑھ) افراد بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ملک کے بے شمار شعبوں میں ناکامی اور مطلوبہ معیار سے پستی کی سب بڑی وجہ ملک کی اکثریت کا ناخواندہ ہونا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام خرابیوں کی جڑ تعلیم کی کمی ہوتی ہے۔ آزادی کے ہمارے مفکروں اور دانشوروں نے ناخواندگی کے اس گمبھیر مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ان کی یہ تلاش تعلیم بالغان کے نظام پر ختم ہوئی۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ تعلیم بالغان کے ذریعے ملک کے کروڑوں اَن پڑھ افراد کو تعلیم سے آراستہ کرکے انھیں آزادی و مساوات، حقوق و فرائض اور سماجی وشعور سے بہرہ مند کیا جاسکتا ہے۔

ابتدا میں تعلیم بالغان کا دائرہ عمل محدود تھا۔ اس وقت تعلیم بالغان کا تصور یہ تھا کہ بڑی عمر کے ناخواندہ افراد کو تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سکھا دینا اور کچھ حساب دانی سے واقف کرانا۔ لیکن مولانا آزاد تعلیم بالغان کا مختلف تصور رکھتے تھے۔ ان کے نظریے کے مطابق بالغوں کی تعلیم کا مقصد صرف ان پڑھ بالغوں کو پڑھا لکھا بنانا نہیں تھا بلکہ تعلیم کے ساتھ ان کی تربیت بھی کرنا تھا۔ تاکہ لوگ جمہوری طرز زندگی، جمہوری مزاج کے حامل ہو جائیں اور بدلتے زمانے کا ساتھ دے سکیں۔ ورنہ صرف حرف شناسی اور جمع و تفریق ہی سب کچھ نہیں۔ مولانا آزاد کے ذہن میں تعلیم کا ایک وسیع اور بامقصد تصور تھا اس لیے وہ تعلیم بالغان کو بھی اسی وسیع تناظر میں دیکھتے تھے۔ انہوں نے 31 مئی 1940 کو ایک پریس کانفرنس میں بتایا تھا کہ دورِ حاضر میں تعلیم بالغان کا کیا مفہوم ہونا چاہیے۔ مولانا آزاد پہلے ماہر تعلیم تھے جنہوں نے تعلیم بالغان کو سماجی تعلیم (Social Education) کے نام سے موسوم کیا۔ انہوں نے تعلیم بالغان کے تین اہم پہلو متعین کیے۔

1۔ اَن پڑھ بالغوں کو پڑھا لکھا بنانا۔

2۔ کم پڑھے لکھے افراد کو ادب، فن اور پیشہ ورانہ اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کرنا۔

3۔ زندگی سے مفاہمت کا شعور پیدا کرنا اور اپنے حقوق و فرائض سے آگاہ کرنا۔

تعلیم بالغان یا سماجی تعلیم کے حدود کا تعین کرنے کے بعد انہوں نے اس کے مقاصد کی بھی نشاندہی کی۔ اس کے مطابق تعلیم بالغان کے ذریعے درج ذیل مقاصد کا حصول ہونا چاہئیے۔

1۔ ہر شہری شہریت (Citizenship) کے تقاضوں سے واقف ہو۔ اسے شہریت کے لوازمات جمہوریت سے آگاہی ہو۔ اسے اپنے ماضی اور حال سے واقفیت ہو۔ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ اس کے اطراف واکناف کا قدرتی ماحول کیسا ہے؟ اور اسے اس ماحول کے تحت کس طرح زندگی گزارنا چاہیے۔

حصول آزادی کے بعد ہمارا ملک ایک جمہوری ملک بن گیا جس میں بالغ رائے دہی کی اساس پر شہریوں کو رائے دہی کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ جمہوری نظام میں حق رائے دہی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ حق بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ اس لیے اس حق کا صحیح استعمال ضروری ہے تاکہ انتخابات صاف ستھرے ہوں اور ایسے نمائندوں کو حکومت کرنے کے لیے چُن سکیں جو جمہوری قدروں اور حقوق و فرائض سے واقفیت رکھتے ہیں۔

2۔ سماجی تقاضوں سے واقفیت کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ شہری اپنی نجی ضروریات جیسے صحت عامہ کے مسائل اور بلدی ضروریات کو اچھی طرح سمجھیں اور جانیں تاکہ صحت مند معاشرے کے قیام میں ان کا تعاون شامل رہے۔

3۔ سماجی تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ وہ بالغ افراد کی معیشت کو سہارا دے۔

صرف چند اصولوں کی زبانی تعلیم اور ان پر عمل کرنے کی تلقین سے سماجی تعلیم کا کام ختم نہیں ہوتا۔ جب تک لوگوں کی معاشی حالت اطمینان بخش نہ ہو وہ زندگی کا سکھ اور صحیح لطف نہیں لے سکتے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ سماجی تعلیم کے ذریعہ افراد کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنی معاشی حالت کو سدھار سکیں۔ عوام کی بڑی تعداد مختلف طریقوں سے فضول خرچی کی عادی ہے لوگ رسم و رواج، علتوں اور عادتوں پر غیر ضروری روپیہ صرف کرتے ہیں۔ تعلیم بالغان کے ذریعے انہیں فضول خرچی کے نقصانات کے بارے میں آگاہ کیا جاسکتا ہے اور اس کے خلاف تربیت کی جاسکتی ہے۔ علاوہ ازیں تعلیم بالغان کا مقصد سرکاری منصوبہ بندی، دولت کی شرحِ پیدائش میں اضافے کے لیے کیے جانے والے اقدامات اور سماجی اصلاحات سے استفادہ حاصل کرنے کا سلیقہ پیدا کرے۔

4۔ تمدنی، جسمانی اور معاشی بنیادوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن صرف انہیں پر زندگی کی عمارت تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اس تعمیر کو مکمل کرنے کے لیے ایک اہم چیز فرد کی اصلاحِ نفس بھی ہے جس میں اچھے اخلاق کی تربیت، ایثار، قربانی، قومی غیرت، انسانی ہمدردی، مساوات، تحمل، برداشت، عدل، رواداری، عقلیت پسندی وغیرہ سب کچھ شامل ہیں۔ جس معاشرے کے افراد میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں وہ معاشرہ مضبوط و مستحکم، پرامن، خوش حال اور ترقی پذیر معاشرہ ہو گا۔

7.3 مولانا آزاد: بحیثیت وزیر تعلیم

15 اگست 1947 کو ہندوستان برطانیہ کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔ اب ہندوستان کی باگ ڈور ان رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی جنہوں

نے آزادی کی جدوجہد میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو ملک کے پہلے وزیر اعظم بنائے گئے۔ ان کے سامنے سب سے اہم کام ہندوستان کو معاشی اور تعلیمی سطح پر اونچا اٹھانا تھا تاکہ ایک بہتر ترقی پذیر سماج کی تشکیل کی جاسکے۔ پنڈت نہرو مولانا آزاد کی علمی قابلیت سمجھ بوجھ اور قائدانہ صلاحیتوں سے متاثر تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مولانا کے ذہن میں تعلیم کا نہایت وسیع اور گہرا مفہوم ہے اور ان کے مقاصد میں متحدہ قومیت کا فروغ سیکولرزم اور قومی ترقی شامل ہے۔ وہ مولانا کی وسیع النظری سے بہت متاثر تھے اسی لئے انھوں نے ملک کے تعلیمی نظام کی باگ ڈور مولانا کے سپرد کر دی۔

15 اگست 1947ء کو مولانا آزاد نے ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کا عہدہ سنبھالا۔ مولانا آزاد پنڈت نہرو کے اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے اصولوں سے متفق تھے جن کو روبہ عمل لاکر ہندوستان سے غربت کا خاتمہ کیا جاسکتا تھا اور عوام کو ملک کی ترقی میں شامل کر کے ملک کو خود مختار اور ترقی پذیر بنایا جاسکتا تھا۔ یہ کام تعلیم کے ذریعہ ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ مولانا آزاد اس وقت کے رائج نظام تعلیم سے متفق نہیں تھے جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ آزاد ہندوستان کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا کیونکہ وہ غیر قوموں کا نافذ کیا ہوا نظام ہے جس کا مقصد ایسی تعلیم فراہم کروانا تھا جسے حاصل کر کے ہندوستانی نوجوان ان کے نظریات کی ترجمانی کر سکیں، ان کے وفادار رہیں اور حکومت کرنے میں ان کی مدد کر سکیں۔ ایسی تعلیم حاصل کر کے ہمارے نوجوان اپنی ہی قومی و مذہبی روایتوں اور طرز زندگی کو کمتر سمجھنے لگتے ہیں جو قوم کی ترقی کے لئے ناموزوں ہیں۔ مولانا کا مشاہدہ تھا کہ مغربی اور انگریزی کی تعلیم نے نئی نسل کو غلامانہ ذہنیت اور تنگ نظری کا شکار بنا دیا ہے۔ انہوں نے جو کچھ پڑھا اور جس طرح پڑھایا گیا اس نے ان کے ذہنوں کو کھولنے کے بجائے بند کر دیا ہے۔ مولانا آزاد مغربی تعلیم کے خلاف نہیں تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ مغربی علوم اور مشرقی علوم میں ہم آہنگی ہو اور ایسی تعلیم سے فرد کی شخصیت سازی کا کام لیا جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے نوجوان ہی ملک کا مستقبل ہیں. وہ ہی ملک کی تعمیر و ترقی کے ذمہ دار ہوں گے۔ اگر ان میں اعلیٰ اقدار اور کام کے تئیں رغبت پیدا کی جائے تو وہ ملک کے لیے بیش بہا سرمایہ ثابت ہوں گے۔ مولانا آزاد تعلیم کے ذریعہ جن اقدار کو ہر ہندوستانی میں دیکھنا چاہتے تھے وہ اس طرح ہیں :

1۔ سچائی	2 ۔ انصاف	3 ۔ روشن خیالی
4 ۔ تعاون و یکجہتی	5 ۔ خوش اخلاقی	6۔ ہمت و بہادری
7۔ عاجزی		

مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات ہمیں ان اقدامات میں نظر آئیں گے جو انہوں نے ملک میں تعلیم کے فروغ کے لیے اٹھائے۔ سماج اور زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کی اصلاح یا فروغ کو مولانا آزاد نے فراموش کیا ہو، خواہ اس کا تعلق معاشرتی، معاشی، لسانی یا ثقافتی زندگی سے ہو یا علم و آگہی سے ہو۔

وزارت تعلیم کا عہدہ سنبھالنے کے ساتھ ہی مولانا نے تعلیمی نظام کا ایک جامع خاکہ تیار کیا اور سماج کے ہر فرد کے لیے تعلیم کے راستے استوار کرنے کے لئے کارگر قدم اٹھائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایک نو آزاد ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے اور ہندوستان کو خود مختار ملک بنانے کے لیے اعلی تعلیم یافتہ اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں مہارت رکھنے والے نوجوانوں کی ضرورت ہو گی اور یہی نوجوان ملک کی تعمیر و ترقی

کے لیے ذمہ دار ہوں گے۔

وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد نے تعلیمی نظام کی اصلاح، تعلیم کے فروغ، اعلیٰ تعلیم کی ترقی اور تہذیب وثقافت کی نشوونما کے لیے جو کارنامے انجام دیے آئندہ اوراق میں ہم ان کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

7.3.1 اعلیٰ تعلیم:

بہ حیثیت مرکزی وزیر مولانا آزاد ہندوستان کے نظام تعلیم کی خامیوں کو دور کرنا اور اسے قومی مقاصد کے حصول کا وسیلہ بنانا چاہتے تھے۔ وہ اس میں بنیادی تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے ملک میں جاری اعلیٰ تعلیمی اداروں کا جائزہ لینے اور انہیں بہتر بنانے کے لئے تجاویز پیش کرنے کے لئے 1948ء میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی سرپرستی میں "یونیورسٹی کمیشن" قائم کیا جس کا باقاعدہ افتتاح 6/دسمبر 1948 کو ہوا۔

یونیورسٹی کمیشن کی ذمہ داری تھی کہ ہندوستان میں موجود یونیورسٹیوں کے حالات کا جائزہ لے۔ ان کے نصاب، طریقہ تعلیم، تعلیمی مواد و وسائل اور دیگر درپیش مسائل کو سمجھے اور ان کی بہتری کے لئے تجاویز پیش کرے۔ اگرچہ مولانا کی تربیت ایک مذہبی دیندار گھرانے میں ہوئی تھی جہاں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب (قرآن) سے زیادہ اہم اور ضروری کچھ اور نہ تھا مگر مولانا اپنی وسیع النظری کے سبب سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی کو ملک کی ترقی کا ضامن سمجھتے تھے۔ وہ ان علوم کی اہمیت سے واقف تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہندوستان کی معاشی واقتصادی ترقی کے لئے تعلیم یافتہ سائنس دانوں اور انجینئروں کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ملک کے مختلف شہروں میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (Indian Institute of Technology) قائم کرنے کی تجویز رکھی تاکہ وہاں سے ماہرین مہارتیں حاصل کرکے نکلیں اور ملک کی ضروریات کو پورا کریں۔ ان کی کوشش تھی کہ ان اداروں کا معیار ایسا ہو کہ ہمارے نوجوانوں کو تعلیم کے لئے بیرون ملک جانے کی ضرورت نہ ہو بلکہ بیرون ملک سے نوجوان ہندوستان آئیں اور یہاں کی تعلیم سے فیضیاب ہوں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے کھڑگ پور میں آئی آئی ٹی ادارے کا باقاعدہ افتتاح 18/اگست 1951 میں ہوا۔ یہ ادارہ 1946 میں ہی بنگال حکومت کی جانب سے ہگلی ندی کے کنارے ایک ہزار ایکڑ زمین پر ایسٹرن ہائر ٹیکنالوجی انسٹی ٹیوٹ کے نام سے قائم ہو چکا تھا رابندر ناتھ ٹیگور نے 23 دسمبر 1923 کو اعلی تعلیم کا ادارہ شانتی نکیتن میں قائم کیا تھا حکومت ہند نے وزیر تعلیم کے مشورے سے 1951 میں اسے مرکزی یونیورسٹی کا درجہ عطا کیا۔ یہ یونیورسٹی 'وشوبھارتی' کے نام سے مشہور ہے۔

مولانا آزاد تعلیمی نظام میں سب سے زیادہ اہمیت اساتذہ کو دیتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ معیاری تعلیم کا تمام تر دارومدار ابتدائی اسکولوں پر ہوتا ہے لہٰذا ان اسکولوں کے لیے ایسے اساتذہ تیار کئے جائیں جو تربیت یافتہ، قابل، محنت کش ہوں اور طلبا کے تئیں ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہوں۔ ملک میں موجود اسکولوں کے اساتذہ کی کارکردگی سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ معیاری اساتذہ کی ضرورت کے مد نظر 1947 میں سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن (سی آئی ای) قائم کیا۔ اس ادارے کے اہم کاموں میں اسکولوں کے لیے اساتذہ کی تربیت کے علاوہ طلبا کی ذاتی زندگی اور تعلیم سے جڑے ہوئے مسائل اور ان کے تدارک کے لیے رہبری اور رہنمائی (گائڈنس اینڈ کاؤنسلنگ)، طلبا کی

پوشیدہ صلاحیتوں کی تلاش اور تعلیم سے متعلق دیگر مدوں پر تحقیق کرنا بھی شامل تھا۔ اپنے کام کی نوعیت اور معیار کے اعتبار سے اس ادارے کو دوسرے ایسے اداروں کی رہنمائی کرنی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی حکومت سے مطالبہ تھا کہ اساتذہ کے معیار اور ملازمتی حالات کو بہتر بنانے کو ترجیح دی جائے تاکہ معاشرے میں ان کا مقام بلند ہو اور پڑھے لکھے ذمہ دار افراد معلمی کا پیشہ اپنانے کے لیے آگے آئیں۔

انگریز حکومت نے یونیورسیٹوں کو مالی امداد فراہم کرنے کے لئے 1945 میں یونیورسٹی گرانٹس کمیٹی بنائی تھی جس کی ذمہ داری علی گڑھ، بنارس اور دہلی یونیورسٹیوں کی کارکردگیوں کی نگرانی کرنا اور ضرورت اور ترقی کے لیے مالی امداد فراہم کرنا تھا۔ 1947 کے بعد اس کی ذمہ داریوں میں ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں کی دیکھ بھال بھی شامل ہوگئی۔ 1948 میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی سرپرستی میں قائم یونیورسٹی کمیشن نے اپنی سفارشات میں ایک تجویز یہ بھی رکھی کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیٹی کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا درجہ دیا جائے جس کی ذمہ داریوں میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کی کارکردگیوں کا جائزہ لینا ان کی ذمہ داریوں کا تعین کرنا، معیار کو قائم رکھنا امتحانات اور تحقیقات کے لیے ریگولیشنز تیار کرنا اور ضرورت کے مطابق مالی امداد فراہم کرنا ہوگا۔ اس تجویز کے بعد 26 دسمبر 1953 کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (UGC) کا باقاعدہ افتتاح ہوا۔

مولانا آزاد نے محسوس کیا کہ پورے ہندوستان میں تعلیم کے تیزی سے پھیلاؤ میں سرمائے کی کمی مانع ہوسکتی ہے لہذا انہوں نے مشورہ دیا کہ تعلیم کے لیے متعین کی گئی رقم کو بہتر اساتذہ اور بہتر تدریسی وسائل کی دستیابی کے لیے استعمال کیا جائے نہ کہ اسکولوں کی عمارت کو بہتر اور خوبصورت بنانے کے لیے اس کا استعمال ہو۔ مولانا آزاد اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ ہندوستان کی بڑی آبادی دیہی علاقوں میں آباد ہے جو اپنے آبائی پیشہ کھیتی باڑی اور دوسرے پیشوں میں لگی ہوئی ہے۔ ان علاقوں میں اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے انھوں نے نیشنل کاؤنسل فار رورل ہائر ایجوکیشن قائم کیا جس کا افتتاح 1956 میں ہوا۔ مولانا آزاد کی ترجیحات میں پیشہ ورانہ تربیت، زرعی تعلیم اور تعلیم بالغان شامل تھی۔ وہ پنڈت نہرو کے اس خیال سے پوری طرح متفق تھے کہ اگر ہمارے اعلیٰ تعلیمی ادارے بہتر کارکردگی سے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں گے اور ترقی کے راستے نکالیں گے تو یقیناً ہمارا ملک ترقی کرے گا۔

7.3.2 اسکولی تعلیم :

ہندوستان کے آئین کے مطابق 14 سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کی ذمہ داری حکومت ہند کی ہے۔ یہ آرٹیکل مولانا آزاد کے عزم کی بھی ترجمانی کرتا ہے کہ ہندوستان کے ہر بچہ کو بلا تفریق مذہب و ملت، جماعت اور جنس 14 سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم فراہم کی جائے۔ اس کے لیے مولانا نے شری بی۔ جی کھیر کی سرپرستی میں 1948 میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی جس کا کام 14 سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کے ہدف کو حاصل کرنے کے موزوں طریقے اور راہیں تلاش کرنا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اسکول کی تعلیم کی ذمہ داری صوبوں کی رہے گی جبکہ مرکز کی ذمہ داری اعلیٰ ٹیکنیکل اور سائنٹفک تعلیم کا فروغ ہوگی۔ مرکز صوبوں کو صلاح و مشورہ دے سکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر مالی امداد بھی کرے گا۔ مرکز اور صوبوں کے درمیان ہم آہنگی کو یقینی بنانے میں سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن (سی اے بی ای) ایک اہم اور ذمہ دار ادارہ ہے جس کی تشکیل پہلے 1920 میں کی گئی۔ 1923 میں اس کو

تحلیل کر دیا گیا۔15 مارچ 1935 میں دوبارہ قائم کیا گیا 15 مارچ1952 کو سی۔اے۔بی۔ای کی میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے مولانا آزاد نے تجویر رکھی کہ ملک میں ناخواندگی کے خاتمے اور تعلیم کے پھیلاؤ کے لئے ثانوی سطح تک کی تعلیم کو عالم گیر بنایا جائے اور اس کے لئے ہر بچہ کے لیے تعلیمی مواقعوں میں یکسانیت برتی جائے۔

مولانا آزاد چاہتے تھے کہ ثانوی جماعت تک کی تعلیم مادری زبان میں ہو۔سہ لسانی فارمولے کا استعمال کیا جائے جہاں صوبے کی زبان اور ہندی کے علاوہ انگریزی زبان کا استعمال کیا جائے۔ مولانا آزاد کا مشاہدہ تھا کہ دیہی علاقوں میں والدین اپنے بچوں کی تعلیم کے تئیں سنجیدہ نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم ان کے بچوں کو ان کے آبائی پیشوں سے دور کر دے گی۔ تعلیم حاصل کر کے وہ ملازمت کی تلاش میں شہروں میں چلے جائیں گے جس سے ان کا آبائی پیشہ متاثر ہو گا اور آبائی پیشہ سے جڑے رہنے کے لیے ان کو تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔اس سوچ کو بدلنے کے لیے مولانا کی رائے تھی کہ تعلیم ایسی ہو جو بچوں کو ان کے آبائی پیشہ اور وراثت سے دور کرنے کے بجائے اس کو مزید فروغ دینے کا کام کرے۔ یہاں وہ گاندھی جی کے بنیادی تعلیم کے فلسفے سے متفق تھے کہ بنیادی تعلیم کو حرفہ سے جوڑا جائے۔ حرفہ تعلیم کا بنیادی اور اہم جز ہو۔پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کر کے طلبا خود کفیل ہو جائیں گے اور اپنی زندگی اور پیشہ کو بہتر بنا سکیں گے۔

ہندوستان کی معیشت زراعت پر منحصر ہے لہذا زرعی تعلیم کو بھی تعلیم کا حصہ بنایا جائے۔ ہندوستان میں آج بھی ثانوی سطح تک کی تعلیم زیادہ تر طلباء کے لیے تعلیم کی آخری منزل ہوتی ہے۔ مولانا آزاد کی تجویز تھی کہ اسے اس طرح منظم کیا جائے کہ طلبا اسکول سے نکل کر مختلف شعبوں مثلاً تجارت انڈسٹری، مختلف پیشوں اور قومی خدمات کے اداروں میں داخل ہو سکیں اور اپنی اور سماج میں رہنے والے مختلف درجات کے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے اہل ہو سکیں۔

مولانا آزاد کا ماننا تھا کہ ثانوی اسکول کی تعلیم پورے تعلیمی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے یہ قومی تعلیم کے لیے اہم سطح بھی ہے۔ان کی رائے تھی کہ ثانوی اسکول کی تعلیم کو مزید ایک سال اور بڑھا کر اسے بارہویں جماعت تک کر دیا جائے جس سے تعلیم کا معیار مزید بہتر ہو سکے گا-مولانا آزاد چاہتے تھے کہ معاشرتی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی اسکول کے نصاب اور درسی کتب کے ذریعہ ان میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ کثرت میں وحدت کے ساتھ قوم پرستی کو فروغ دینے کے لیے وہ درسی کتب خاص کر تاریخ، شہریت، (سیوکس) جغرافیہ، ادب اور دیگر مواد کی تیاری میں وسیع النظری کو اہمیت دیتے تھے۔

23 ستمبر 1953 میں انہوں نے ڈاکٹر لکشمن سوامی مدالیر کی سرپرستی میں سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن قائم کیا جس کی ذمہ داری ملک میں جاری ثانوی تعلیم کا جائزہ لینا اور اس کی اصلاح کے لیے تجاویز پیش کرنا تھا۔ ان تجاویز میں نصاب، درسی کتب طریقہ تدریس، طریقہ جانچ (امتحان) اور معیار سے جڑے دیگر شعبوں میں بہتری لانے کے طریقوں کو واضح کرنا تھا۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری والدین کی ہوتی ہے۔گھر کے ماحول اور افراد خانہ کے برتاؤ کا اثر بچے کی شخصیت پر پڑتا ہے۔گھر میں بچہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے۔ یہی بچہ جب اسکول جاتا ہے تو وہاں کا ماحول گھر کے ماحول سے مختلف ہوتا ہے جہاں اسے اس ماحول سے مطابقت پیدا کرنی پڑتی ہے۔ علمی کام کی شروعات میں بچے کے سامنے مسائل آتے رہتے ہیں۔ اس کے مزاج، برتاؤ اور کارکردگی پر اساتذہ

اور ہم جماعتوں کا اثر پڑتا ہے۔ ایسے میں لازمی ہے کہ اساتذہ کا رابطہ بچے کے والدین سے بھی رہے تاکہ وہ بچے کی شخصیت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں اور والدین کو بھی علم رہے کہ ان کا بچہ اسکول میں کیا کر رہا ہے اور اس کی تعلیمی پیش رفت کیسی ہے۔ اسی لیے مولانا آزاد چاہتے تھے کہ والدین اور اساتذہ کے درمیان رابطہ کے لیے سال بھر میں کم از کم تین چار بار اساتذہ اور والدین کی میٹنگ کا اہتمام اسکول کو کرنا چاہیے۔ ہر جماعت کے لیے وقت اور دن الگ ہو سکتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے تھی کہ ابتدائی جماعتوں میں "کر کے سیکھنے (Learning by doing)" کا اصول اپنایا جانا چاہیے جبکہ ثانوی جماعتوں میں ذہنی صلاحیتوں کو فروغ دینے والی سرگرمیوں کا استعمال کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی مختلف مہارتوں کی تربیت بھی دی جائے۔

بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں مولانا آزاد فرانسیسی فلاسفر روسو سے بہت متاثر تھے وہ روسو کے اس خیال سے متفق تھے کہ بچوں میں یہ صلاحیت بچپن سے ہوتی ہے کہ وہ اپنی بصیرت سے سچ کو پہچان لیتے ہیں۔ پیدائشی طور پر بچے سچے ہوتے ہیں۔ ان میں اپنے ماحول سے سیکھنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے لہذا مولانا چاہتے تھے کہ اساتذہ تدریس کے ایسے طریقے اپنائیں جن سے بچوں کی پوشیدہ صلاحیت سامنے آسکے۔ انھیں ان کے ماحول میں موجود وسائل کی مدد سے مشکل تصورات کو آسان بنا کر سمجھایا جائے۔ مخصوص صلاحیتوں والے بچوں کے لیے مولانا کی تجویز تھی کہ ان کے لیے ان کی خصوصیت کی مناسبت سے درسی کتب تیار کی جائیں اور آموزشی اشیاء کا استعمال کیا جائے مولانا آزاد اسکولی تعلیم میں امتحانات کا ایسا نظام نافذ کرنا چاہتے تھے جس سے طلبا میں ذہنی تناؤ اور ذہنی بوجھ کو ختم کیا جاسکے۔

7.3.3 مذہبی تعلیم: مدرسہ تعلیم:

مولانا آزاد ایک روشن دماغ اور وسیع النظر وزیر تعلیم تھے۔ ان کے ذہن میں تعلیم کا بہت گہرا اور وسیع مفہوم تھا۔ تعلیم کے ہمہ گیر تصور کے ساتھ ہی وہ تہذیب و ثقافت اور مذہبی شناخت کے بھی حامی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مذہبی تعلیم کے ذریعہ روحانی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے مذہبی تعلیم کو ہر بچہ کے لیے لازمی قرار دیا۔ ایک پریس کانفرنس میں مولانا آزاد نے کہا تھا کہ مذہبی تعلیم کا مقصد وسیع النظری، رواداری اور انسان دوستی ہونا چاہئے۔ خود مولانا آزاد کی تربیت ایک مذہبی گھرانے میں ہوئی تھی اور وہ مذہبی عقائد سے بخوبی واقف تھے جس نے انھیں خدا بینی، خود بینی اور جہاں بینی کے لئے تیار کیا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مذہب ہمیں مشاہدے کے ذریعہ علم حاصل کرنا سکھاتا ہے۔ خود قرآن مشاہدہ کی ہدایت دیتا ہے۔ بار بار وہ مشاہدے اور غور و فکر کے ذریعہ علم حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ علم کی روشنی میں حقیقت تک پہنچنے کی راہ دکھاتا ہے۔

ہندوستان میں دینی تعلیم کے لیے علیحدہ مدارس کا اہتمام موجود ہے۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ دینی مدارس کے نصاب میں عصری علوم کو بھی شامل کیا جائے۔ علامہ شبلی جیسے معمار تعلیم کی صحبت سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ان کے مشوروں سے ہی ندوۃ العلماء کا جدید ترین نصاب مرتب ہوا جو عصری تقاضوں پر بھی پورا اترتا ہے۔ مولانا نے سب سے پہلے عربی نصاب کی کمیٹی بنائی جس میں سفارش کی گئی کہ طلبا میں پہلے ان کی مادری زبان میں مہارت پیدا کی جائے۔ پھر عربی زبان میں استعداد کو فروغ دیتے ہوئے عربی کی صرف و نحو سے

اچھی طرح واقف کروائیں اور پھر نصاب کی تکمیل کی جائے۔ لکھنو میں مولانا آزاد نے دینی مدارس اور دارالعلوم کے سربراہوں کی کانفرنس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو نصاب میں شامل کرنے پر زور دیا۔ مولانا چاہیے تھے کہ مشرقی و مغربی علوم میں ہم آہنگی ہو۔

7.3.4 سماجی تعلیم – تعلیم بالغان:

آزادی کے وقت ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصّہ ناخواندہ تھا۔ خود تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باعث والدین بچوں کی تعلیم کی اہمیت بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ناخواندگی کی وجہ سے وہ ان چیزوں اور سہولتوں سے محروم رہے جو تعلیم کی بدولت ان کو دستیاب ہو سکتی تھیں۔ بالغوں کے لیے بھی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے تعلیم بالغان کا تصور پیش کیا اور اس کے لیے سماجی تعلیم کے نام سے ایک تحریک چلائی اس کا مقصد ناخواندہ افراد کو سماجی دھارے میں شامل کرنا اور ان کے شعور کو بیدار کر کے ملک کی ترقی میں ان کو شامل کرنا تھا۔

سماجی تعلیم کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے منسٹری آف ایجوکیشن میں 1948 میں ایک سیکشن سماجی علوم کا قائم کیا جہاں سماجی تعلیم کو تعلیم بالغان سے منسلک کیا جاتا تھا، سماجی تعلیم کا مقصد ناخواندہ عوام کو خواندگی کی تربیت دینا، ان میں شہریوں کے فرائض اور حقوق کی سمجھ پیدا کرنا اور خواندگی کی کمی کے باوجود افراد کے ذہنوں کو تعلیم یافتہ بنانا تھا۔ تعلیم صرف خواندگی سے ہی نہیں حاصل ہوتی بلکہ زندگی کے تجربات، معاشرے میں مختلف افراد کے کردار، مسائل کی سمجھ اور ذہن کی سوجھ بوجھ فرد کو تعلیمی ذہن فراہم کرتی ہے اور یہی مقصد سماجی تعلیم کا ہے۔

7.3.5 تعلیم، تہذیب و ثقافت سے وابستہ ادارے:

مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات کا اظہار ان اقدامات سے ہوتا ہے جو انھوں نے ہندوستان میں تعلیم و ثقافت کے فروغ کے لیے اٹھائے تعلیم و تربیت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں مولانا آزاد کی نظر نہ گئی ہو۔ دیہی اور شہری اسکولوں کی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیمی اداروں اور ناخواندہ بالغوں کی تعلیم سے متعلق مولانا نے جامع لائحہ عمل تیار کیا جس پر عمل آوری کے لیے ان کی منسٹری نے متعدد کمیٹیاں اور کمیشن قائم کیے جن کی ذمہ داری محض اداروں کے حالات کا جائزہ لینا ہی نہیں تھی بلکہ ان میں بہتری کے لیے تجاویز پیش کرنا بھی تھی۔ بچوں کی شخصیت کی ہمہ جہت نشو و نما کے لیے انھوں نے اسکولوں میں کھیل کود، تفریح، ثقافتی پروگراموں کے انعقاد اور تقابلی مقابلوں پر بھی زور دیا۔ اسکولی تعلیم میں ایک اہم معاون درسی کتب ہوتی ہیں۔ اسکولی تعلیم۔ اعلیٰ تعلیم و تحقیق سے متعلق درج ذیل اداروں کا قیام ان کی زندگی میں عمل میں آیا۔ کچھ اداروں کا ذکر پہلے آچکا ہے اس کے علاوہ یہ ہیں:

1۔ سینٹرل بیورو آف ٹیکسٹ بک ریسرچ . 1954

2۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف بیسک ایجوکیشن – 1956

3 ۔ کاؤنسل فار سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ- 1951

4۔ سیکنڈری ا یجوکیشن کمیشن - 1952

ہندستان جغرافیا ئی اعتبار سے بہت بڑا ملک ہے۔اس کے صوبوں میں بسنے والوں کی زبان، لباس، رہن سہن، تہوار، مذہب، تہذیب اور ثقافتی سرگرمیاں مختلف ہیں۔ یہ تہذیب و ثقافت سے مالا مال ملک ہے اور یہاں کے ہر باشندے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ملک کی گوناگوں تہذیب و ثقافت سے نہ صرف آشنا اور مانوس ہو بلکہ اس کے فروغ میں حصہ لے اور یکجہتی کا مظاہرہ کرے۔ ملک کی تہذیب و ثقافت کے فروغ کے لیے درج ذیل اداروں کا قیام عمل میں آیا۔

1۔	انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشن	1950
2۔	سنگیت ناٹک اکادمی	1952
3۔	ساہتیہ اکادمی	1954
4۔	للت کلا اکادمی	1954

7.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں۔

- مولانا ابوالکلام آزاد ملک کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ وہ بے پناہ علم و ذہانت اور تفکر و تدبر کی حیرت انگیز صلاحیتوں کے حامل تھے۔
- وہ اصطلاحی معنٰی میں ماہر تعلیم نہیں تھے لیکن ان معنٰی میں ماہر تعلیم تھے کہ فر، سماج اور ملک کی ترقی کے لیے تعلیمی نظام کیسا ہونا چاہیے، اس کے تعلق سے ان کے کچھ خاص تصورات تھے۔
- وہ انگریزوں کے دور کے نظام تعلیم کی خرابیوں سے واقف تھے اور ان خامیوں کو دور کر کے ایک نیا نظام تعلیم تشکیل دینا چاہتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا شمار ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے۔
- مولانا آزاد نے اپنے تعلیمی تصورات پر کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن ان کی تصانیف اور تقریروں سے ان کے تعلیمی تصورات اخذ کیے جاسکتے ہیں۔
- وہ مغرب کی مادہ پرستی اور مشرق کی تقدیر پرستی دونوں سے بے زار تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارا تعلیمی نظام ایسا ہو جس میں مغربی علوم، سائنس اور ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ اخلاق اور روحانیت نیز ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا امتزاج ہو۔
- وہ تعلیم کو سماجی بدلاؤ اور ملک و قوم کی ترقی کا وسیلہ سمجھتے تھے اس لیے ان کا خیال تھا کہ دیگر شعبوں کے مقابلے میں تعلیم کے شعبے کو ترجیح اور فوقیت دی جانی چاہیے۔
- ان کے ذہن میں انسان کا ایک خاص تصور تھا۔ وہ اسے زندگی کی اعلیٰ قدروں سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے تاکہ ملک میں جمہوریت، مساوات، رواداری، عدل، امن و امان، معقولیت پسندی، سائنسی مزاج اور مثبت اخلاقی و ثقافتی قدروں کا بول بالا ہو۔
- انہوں نے تعلیمی نظام کا جو نقشہ بنایا تھا اس میں پانچ عناصر کو بنیادی اہمیت حاصل تھی جو یہ ہیں:

(i) 19 سے 12 برس کی عمر کے بچوں کے لیے لازمی تعلیم (ii) ناخواندہ بالغوں کے لیے سماجی تعلیم (تعلیم بالغان)

(iii) ثانوی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم میں توسیع اور ان کے معیار کی بلندی (iv) سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کا فروغ
(v) آرٹ اور فنون لطیفہ کی ترقی

7.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
عصری	:	آج کے زمانے، موجودہ دور سے متعلق
گیرائی	:	گرفت، تسلط
ارفع	:	بلند، اعلیٰ
نابغہ روزگار	:	اپنے زمانے میں نہایت ذہنی صلاحیتوں کا مالک
تدبر	:	سوچنا، غور کرنا، مکمل چھان بین کرنا۔
مجتہد	:	کوشش کرنے والا
اخذ کرنا	:	لینا، پکڑنا
مادہ پرستی	:	مادے کو سب کچھ سمجھنا، خدا کا انکار کرنا
تخریب	:	خراب کرنا، برباد کرنا
جبلت	:	پیدائش، خلعت، طبیعت
راسخ	:	مضبوط، مستحکم
ادراک	:	دریافت کرنا، پانا، عقل، سمجھ
سرچشمہ	:	پانی کا سوتا، کسی چیز کے جاری ہونے کا مقام
ہدف	:	نشانہ
مسخ	:	کسی چیز کی شکل یا حالت بدل جانا جو پہلے سے بدتر ہو
گمبھیر	:	پیچیدہ، دقیق، سنجیدہ، بھاری

7.6 نمونہ امتحانی سوالات

7.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. 1947 میں تعلیم سے متعلق کس ادارے کا قیام عمل میں آیا تھا؟
2. 18 اگست 1951 کو کس ادارے کا باقاعدہ افتتاح عمل میں آیا؟

3. مولانا آزاد نے تعلیم بالغان کو کس نام سے موسوم کیا؟
4. شانتی نکیتن کب وشوابھارتی یونیورسٹی میں تبدیل ہوا؟
5. کس عمر تک کے بچوں کے لازمی مفت تعلیم کی اسکیم بنائی گئی؟
6. ساہتیہ اکادمی کا قیام کب عمل میں آیا؟
7. ٹیکنالوجی کا پہلا ادارہ کب اور کہاں قائم ہوا؟
8. سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن کس کی سرپرستی میں اور کب قائم ہوا؟
9. اعلیٰ تعلیم کا جائزہ لینے کے لیے مولانا آزاد نے کون سا کمیشن قائم کیا؟
10. تہذیب وثقافت کے فروغ کے لیے کون سے ادارے قائم کیے؟

7.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کے عہد وزارت میں تعلیمی نظام کے پانچ بنیادی عناصر کیا تھے؟ بیان کیجیے۔
2. مولانا آزاد کے قائم کردہ ثقافتی اداروں کے نام اور قیام کا سنہ بتائیے۔
3. مولانا آزاد تعلیم کے ذریعہ طلبا میں کن اقدار کا فروغ کرنا چاہتے تھے؟ واضح کیجیے۔
4. دیہی علاقوں میں اسکولی تعلیم کے فروغ کے لے مولانا نے کیا سفارشات کیں؟
5. ثانوی اسکول تک تعلیم کو مفت اور لازمی کیوں قرار دیا گیا؟

7.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات کی وضاحت کیجیے۔
2. اعلیٰ تعلیم کے بارے میں مولانا آزاد کے خیالات کا جائزہ لیجیے۔
3. مولانا آزاد اور سماجی تعلیم کے موضوع پر جامع نوٹ تحریر کیجیے۔

7.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. غبار خاطر	مرتب: مالک رام
2. مولانا آزاد: ایک ہمہ جہت شخصیت	مرتب: محمد شجاعت علی راشد
3. 3 مولانا ابوالکلام آزاد: فکر و نظر چند جہتیں	ضیاء الحسن فاروقی
4. انڈیا ونس فریڈم یعنی آزادی ہند	ابوالکلام آزاد (ترجمہ: ہمایوں کبیر)
5. مولانا آزاد کے مراسلات کا کیلنڈر	سید محمد عزیز الدین حسین

اکائی 8: مولانا آزاد کے فنون لطیفہ سے متعلق تصورات

اکائی کے اجزا

8.0		تمہید
8.1		مقاصد
8.2		فنون لطیفہ: تعریف و تفہیم، اقسام اور اہمیت
	8.2.1	فنون لطیفہ کی تعریف و تفہیم
	8.2.2	فنون لطیفہ کی اقسام اور اہمیت
8.3		مولانا آزاد کے فنون لطیفہ سے متعلق تصورات
	8.3.1	فن تعمیر
	8.3.2	فن مصوری
	8.3.3	فن رقص و موسیقی
	8.3.4	فن شاعری
8.4		اکتسابی نتائج
8.5		کلیدی الفاظ
8.6		نمونہ امتحانی سوالات
	8.6.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	8.6.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	8.6.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
8.7		تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

مولانا ابو الکلام آزاد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اپنے عہد کے مفکر اسلام ہی نہیں ایک صاحب طرز ادیب اور شعلہ بیاں خطیب بھی تھے۔ انہوں نے فلسفے کی گتھیاں بھی سلجھائیں اور اپنی سحر انگیز تحریروں سے بھی اکناف عالم کو مبہوت کیا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ

میدان سیاست کے شہسوار بھی تھے۔ مولانا آزاد کا فنون لطیفہ میں شغف کسی سے پوشیدہ نہیں۔ وہ نہ صرف خود ایک عمدہ ستار نواز تھے بلکہ ساز و ترنم کے دلدادہ بھی تھے۔ اس زمانے میں طاہرہ نام کی ایک عرب مغنیہ جو خود تو بلائے جان تھی ہی مگر اس کی صدائے درد اس سے بھی کہیں زیادہ آفتِ ہوش و ایمان تھی، مولانا کی نہ صرف اس سے شناسائی تھی بلکہ وہ اس دور کی ایک اور جان لیوا مصری مغنیہ اُمِ کلثوم کے بھی پرستاروں میں شامل تھے۔ اُم کلثوم نے ایک عرصہ دلوں پر راج کیا اور 1975ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس دور میں موسیقی کے ریکارڈ سننے کے لیے مولانا لاسلکی کا سفری سیٹ استعمال کیا کرتے تھے مگر دوران اسیری یہ سہولت چھین لی گئی تو انہوں نے اپنی کیفیت بیان کی۔ اسی طرح مولانا آزاد نے فن تعمیر، فن رقص و موسیقی، فن مصوری، فن مجسمہ ساری اور فنی شاعری پر بھی اپنے تصورات پیش کیے ہیں۔ اس اکائی میں آپ فنون لطیفہ کی تمام اہم شاخوں کے متعلق مولانا آزاد کے تصورات کا مطالعہ کریں گے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- فنون لطیفہ کی تعریف و تفہیم کو سمجھ سکیں۔
- فنون لطیفہ کی اقسام اور اس کی اہمیت پر گفتگو کر سکیں۔
- فنون لطیفہ کے متعلق جرمن مفکر ہیگل کی رائے سے واقف ہو سکیں گے۔
- مولانا آزاد کے فنون لطیفہ سے متعلق عام تصورات پر تبصرہ کر سکیں۔
- فنون لطیفہ کی اہم شاخیں یعنی فن تعمیر، فن مصوری، فن رقص و موسیقی اور فن شاعری پر مولانا ابوالکلام آزاد کے تصور کی وضاحت کر سکیں۔

8.2 فنون لطیفہ: تعریف و تفہیم، اقسام اور اہمیت

8.2.1 فنون لطیفہ کی تعریف و تفہیم:

فنون لطیفہ کو انگریزی میں (Fine Arts) کہا جاتا ہے۔ وہ فنون جو انسان کے ذوق، آرائش و جمال کی تسکین کے لیے وجود میں آتے ہیں انہیں فنون لطیفہ کہا جاتا ہے۔ اس میں فن تعمیر، فن رقص و موسیقی، فن مصوری، فن مجسمہ سازی اور فنی شاعری یا ادب شامل ہیں۔ یہ تمام فنون انسانی جذبات کا ایسے اظہار ہیں جو مختلف صورتوں میں نظر آتے ہیں۔ جب سے آدم اور ابن آدم نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں اس وقت سے انسانی جذبات اس کے ساتھ ہیں۔ اس لیے فنون کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی زندگی کی تاریخ۔ البتہ گزرتے وقت کے ساتھ فنون کی لے بھی بدلی، رنگ بھی بدلے، تراش و خراش کے معیار بھی بدلے اور الفاظ کو مختلف طریقوں سے ادا کرنے کا ڈھنگ بھی بدلتا گیا۔ اس لیے فنون لطیفہ کو سمجھنے کے لیے انسانی جذبات و احساسات کا ادراک بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

انسان کے خواب، اس کی امنگیں اور اس کی آرزوئیں بھی اس سے کچھ تقاضہ کرتی رہتی ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کو ظاہر کرنے کے لیے اس کائنات میں صرف حسن کی تلاش ہی نہیں کرتا بلکہ اشیا کو حسین بھی بناتا ہے۔ وہ مشاہدے کے ذریعے تاثر ہی قبول نہیں کرتا بلکہ اس تاثر کا اظہار بھی ناگزیر سمجھتا ہے۔ اس نے جب ہوا کے جھونکوں کے گیت سنے اور پتوں کی اوٹ سے پھولوں کو جھانکتے ہوئے دیکھا اور پتھروں کو آئینے کی طرح شفاف محسوس کیا اور بکھرے ہوئے رنگوں کی لطافت کو اپنے احساسات میں متحرک پایا تو ان تمام گوشوں کو اس نے اپنی روح کی بالیدگی اور ذہنی مسرت کے لیے استعمال کرنا شروع کیا اور وہیں سے فنون لطیفہ کی ابتدا ہوئی۔ فنون لطیفہ کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے اطہر پرویز لکھتے ہیں کہ:

"۔۔۔ فنون لطیفہ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک قسم کی مسرت بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ مسرت خود اس فن کی تخلیق کرنے والا بھی حاصل کرتا ہے اور دیکھنے اور سننے والے بھی اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے مسرت اور فرحت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ پہلی قسم کی ترقی سے آپ کسی قوم کی مادی ترقی یا پسماندگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور دوسرے سے اس کے ذہنی معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔۔۔ اس کے ساتھ ہی اگر کوئی قوم فنون لطیفہ کے میدان میں آگے بڑھی ہوئی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا ذہنی اور تہذیبی معیار بلند ہے۔ وہ ملک اپنے دانشور طبقے کی بنا پر برتری رکھتا ہے اور اس کی تہذیبی و تمدنی زندگی زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تہذیبی ترقی میں مادی خوشحالی کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔"

(اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، اردو گھر، علی گڑھ، 1980، ص28-29)

فنون لطیفہ کا مقصد تخلیق حسن ہے اور جو پیکر وجود میں آتا ہے وہ فن کا اظہار ہے۔ یہ اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا ہے، کبھی یہ ہوتا ہے کہ فصل کٹتی ہے تو خوشی میں خود بہ خود انسان کے ہونٹوں سے ایسی آوازیں نکلتی ہیں، جن میں لے اور آہنگ پیدا ہوتا ہے اور پھر یہی فن بہت ساری شرائط کے ساتھ تال اور سُر سے ہم آہنگ ہو کر موسیقی میں بدل جاتا ہے اور انسان فطرت کی دی ہوئی نعمت سے اپنی موسیقی میں کہیں پرندوں کی نرم و نازک آوازوں سے کو مل سروں کو ترتیب دیتا ہے اور کہیں آبشاروں کے شور سے اپنی لے کو بلند آہنگ بناتا ہے۔ اسی طرح فنون لطیفہ کی تمام شاخیں انسان کو مسرت و انبساط عطا کرتی ہیں۔

8.2.2 فنون لطیفہ کی اقسام اور اہمیت:

فنون لطیفہ کی متعدد قسمیں بتائی گئی ہیں، جن میں فن تعمیر، فن مجسمہ سازی، فن مصوری، فن رقص و موسیقی اور فن شاعری یا ادب بہت اہم ہیں۔ فنون لطیفہ کی ان تمام اقسام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جنہیں ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں جیسے فن تعمیر، فن مجسمہ سازی اور فن مصوری اور دوسرا وہ جن کا لطف کانوں سے سن کر اٹھایا جا سکتا ہے جیسے رقص و موسیقی اور شاعری یا ادب۔ بعض لوگ تقریر اور تحریر کو بھی فنون لطیفہ کی قسموں میں شمار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جدید دور میں کچھ لوگ پکوان اور فلم کو بھی فنون

لطیفہ کا حصہ مانتے ہیں۔

فنون لطیفہ کی اقسام کے متعلق یہاں پر جرمن مفکر ہیگل کی رائے پیش کرنا مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ہیگل کا خیال ہے کہ فنون لطیفہ کی پانچوں شاخوں میں درجات قائم کیے جاسکتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ایسی درجہ بندی کرتے وقت شاعری یا ادب کو سب سے بڑا درجہ دیا جا سکتا ہے اور فن تعمیر کو سب سے کم۔ اس نے یہ درجہ بندی کرنے کے لیے جو اصول مقرر کیا ہے وہ ہے مادی وسائل کا استعمال۔ جن فنون میں مادی استعمال کم سے کم ہو گا اس میں فنی حیثیت بلند ہو گی۔ اس اصول کے تحت اس نے سب سے بلند درجہ شاعری کو دیا ہے اور سب سے کم درجہ فن تعمیر کو دیا ہے۔ کیوں کہ فن تعمیر میں مادی اشیا کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ جیسے اینٹ، پتھر، سمنٹ، لوہا، لکڑی وغیرہ۔ اس کے علاوہ ان کی تعمیر میں جو اوزار استعمال ہوتے ہیں وہ بھی بد ہیئت ہوتے ہیں۔ فن تعمیر کا ہر مظہر مادی ہے، جسے آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا دیکھنے والے کی نظر اس تعمیر کے ذہنی پس منظر سے پہلے اس کی مادی اور خارجی چیزوں میں کھو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ تاج محل کو دیکھیے۔ آپ سب سے پہلے اس کی مادی اور خارجی چیزوں میں الجھ جائیں گے، جنہوں نے تاج محل کی تعمیر میں مدد کی۔ اس کے بعد پھر آپ تاج محل کے ذہنی پس منظر کی طرف متوجہ ہوں گے، جو اس تعمیر کی اصل خصوصیت ہے، جس میں تاج محل کا تصور پنہاں ہے۔ جہاں اس کے خالق کی شخصیت جلوہ گر ہے۔

فنون لطیفہ میں فن تعمیر کے بعد دوسرا درجہ فن مجسمہ سازی کا آتا ہے۔ اس میں بھی مادی اشیا کا استعمال کافی مقدار میں ہے، لیکن اتنا نہیں جتنا کہ فن تعمیر میں ہے۔ یہاں پر اینٹ، چونا، سمنٹ، لکڑی، لوہا اور مٹی وغیرہ کی جگہ پتھر اور دھات لے لیتے ہیں اور اس میں جو اوزار استعمال ہوتے ہیں یعنی چھینی وغیرہ وہ بھی فن تعمیر کے اوزار کے مقابلے میں زیادہ سبک ہوتے ہیں۔ یہاں ایک مجسمہ میں خون گردش کرتا ہے اور بتوں کے اندر انسان کی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔

فن مجسمہ سازی کے بعد فن مصوری کا نمبر آتا ہے۔ اس میں خارجی اور مادی چیزوں میں اور زیادہ کمی آجاتی ہے۔ یہاں پر فن کار پتھر یا دھات کی جگہ کاغذ لیتا ہے اور چھینی کی جگہ برش۔ آپ مصور کی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھیے۔ اس میں مادی اشیا کا استعمال بہت کم ہو چکا ہے۔ جب آپ تصویر کو دیکھتے ہیں تو مادی اور خارجی چیزیں آپ کے ذہن کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتیں بلکہ فن کار کے برش اور رنگ سے زیادہ اس کے دماغ کا اثر زیادہ دکھائی دیتا ہے، جب کہ فن مجسمہ سازی میں پتھر اور دھات زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔

اب ہم فن موسیقی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فن مصوری میں کاغذ، برش اور رنگ کی ضرورت ہوتی ہے تب جا کر مصور تصویر کے اندر ایک ذہنی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ موسیقی میں آوازوں کے ذریعے موسیقار اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ ان آوازوں میں آہنگ پیدا کرنے کے لیے ساز کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ساز مصور کے خارجی و مادی اشیا کے مقابلے میں زیادہ نازک ہے۔ یہاں پر فن کار کو اپنے جذبات کے اظہار کے لیے محض آواز کے آہنگ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

موسیقی میں تو پھر بھی ساز کے آہنگ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے بعد آخری نمبر شاعری کا ہے۔ ہیگل نے شاعری کو سب سے بلند درجہ دیا ہے۔ کیوں کہ اس کے نقطہ نظر کے مطابق شاعری میں مادی اشیا کا استعمال سب سے کم ہے۔ اس کو آواز اور ساز کے سہارے کی

ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہاں پر مادی اشیا کی جگہ الفاظ نے لے لی ہے۔ شاعر اپنے جذبات اور احساسات کو الفاظ کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ شاعر اور سامعین کے درمیان کوئی ایسی مادی شئے نہیں ہوتی جو رکاوٹ بن جائے۔ شاعری انسان کے ذہن کو براہ راست مخاطب کرتی ہے اور شاعر اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کو الفاظ کے جامے میں بڑے نفاست کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

یہ ہیگل کا تجزیہ ہے، لیکن اس نے جس طرح فنون لطیفہ کی تمام شاخوں کا موازنہ کیا ہے، اس میں کسی حد تک سچائی کا عنصر بھی ملتا ہے۔ لیکن اس میں ان تمام فنون کے ساتھ ایک طرح کی بے انصافی بھی نمایاں ہے۔ ہیگل نے یہ نہیں سوچا کہ ہر فن کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ کوئی فن کسی دوسرے فن کی جگہ ہر گز نہیں لے سکتا۔ تاج محل کی تعمیر کی جگہ کوئی خوبصورت سے خوبصورت نظم بھی نہیں لے سکتی۔ حالاں کہ ادب نے کبھی کبھی اپنے تخیل کے بل بوتے پر تصویر کی جگہ لینے کی کوشش کی ہے اور الفاظ میں تصویر کھینچنے کا فرض ادا کیا ہے، لیکن یہ تصویر ادبی مرقع ہی کہلائی جاسکتی ہے۔

کوئی شاعر "لیونارڈو دِی ونسی" (Leonardo di Vinci) کی تصویر "مونالیزا" (Mona Lisa) سے متاثر ہو سکتا ہے، لیکن اس کی نظم "مونالیزا" کی جگہ کیسے لے سکتی ہے۔ اسی طرح کوئی مصور کسی ادبی تخلیق سے متاثر ہو کر تصویر بنا سکتا ہے یا جیسے شاعری، موسیقی کے لیے نظمیں اور گیت فراہم کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ڈرامے اور شاعری نے موسیقی سے کافی مدد لی ہے۔ موسیقی اور شاعری میں ایک باہمی تعلق پیدا ہو سکتا ہے اور بعض صورتوں میں ہوتا بھی ہے، لیکن اچھی شاعری کو موسیقی کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اعلیٰ درجے کی موسیقی کو الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ الفاظ کے بغیر ہی پوری کیفیت پیدا کرتی ہے۔

فنون لطیفہ کی جتنی اقسام بیان کی گئیں ان سب میں جذباتی بنیادوں پر انسانی خواب اور اس کے جذبات کا عکس نظر آتا ہے۔ جب تک انسان کے جذبات موجود ہیں فنون لطیفہ کی اہمیت باقی رہے گی۔ اس لیے کہ یہی وہ وسیلہ ہے، جس سے انسانی ذہن وروح ارتقائی مدارج طے کرتے ہیں۔ اگر انسان سے اس کے خواب چھین لیے جائیں اور اس کی خواہش صرف مادی چیزوں کی حد تک محدود ہو جائے تو وہ ایک چلتی پھرتی مشین بن جائے گا۔ فنون لطیفہ نے انسان کو مہذب اور متمدن بنایا اور انسانی ارتقا کے لیے راہیں کھول دی ہیں۔

چنانچہ ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ فنون لطیفہ میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے تقاضے ہیں اور اس کا خاص مقام، مرتبہ اور اہمیت ہے۔ کوئی فن کسی دوسرے کے مطالبوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام فنون کی ابتدا ایک وقت میں نہیں ہوئی بلکہ انسان کی ضرورت کے مطابق ہر فن اپنے مخصوص زمانے میں وجود میں آئے اور آ بھی رہے ہیں۔

8.3 مولانا آزاد کے فنون لطیفہ سے متعلق تصورات

مولانا ابوالکلام آزاد فنون لطیفہ کو بین الاقوامی مفاہمت کا ایک موثر ذریعہ مانتے تھے۔ اسی لیے قومی نظام تعلیم میں ادب اور فنون لطیفہ کی شمولیت کو وہ بے حد ضروری سمجھتے تھے۔ انہوں نے بار بار اس بات پر اصرار کیا ہے کہ کسی بھی ملک کا قومی نظام تعلیم فنون لطیفہ کے بغیر ادھورا ہوگا۔ یہ سیرت و شخصیت کی تعمیر و تشکیل اور ذوق سلیم کو صیقل کرنے کا ایک

قوی ذریعہ ہے۔

مولانا آزاد کاخیال ہے کہ صحت مند سماج اور اعتدال پسند افراد کا ذوق لطیف اور طبع سلیم بہت بالیدہ ہوتا ہے۔فنون لطیفہ کے ذریعے نہ صرف ذہنی قوی کو بیدار کیا جاسکتا ہے ،بلکہ شخصیت کی کما حقہ نشو ونما کے لیے شاعری ،مصوری ، موسیقی،سنگ تراشی ،فن تعمیر ،رقص اور ڈرامے وغیرہ سے دل چسپی بے حد ضروری ہے۔فنون لطیفہ جمالیاتی اظہار کاایک عمدہ ذریعہ ہے۔حسن چاہے مناظر فطرت میں ہو یا تخلیقی فن پارے میں ،احساس حسن کی تمام کیفیات کو جمالیات کے دائرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ہیگل کا خیال ہے کہ فلسفۂ جمال فقط انسانی ذہن کی تخلیق سے وابستہ مظاہر حسن کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ فنون لطیفہ کی اصل قدر و قیمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انسانی زندگی سے اس کا رشتہ کس حد تک استوار ہوتا ہے۔فنون لطیفہ اور مظاہر فطرت میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ سبھی مظاہر بڑ ی حدتک جمالیات کے حدود میں شامل ہیں۔اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر قا ضی جمال حسین لکھتے ہیں :

> "دراصل فن شاعری یا فن موسیقی کے مقابلے میں فلسفۂ جمال کا اختصاص ہی یہ ہے کہ یہ علم تمام مظاہر حسن میں مشترک عناصر کی نشان دہی کرتا ہے اور ان سبھی سے حاصل ہونے والی مسرت کو مطالعے کا موضوع بناتا ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جمالیات فنون لطیفہ کے باہمی رشتوں کو نمایاں کرتی ہیں۔۔۔چنانچہ شاعری اور مصوری کے بارے میں تو یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ شاعری بولتی ہوئی تصویر ہے اور مصوری ایک خاموش نظم۔"

(قاضی جمال حسین ،جمالیات اور اردو شاعری، علی گڑھ،2001،ص 19)

تاریخی اعتبار سے اگر ہم فنون لطیفہ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ فن کے ظہور کی تین مختلف قسمیں ہیں: رمزی ،کلاسیکی اور روحانی۔فن تعمیر کو رمزی فن کہا جاتا ہے۔اسی طرح سنگ تراشی کے فن کو کلاسیکی درجہ حاصل ہے۔ مصوری،شاعری اور موسیقی فن کی روحانی صورتیں تصور کی جاتی ہیں۔

8.3.1 فن تعمیر:

مولاناآزاد نے سنگیت ناٹک اکادمی کے جلسۂ افتتاح کے موقع پر فرمایا تھا کہ ان اکادمیوں کا بنیاد ی مقصد یہی ہوگا کہ وہ ہماری روایات کاتحفظ کریں اور ان کو فروغ دیں۔ترقی یافتہ ممالک اگرہم سے سوال کریں کہ اس پسماندہ اور غریب ملک کے عوام میں آرٹ کا اتنا بالیدہ ذوق کیسے پیدا ہو اتو ہمارے ذہن میں اس کا جواب واضح ہونا چاہئے۔ہماری مذہبی عمارتوں کی عظیم الشان فن تعمیر اور مجسمہ سازی کی بدولت قدیم ترین دور سے ہی ہندوستان اس میدان میں بہت آگے ہے۔ مندروں میں صرف عبادت ہی نہیں ہوتی تھی ،بلکہ یہ حسن وخوبصورتی کے مرکز بھی تھے۔عہد وسطیٰ میں عظیم الشان

مسجدیں تعمیر ہوئیں ،جن میں جلال و جمال کا خوبصورت امتزاج تھا۔ان شاندار آرٹ کے نمونوں کو مسلسل دیکھتے رہنے سے اس میں خالص نفیس ذوق پیدا ہوگیا۔ایک ملک جس میں کنارک یا بھونیشور کا مندر یا تاج محل کی تعمیر ہوئی ہو ،وہ صرف تخیل کی بلندی ہی نہیں، بے مثال ہنرمند ی کا بھی مظہر ہے۔

ہندوستان کی قدیم مندریں ،عہد وسطی کی مسجدیں ،تاریخی عمارات ،تاج محل ،اجنتا اور ایلورا کے غارفن تعمیر اور مجسمہ سازی کی عمدہ ترین مثالیں ہیں۔عظیم الشان فن تعمیر اور مجسمہ سازی میں کمال ہندوستان کا طرہ ٔامتیاز رہاہے۔یہ پر شکوہ اور پر جلال عمارتیں فن تعمیر اورمجسمہ سازی کا لازوال کا رنامہ ہیں۔یہ آرٹ کے نمونے رہتی دنیا تک قائم رہیں گے۔

محکمہ آثار قدیمہ کے مشاورتی کمیٹی کے سالانہ اجلاس کے موقع پر مولانا آزاد نے ایک جامع گفتگو کی اوریہ بتایا کہ چین کے علاوہ دنیا کے تین قدیم مراکزتہذیب ہندوستان ،میسوپوٹامیااور مصر ہیں۔دنیا کے بیشتر ارباب علم وفضل نے ان مقامات کی تاریخ سے دل چسپی لی ہے۔اس حقیقت کے پیش نظر آثار قدیمہ کی دریافت کے سلسلے میں حکومت ہند نے وسیع پیمانے پر کام شروع کیا ہے۔ہمارے پاس قدیم تاریخ کا اطمینان بخش سرمایہ موجود ہے۔ماہرین آثار قدیمہ کی مدد سے ان دفینوں کی بازیافت ہوسکتی ہے ،جن کی بنیاد پر ہمارے ملک کی قدیم تاریخ کا قصر تعمیر ہوسکتا ہے۔اس کام کے لیے ضروری ہے کہ ہم محکمہ کی تنظیم نئ بنیادوں پر رکھیں اور طلبا کی تربیت کا انتظام اس نہج پر کریں کہ ان میں اثری تحقیق کا ذوق پیدا ہو۔مرقعوں اور تصویری پوسٹ کارڈوں کی اشاعت کے علاوہ، مولانا آزاد نے فلموں کے ذریعے بھی اثری اور تعمیری یادگاروں کی حفاظت کی بات کہی اور فرمایا:

> ”اثری اور تعمیری یادگاروں کے عمومی تعارف کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم فلم کا سہارا بھی لیں۔فلمیں اگر حسن اہتمام کے ساتھ تیار کی جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اثری عمارتوں کے شکوہ وجلال کا سکہ ناظرین کے دل ودماغ پر نہ بیٹھے۔دیگر ممالک نے بھی اس مقصد کے لیے فلمی وسائل سے استفادہ کیا اور اپنے یہاں کی قدیم تاریخ و تمدن کے کسی ایک پہلوکی فلم منظر عام پر لائے۔“ (مولاناآزاد کی تقریریں، ص 193)

محکمہ آثار قدیمہ کی ذمہ داری اورغیر سرکاری اداروں کے تعاون سے قدیم آثار کی حفاظت پر مولانا آزاد نے بہت اصرار کیا ہے اور بتایا ہے کہ مہذب قوموں نے تحقیق و تفتیش کے ذریعے اپنی قدیم تاریخ وتمدن کی کس طرح حفاظت کی ہے۔تہذیبی ورثے اور قدیم اثاثے کی بازیافت پر مولانا آزاد کا کافی زور تھا۔عالمی تاریخ و تہذیب اور فنون لطیفہ پر ان کی خاص توجہ تھی اس باب میں ان کے فکر و خیال میں بڑی وسعت تھی انتہائی مصروف زندگی کے باوجود فرصت کے لمحات میں وہ دہلی کے آثار قدیمہ کی زیارت کے لیے نکل پڑتے تھے۔ان کے نزدیک آثار قدیمہ کی حفاظت بڑی حد تک فن تعمیر اور فنون لطیفہ کی حفاظت ہے۔

8.3.2 فن مصوری:

مولانا آزاد کو فن مصور ی سے خاص لگاو تھا۔انہوں نے ہندو ستانی مصوری کی نشاۃ ثانیہ کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا تھا جو آجکل،دہلی اگست 1960 کے مصوری نمبر میں شامل ہے۔اس مضمون سے جہاں ایک طرف مولانا آزاد کی مصور ی اور اس کی تاریخ سے کماحقہ واقفیت کا علم ہوتا ہے۔وہیں دوسری طرف برطانوی حکومت اور اس کے کارندوں کی کارستانیوں کا خاص طور سے ذکر ملتاہے۔ہندوستانی فنون لطیفہ کے ساتھ ان کی بے رخی و بے مروتی کا ذکر کرتے ہوئے مولاناآزاد نے ای۔بی۔ہیول کے کارنامے کی خوب تعریف کی ہے۔ہیول نے ہندوستانی مصوری کے احیا کا فیصلہ کیا تو اس کام کے لیے اس نے ابنندر ناتھ ٹیگور(Abanindra Nath Togore) کا انتخاب کیا۔ان دونوں نے ہندوستانی مصوری میں نئ روح پھونکنے کا بیڑا اٹھا یا،لیکن اس کام کے لیے آرٹ اسکول مناسب جگہ ثابت نہ ہوئی۔لہذاابنندر ناتھ ٹیگور نے اس اسکول سے علاحدگی اختیار کر لی اور چند نوجوان مصور وں کے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستانی مصوری /قدیم آرٹ کے نمونوں کو نئ زندگی دیں گے۔بہت غور و فکر کے بعد ان لوگوں نے 1907 میں" انڈین سوسائٹی آف اورینٹل آرٹ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔اس کام میں انھیں"سر جان ووڈروف" (SirJone Woodroffe) کا پورا تعاون حاصل رہا۔وہ خود چاہتے تھے کہ ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیئے جو مشرقی اور مغربی ممالک کے درمیان ہم آہنگی قائم رکھ سکے۔ایک دوسرے کے کلچر اور آرٹ کو سمجھنے کی مثبت کوشش ہو سکے۔اس طرح اعلیٰ انسانی اقدار کو فروغ مل سکتا ہے۔

مولاناآزاد کے تصور و تخیل میں آرٹ/فنون لطیفہ کا ایک واضح نقشہ تھا۔مصوری کیاہے؟اس مسئلے پرروشنی ڈالتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> "1۔قدرت نے یہ شرف انسان ہی کو بخشا ہے کہ وہ تخلیق کر سکتاہے۔قدرتی چیزوں کی ہو بہو عکاسی آرٹ نہیں ہے۔آرٹ اصل میں اس جذبے کی عکاسی ہے۔جسے انسان نے خود بخود محسوس کیا ہو۔ذہن میں اس جذبے کی حسین خیالی شبیہ بنائی ہو اور جسے اس نے تصور کے پردے کی آڑ سے پہلے دیکھ لیا ہو۔اسی حسن تصور کاعکس جب وہ کاغذ یا دیوار یا کسی پٹ چترپر رنگ کے ذریعے اتارتا ہے تو اسے مصوری کہا جاتاہے۔
> 2۔مصوری وہ حسینہ ہے جو فطرت کی کوشش سے پیدا تو نہیں ہوتی،لیکن اس کے آغوش میں پلتی ہے،حسین و جمیل قدرتی مناظرکی دید سے پروان چڑھتی ہے اور اس کی پیدائش صرف مصور کے بطن تخیل ہی سے ہو سکتی ہے۔"
>
> (آجکل دہلی ،مصوری نمبر، اگست1960، ص63)

مولانا آزاد نے ہندوستانی مصوری کی نشاۃ ثانیہ کی پوری تاریخ کو اپنے اس مضمون میں سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی

ہے۔نیز یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح ہندوستان کے چند سر پھرے نوجوانوں نے ہماری قدیم مصوری کی روایت کو از سر نو زندہ کیا اور بام عروج تک پہنچایا۔یہ خیال بالکل غلط ہے کہ بنگال اسکول کے مصوروں کا آرٹ محض پرانے آرٹ کی ایک نقل تھی،بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ نیا آرٹ پرانے آرٹ کی مستحکم بنیادوں پر کھڑا کیا جارہا تھا،جس کی رہنمائی ابنندر ناتھ ٹیگور کررہے تھے۔" (آجکل دہلی ،اگست 1963، ص64)

یہ فن کار تخلیقی اور جمالیاتی قدروں سے لیس تھے۔انھوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ کو کھنگال ڈالا تھا۔ راجپوت، مغل آرٹ کا باریکی سے مطالعہ کیاتھا،ساتھ ہی رامائن،مہابھارت،گیتا اور پرانوں کا بھی بغور جائزہ لیا تھا۔پھر جب یہ کام کرنے بیٹھے تو ایک نئی چیز وجود میں آئی۔"بنگال اسکول" نے صرف قدیم مصوری پر اکتفا نہیں کیا،بلکہ جاپانی طرز سے بھی بہت کچھ سیکھا۔مشرق کو چھوڑ کر مغرب کا رخ کیا اور ان سے اخذ و استفادے کی بھرپور کوشش ہوئی۔بقول مولانا آزاد:

> "ہندوستانی مصور ی نے اجنتا کا دور دیکھا، اسے راجپوتوں نے گود میں پالا، مغلوں نے سر پر بٹھا یا، پروان چڑھا یا، پہاڑی اورکانگڑہ نے سینے سے لگایا،لیکن واہ رے بیسویں صدی کہ تیرے آغاز ہی سے ہماری لاڈلی کے ایسے دن پھر ے کہ تخت سے فرش پر آگئی۔۔۔۔انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے فن مصوری کا زوال تکمیل پا چکا تھا، جو فن مصوری کے شیدا تھے اور جن کی کوششوں اورشوق نظر سے مصور ی پروان چڑھا کر تی تھی،وہی ختم ہو گئے تو پھر مصور ی کس کے سہارے جیتی؟ دورمغلیہ کے ختم ہوتے ہی فن مصوری بھی قریب قریب ختم ہوگیا۔دلی قلم، پٹنہ قلم، اور کانگڑہ قلم کے نام سے کچھ رہا سہا باقی رہ گیا تھا،لیکن یہ بھی برائے نام تھا۔"
>
> (آجکل،دہلی مصوری نمبر ،اگست 1960، ص61)

برطانوی حکومت نے صرف مادر وطن کو غلام نہیں بنایا،بلکہ ہمارے علم وفن، تہذیب و تاریخ سب کچھ مٹانے کی کوشش کی۔ایسے پرآشوب دور میں بھلا فن مصوری کیسے پروان چڑھ سکتی تھی،لیکن قدرت کا اصول ہے کہ موسم خزاں کے بعد بہار،شب ظلمت کے بعد روزروشن ضرور اپنا جلوہ دکھا تا ہے۔ہندوستانی مصوری نے بھی مشکل حالات میں بال وپر نکالے اور پروان چڑھی۔ای۔بی۔ہیول اور سر جان ووڈروف نے ہندوستانی فنکاروں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی،بلکہ انھیں ہر طرح کا تعاون دیا۔ہندوستانی آرٹ اور کلچر کے مرکز کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

> "ہندوستانی مصوری کی نشاۃثانیہ کا ذکر کرتے ہوئے اگر جوراسنکو کا ذکر نہ کیا گیا توبات ادھوری رہ جائے گی۔جوراسنکوکلکتہ میں ٹیگور خاندان کا وہ قدیمی مکان ہے،جہاں ہندوستانی آرٹ و کلچر نے پھر سے نیا جنم لیا،جہاں چند سر پھرے مصوروں نے فن

مصوری میں انقلاب لانے کی کوشش کی۔یہ وہ جگہ ہے جہاں ہندوستانی مصوری، رقص،موسیقی، مجسمہ سازی،شاعری اور ڈراما نت نئی شکلیں اختیار کرتے تھے۔یہاں فنکار وں کا مجمع لگا رہتا تھا اور ہندوستانی کلچر کا ایسا اکھاڑہ جما رہتا تھا۔۔۔۔۔۔ابنندر ناتھ ٹیگور اپنے مو قلم سے وہ رنگین شکلیں بناتے تھے کہ دیکھنے والا ٹکٹکی باندھے شاہ کار کو دیکھتا رہتا تھا۔" (آجکل مصوری نمبر ،66 اگست1960، ص65)

اپندر ناتھ ٹیگور کا طرز مصوری ایک ملا جلا جدید طرز مصوری ہے،جس میں ہندوستان کی قدیم طرز (اجنتا، مغل، راجپوت) جاپانی آرٹ اور ایرانی نقش ونگار آپس میں گھل کر گنگا جمنی شکل میں ڈھل گئے ہیں۔اس طرز کو ماہرین نے واش تکنیک کا نام دیا ہے۔یہی خاص اسٹائل بنگال اسکول کا طرہ ٔامتیاز ہے۔

8.3.3 فن رقص و موسیقی:

موسیقی سے متعلق مولانا آزاد نے بہت سے ایسے علما کا ذکر کیا ہے جو خود فن موسیقی میں مہارت رکھتے تھے۔مثال کے طور پر علامہ سعد اللہ خان چنیوٹی جو شاہجہانی کہلائے کیونکہ شاہجہان نے انہیں اپنے بیٹوں کے لیے اتالیق مقرر کیا اور بعد ازاں شاہجہان کے معتمد خاص اور وزیر اعلیٰ بھی رہے۔علامہ سعد اللہ خان چنیوٹی مُلا عبد السلام لاہوری کے شاگرد تھے۔ محدث گجرات ، قاضی القضا شیخ عبد الوہاب کے خاندان سے تعلق رکھنے والے علما شیخ معالی خان اور مُلا طاہر پٹنی کی انگلیاں آلات غناء سے ہم آہنگ تھیں۔مُلا عبد القادر بدایونی جیسے زاہد خشک اور متشرع ومتصلب عالم دین بھی بین بجانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔الغرض مولانا آزاد کا خیال ہے کہ وہ علما جو کسی وجہ سے اشتغال موسیقی سے دامن گیر نہ ہوئے،وہ بھی فن کے ماہر اور نکتہ شناس ضرور تھے۔ مغل بادشاہ اکبر کے دور میں فن موسیقی عروج پر تھا اور اسے دیگر فنون دانش مندی میں امتیازی حیثیت حاصل تھی۔موسیقی میں مہارت حاصل کیے بغیر تحصیل علم کا مرحلہ مکمل نہ ہوتا اور شرفا اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتے وقت موسیقی کے باکمالانِ فن کی خدمات ضرور حاصل کرتے۔اگرچہ موسیقی اور شاعری ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں اور ان کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے مگر باوجود ہمارے ہاں الفاظ کے تخیل پر تو کسی کو اعتراض نہیں مگر ساز و آواز کے ملاپ پر غل مچ جاتا ہے۔موسیقی اور شاعری تو ایک دوسرے کا پرتو ہیں کیونکہ دُھن بنانے والا فنکار خوش الحانی کے اجزائے ترکیبی کو وزن وتناسب کے اعتبار سے ترتیب دیتا ہے تو شاعر تخیل کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے ہوئے الفاظ و معنی کے حسین امتزاج میں ڈھال دیتا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں دیگر فنون لطیفہ کو بیک جنبش قلم حرام اور غیر اسلامی قرار دے دیا گیا،اسی طرح موسیقی کو بھی ناچنے گانے والوں سے جوڑ کر بے توقیر کر دیا گیا۔موسیقی کو حرام قرار دینے والے علما کی نیت شاید یہ رہی ہو گی کہ موسیقی کے سیلاب کے آگے بند نہ باندھا گیا تو رفتہ رفتہ رقص وسرود مجروں کی شکل اختیار کر لے گا اور موسیقی اباحیت کے فروغ کا موجب بنے گی، لیکن اس سے ہمارا معاشرہ عجیب وغریب تضادات کا شکار ہو گیا ہے۔اب ہم گلوکاروں، موسیقاروں اور فنکاروں سے لاتعلق تو نہیں رہ سکتے اور اپنی جبلت کے پیش نظر ان کے تراشیدہ فن سے لطف اندوز تو ہوتے ہیں مگر ان فن کاروں کو معاشرے میں قابل احترام مقام دینے کو تیار نہیں۔ موسیقی سے متعلق ہمارے ہاں منفی طرز عمل کیسے پیدا

ہوا؟غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فن جب طوائفوں اور بھانڈوں تک محدود ہو گیا تو اس کی پہلے جیسی قدر و اہمیت نہ رہی۔اس کی مثال بلیئرڈ یا اسنوکر جیسی ہے۔دیگر تفریحی سرگرمیوں کی طرح یہ کھیل بھی برا نہیں، لیکن جب بلیئرڈ کلب منفی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے اور یہ کھیل محض آوارہ اور اوباش لڑکوں تک محدود ہو گیا تو معاشرے میں اس سے متعلق تاثر تبدیل ہو گیا۔یقیناً موسیقی سمیت فنون لطیفہ کی حدود و قیود ضرور مقرر ہونی چاہئیں، لیکن علما یہ وضاحت ضرور سامنے لائیں کہ اسلام فنون لطیفہ کے خلاف نہیں۔

یہ بات سچ ہے کہ انسانی شخصیت کا ایک قوی پہلو جمالیاتی ہے۔اس جذبے کے تحت انسان شعر وادب اور فنون لطیفہ سے غیر معمولی دل چسپی رکھتا ہے۔فنون لطیفہ ہمارے خیالات کو حسین اور پر ثروت بناتے ہیں۔قومی رواداری اور بھائی چارے کو فروغ دیتے ہیں۔مولانا آزاد نے فن موسیقی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے عہد مغلیہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس عہد میں اس فن کی کیا قدر وقیمت تھی۔"غبار خاطر "میں مولانا آزاد رقم طراز ہیں :

> "اسی عہد میں یہ بات ہوئی کہ موسیقی کا فن بھی فنون دانش مندی میں داخل ہو گیا اور اس کی تحصیل کے بغیر تحصیل علم اور تکمیل تہذیب کا معاملہ ناقص سمجھا جانے لگا۔امرا اور شرفا کی اولاد کی تعلیم وتربیت کے لیے جس طرح تمام فنون کا اہتمام کیا جاتا تھا، اسی طرح موسیقی کی تحصیل کا بھی اہتمام کیا جاتا۔۔۔جونوجوان تکمیل علم کے لیے بڑے شہروں میں آتے،وہ وہاں کے عالموں اور مدرسوں کے ساتھ وہاں کے باکمالان موسیقی کو بھی ڈھونڈتے، پھر ان کے حلقۂ تعلیم میں زانوے تعلیم تہ کرتے۔"

(مولانا آزاد (مرتبہ:مالک رام)،غبار خاطر،ص370)

فن شاعری، فن تعمیر،فن موسیقی ،فن سنگ تراشی اور فن مصوری بظاہر یہ پانچوں فنون ایک دوسرے سے علاحدہ اور مختلف ہیں۔جہاں شاعری کاذکر آتا ہے تو مصوری ،موسیقی اور فن تعمیر کا تصور ذہن میں نہیں آتا ہے۔اور نہ شاعر سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ مصور ی ،سنگ تراشی اور فن تعمیر وغیرہ کی پیچیدگیوں سے آشنا ہو۔ہر چند کہ ان فنون میں ایک نسبت قائم ہے۔ان فنون کا تخیل اور تصور ایک ہی اصول کے تابع ہوتا ہے۔ایک ہی کشش اور جذبہ ہے ،جو اس کوچے کی سیر کراتا ہے۔خلاق فطرت نے ہر شخص کو فنون لطیفہ کا مذاق ودیعت کیا ہے۔

حسن کا احساس ہی فنون کی تدوین کا موجب ہوا ،فن کے خیال کے ساتھ ہی حسن کا تصور بھی ذہن انسانی میں ابھرتا ہے۔انسان کی فطرت میں خدا نے حسن پرستی کا جذبہ رکھا ہے ،فنون لطیفہ نزاکت ،نفاست اور لطافت سے عبارت ہوتے ہیں۔

مولانا آزاد خود ذوق لطیف اور طبع سلیم کے مالک تھے۔اوائل عمر میں انھوں نے شاعری بھی کی اور آزاد تخلص رکھا لیکن سیاسی اور صحافتی زندگی کی ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے وہ اس طرف توجہ نہ دے سکے۔موسیقی اور شاعری کے باہمی ربط

و تعلق پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو مختلف جلوے ہیں۔اور ٹھیک ایک ہی طریقے پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔موسیقی کا مولف الحان کے اجزا کو وزن و تناسب کے ساتھ ترکیب دیتا ہے۔اسی طرح شاعر بھی الفاظ و معانی کے اجزا کو حسن ترکیب کے ساتھ باہم جوڑتا ہے جو حقائق شعر میں الفاظ و معنی کے جامہ پہن لیتے ہیں وہی موسیقی میں الحان وایقان کا بھیس اختیار کر لیتے ہیں۔نغمہ بھی ایک شعر ہے لیکن اسے حرف و لفظ کا بھیس نہیں ملا۔اس نے اپنی روح معنی کے لیے نواؤں کا بھیس اختیار کر لیا یہ کیا بات ہے کہ بعض الحان درد و الم کے جذبات برانگیختہ کر دیتے ہیں بعض کے سننے سے مسرت و انبساط کے جذبات امنڈ نے لگتے ہیں، بعض کی لَے ایسی ہوتی ہے، جیسے کہہ رہی ہو کہ زندگی اور زندگی کے سارے ہنگامے ہیچ ہیں۔بعض کی لے ایسے محسوس ہوتی ہے جیسے اشارہ کر رہی ہو کہ:

یاراں ! صلائے عام است، گرمی کنید کارے

یہ وہی معانی ہیں جو جو موسیقی کی زبان پر ابھر نے لگتے ہیں ، اگر یہ شعر کا جامہ پہن لیتے تو کبھی حافظ کا ترانہ ہوتا کبھی خیام کا زمزمہ کبھی میلے کی ماتم سرائیاں کبھی ورڈس ورتھ کی حقائق سرائیاں۔"

"غبار خاطر "کے مکاتیب سے یہ راز بھی منکشف ہوتا ہے کہ مولانا آزاد ادب و فنون لطیفہ کے شیدائی تھے۔اس فن کو سیکھنے کا شوق کب اور کیسے پیدا ہوا اس حوالے سے تفصیلی گفتگو "غبار خاطر" میں موجود ہے۔1905 ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد مولانا آزاد وقتی طور پر تدریس کے پیشے سے وابستہ ہوگئے ،لیکن مطالعے کا شوق اکثر و بیشتر انھیں کتب فروش خدا بخش کے یہاں کھینچ لے جاتا تھا۔یہ دوکان ویلزی اسٹریٹ میں مدرسہ کالج کے سامنے واقع تھی۔ایک دن دوکاندار نے مولانا آزاد کو فقیر اللہ سیف کی "راگ درپن" کا ایک خوش خط اور مصور نسخہ دکھایا اور بتایا کہ یہ کتاب فن موسیقی پر ہے۔

فقیر اللہ سیف خان عالم گیری عہد کا ایک رئیس تھا اور ہندوستا نی موسیقی میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔اس نے سنسکرت کی ایک کتاب کا جس کا تعلق علم موسیقی سے تھا ،فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "راگ درپن " رکھا۔مولانا آزاد نے کتاب ہاتھ میں لی اور اس کا دیباچہ ملاحظہ فر مارہے تھے کہ اسی دوران مسٹر ڈینسن راس آگئے ،جو اس زمانے میں مدرسہ عالیہ کے پرنسپل کے عہدے پر مامور تھے۔فارسی کے اچھے اسکالر تھے اور ایرانی لہجے میں فارسی بولتے تھے۔ایک کمسن لڑکے کے ہاتھ میں فارسی کا ایک قلمی نسخہ دیکھ کر حیرت و استعجاب میں پڑ گئے اور فارسی میں مولانا کو مخاطب کیا کہ یہ کتاب

کس مصنف کی ہے اور کس موضوع پر ہے۔مولانا نے فارسی میں جواب دیا کہ یہ کتاب فن موسیقی پر ہے اور اس کا مصنف فقیراللہ سیف خان ہے۔جواب پاکر مسٹر ڈینسن کی حیرانی میں اور اضافہ ہوا۔انہوں نے کتاب مولانا آزاد کے ہاتھ سے لی اور ملاحظہ فرمانے کے بعد کہا کہ ہندوستان کا فن موسیقی بہت مشکل فن ہے ،کیا تم اس کتاب کے مطالب سمجھ سکتے ہو ،مولانا آزاد نے جواب دیا کہ کتاب اسی لیے لکھی جاتی ہے کہ لوگ اسے پڑھیں اور سمجھیں۔میں بھی اسے پڑھوں گا تو سمجھ لوں گا۔مسٹر ڈینسن نے مسکراتے ہوئے کہا کہ تم اسے نہیں سمجھ سکتے ہو، ایک صفحے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کا مطلب بتاؤ۔مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ انہوں نے جس صفحہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"اس میں مبادیات کی بعض تقسیموں کا بیان تھا۔میں نے الفاظ پڑھ لیے ،مگر مطلب سمجھ میں نہیں آیا ،شرمندہ ہوکر خاموش ہوگیا اور بالآخر کہنا پڑا کہ اس وقت اس کا مطلب بیان نہیں کر سکتا ،بغور مطالعہ کرنے کے بعد بیان کرسکوں گا۔"

(مولاناآزاد،غبار خاطر ،ساہتیہ اکادمی ،دہلی 1991، ص 253)

مولانا اس کتاب کو گھر لائے،پڑھنے اور سمجھنے کی لاکھ کوشش کی ،لیکن کچھ پلے نہ پڑا ،اس رکاوٹ کی وجہ سے انھیں سخت کوفت ہوئی ،حالانکہ طالب علمی کے زمانے سے یہ معمول رہا کہ جو بھی کتاب ہاتھ لگی ،اس پر ایک نظر ڈالی اور تمام معانی اور مطالب ان پر واضح ہوگئے لیکن یہاں معاملہ بالکل بر عکس تھا ،معلوم یہ ہوا کہ جب تک موسیقی کے مصطلحات کا علم نہ ہو اور کسی ماہر فن کار سے فن موسیقی کی مبادیات نہ سیکھ لی جائیں ،اس کتاب کو سمجھنا کارے دارد ہے۔چناں چہ مولاناآزاد کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کسی ماہر فن کار سے مدد لی جائے۔خاندانی ماحول اور حالات مانع تھے ،اس کوچے سے رسم وراہ رکھنے والے سے شناسائی پیدا کرنا آسان کام نہ تھا۔لہٰذا سبیل یہ نکا لی کہ والد محترم کے ایک مرید مسیتا خان سے مدد لی اور ایک رازدار کے گھر پر نشست وبرخاست کا سلسہ شروع ہوا ،اس کاطریقہ تعلیم پرُانا اور رٹا ہوا تھا۔مولانا آزاد اس روایتی طریقے سے خوش نہ تھے، لہٰذا اپنے طریقے سے معلومات اکٹھا کرنے لگے۔اور "معارف النغمات " نامی ایک کتاب ترتیب دی۔

مولانا آزاد نے موسیقی میں سب سے زیادہ توجہ ستار پر دی اور اس فن میں مہارت تامہ بہم پہنچائی۔پھر یک قلم یہ سلسلہ منقطع ہوگیا ،لیکن انگلیوں پر مضراب کانشان ایک زمانے تک نقش رہا۔(بقول آزاد) "مقصود اس اشتغال سے صرف یہ تھا کہ طبیعت اس کوچے سے ناآشنا نہ رہے ،کیوں کہ طبیعت کا توازن اور فکر کی لطافت بغیر موسیقی کی ممارست کے حاصل نہیں ہوسکتی۔"(غبار خاطر،ص257)مسیتا خان کے علاوہ قیام لکھنؤ کے دوران مرزا ہادی رسوا سے اس فن کی باریکیوں کو سیکھا اور پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ بقول آزاد :

"میں آپ سے ایک بات کہوں ! میں نے بارہا اپنی طبیعت کوٹٹولا ہے۔میں زندگی کی

احتیاجوں میں سے ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں، لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔آواز خوش میرے لیے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا، اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے:

روئے نکو معالجۂ عمر کوتہ ست
ایں نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ اند"

موسیقی ہو یا دوسرے علوم وفنون جس میدان میں مولانا آزاد نے قدم رکھا ،اس میں کامل دست گاہ حاصل کی۔ مولانا کی طبیعت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جایئے، ناقصوں اور خام کاروں کی طرح نہ جایئے۔اس تعلق سے وہ" تذکرہ" میں لکھتے ہیں:

" جس حال میں رہے نقص و نا تمامی سے دل کو گریز رہا اور شیوہ تقلید وروش عام سے پر ہیز۔جہاں کہیں رہے اور جس حال میں رہے، کبھی کسی دوسرے کے نقش قدم کی تلاش نہ ہوئی رندی و ہوس نا کی کا عالم رہا تو اس کو بھی نا تمام نہ چھوڑا عشق کی خود فراموشیاں رہیں تو وہاں بھی کسی وادی اور کسی گوشے سے اپنے قدم نا آشنا نہ رہے۔"

مولانا آزاد نے 1908میں مصر وشام کا سفر کیا ،تو عربی موسیقی کی طرف متوجہ ہوئے۔تلاش و تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ قدما کی بہت سی مصطلحات "کتاب الاغانی"اور "خوارزمی "وغیرہ میں موجود ہیں۔مصر کے مشہور موسیقی داں شیخ احمد سلامہ حجازی سے ایک دوست کے ذریعے ملاقات ہوئی اور ان سے عربی موسیقی پر مذاکرات کیے۔مولانا کی تلاش وجستجو کا سلسلہ یہی نہیں رکا ،بلکہ ایک مصری مغنیہ جوخود بلائے جاں اور اس کی آواز اس سے بھی زیادہ آفت ہوش وایمان تھی ، مولاناآزاد نے اس سے بھی شناسائی بہم پہچائی اور عربی موسیقی کے کمالا ت سنے۔اس کے بعد ریڈیو پر ام کلثوم کے بے شمار ریکارڈ سنے اور اس سے بھی بے حد متاثر ہوئے۔مولانا آزاد یونان و عرب اور ہندوستان کی موسیقی کا جائزہ لینے کے بعد "غبار خاطر" میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

"کتنے ہی مقدس علما ہیں جن کے حالات پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ گو موسیقی کے اشتغال سے دامن بچائے رہے ،لیکن اس فن کے ماہر اور نکتہ شناس تھے۔ملا مبارک ہندوستانی موسیقی کا عالم وماہر تھا۔اکبر نے اسے تان سین کا گانا سنایا تو صرف اتنی داد ملی کہ" ہاں گالیتا ہے "۔۔۔ملا عبدالقادر بدایونی جیسا متشرع اورمتصلب شخص بین بجانے میں پوری مہارت رکھتا تھا۔۔علامہ سعداللہ شاہجہانی جن کی علمی فضیلت اور ثقاہت طبع کا تمام معاصر اعتراف کرتے ہیں۔موسیقی اور سنگیت کی ہر شاخ پر نظر

رکھتے تھے۔" (غبار خاطر، ص271)

مولانا آزاد نے "غبار خاطر" میں عربوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے تمام علوم وفنون میں گہری دلچسپی دکھائی ،لیکن فن موسیقی کی طرف ایک نگاہ غلط بھی نہ ڈال سکے۔غالباً اس عدم توجہی کی اصل وجہ علوم عقلیہ سے ان کا شوق و اشتغال ہے،جس نے انھیں فنون لطیفہ کی طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہ دی۔مولانا آزاد نے ایک دوسری وجہ یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ عربوں کا ذوق سماع ہندوستان کے ذوق سماع سے بے حد مختلف تھا ،اس لیے بھی یہ دور ی پیدا ہوئی۔عرب مصنفین نےتقریباً یہی رویہ ہندوستانی ڈراموں اور یونانی فنون لطیفہ کے ساتھ بھی روا رکھا۔یونانی شاعری اور ڈراموں سے وہ بہت کم واقف تھے ،لیکن عربوں نے جو تغافل یونانی ادبیات سے برتا تھا ،وہ اس فن کے موسیقی سے نہ برت سکے۔بقول مولانا آزاد :

"یونان کے فن موسیقی پر عربی میں کتابیں لکھی گئیں اور ریاضی کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس کا عام طور پر مطالعہ کیا گیا۔یونانیوں نے آسمان کے بارہ فرضی برجوں کی مناسبت سے راگنیوں کی بارہ بنیادی تقسیمیں کی تھیں اور ہر راگنی کو کسی ایک برج کی طرف منسوب کر دیا تھا۔عربوں نے بھی اسی بنیاد پر عمارت اٹھائی ۔۔۔اب ہندوستان کے علوم و فنون مسلمانوں کے لیے غیر ملکی نہیں رہے تھے ،بلکہ خود ان کے گھر کی دولت بن گئے تھے۔اس لیے ممکن نہ تھا کہ ہندوستانی موسیقی کے علم وذوق سے وہ تغافل برتتے۔" (غبار خاطر ،ص267-268)

1947ء میں جب ہندستان آزاد ہوا تو ہندوستانی سیاست میں ایک نیا موڑ آچکا تھا۔برطانوی راج ختم ہوچکا تھا ،لیکن تقسیم کا عذاب مسلط کر چکا تھا۔نو آبادیاتی نظام کی لعنتیں عفریت کی طرح سر اٹھا رہی تھیں۔مولانا آزاد کے نزدیک بہت سے ایسے مسائل تھے جو خصوصی توجہ کے طالب تھے۔ان میں سے ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ سرگرمیوں کی تجدید کی جائے۔پچھلے ڈیڑھ سو برسوں میں فنون لطیفہ چاہے وہ موسیقی ہو یا رقص ،ادب ہو یاڈراما ،اس کی طرف وہ توجہ نہیں ہوئی جو اس کے مکمل ارتقا کے لیے ضروری تھا۔اس حوالے سے مولانا آزاد فرماتے ہیں :

"مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد فنون لطیفہ کی مختلف اصناف کی ریاستی سطح پر حوصلہ افزائی ہوئی۔۔۔انہوں نے علاقائی سطح پر اپنے یہاں ان فنون لطیفہ کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔۔۔۔اور پھر شاہی نظام کے ختم ہو جانے کے ساتھ وہ سرپرستی جو اس کے تحت فنون لطیفہ کی ہوتی تھی، وہ بھی باقی نہیں رہی،جمہوری نظام میں فنون لطیفہ کا فروغ عوام کی دل چسپی سے ہوتا ہے۔"

(سیدہ سیدین حمید، امام الہند:ابوالکلام آزاد،انڈین کلچرل ریلیشنز،حکومت ہند ،دہلی،، ص :278-279)

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ ابھی ہندوستان کو دوسرے ممالک کی تاریخ و تہذیب اور فنونِ لطیفہ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔نیز انجذاب و امتزاج کی کیفیت ہندوستانی سازوں میں موجود ہے۔،مختلف اور متنوع قسم کے تانیں ایران میں مقبول تھیں۔ ہندوستان نے حسب ضرورت تبدیلیاں کیں۔ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوششوں نے موسیقی کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔یہی معاملہ رقص کا بھی ہے۔ہندوستانی رقص کی خوبصورتی اور تنوع نے ادب اور آرٹ کے طالب علموں کو ہمیشہ اپنی طرف کھینچا ہے۔یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ کلاسیکی رقص کا ارتقا مندروں میں ہوا ،جس میں اظہار و بیان کے لاکھوں طریقے ہیں۔ہندوستانی رقص کے تنوع اور نزاکت کی مثال کسی اور ملک میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ہندوستانی تہذیب کی اصل روح یہی ہے کہ وہ دوسری تہذیب کے عناصر کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے اور اس کا بہترین اظہار موسیقی کے میدان میں ہوا ہے۔بقول مولانا آزاد :

> ”آج یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ کوئی تعلیم اس وقت تک مکمل ہو نہیں سکتی ،جب تک وہ انسان کے جذبات کی نشو ونما اور تہذیب پر توجہ نہ دے اور اس کے حصول کا بہترین طریقہ یہ ہے قوت ادراک کی سہولت مہیا کی جائے ،فنون لطیفہ کی کسی ایک شاخ کی مشق کرائی جائے۔اس عام سوا ل کے علاوہ کہ آرٹ کی تعلیم کے ذریعے انسانی شخصیت کے نازک اور لطیف پہلوؤں کی تربیت ہوتی ہے۔“

(سیدہ سیدین حمید ،امام الہند :امولانا ابوالکلام آزاد،ص282)

مولانا آزاد نے اس حوالے سے امیر خسرو کا خصوصی ذکر کیا ہے کہ انھوں نے ایران و ہند کی موسیقی کے امتزاج سے نئے نئے راگ ایجاد کیے۔موسیقی کے بعد رقص کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں :

> ”رقص کے میدان میں بھی ہندوستانی رقص کے تنوع نے ہمیشہ آرٹ و کلچر کے طالب علموں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔خالص کلاسیکل ہندوستانی رقص کا ارتقا مندروں میں ہوا جس میں اظہار کے لاتعداد طریقے ،اتارچڑھاؤ،حیرت انگیز موزونیت ،سرتال اس سرزمین کی مختلف علاقوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ہندوستانی رقص کے تنوع اور نزاکت کی مثال دنیا بھر میں شاید ہی کہیں ملے۔اس روایت کا تسلسل اور توانائی جس کا اظہار آج تک ہورہا ہے ،قابل تعریف ہے۔رقص ،موسیقی اورڈرامے کی یہ قیمتی میراث ہے۔اس کو فروغ دینا اور اس میں اضافہ کرنا ہے۔اپنے لیے ہی نہیں ،ہمیں اس لیے بھی یہ کرنا ہے کہ یہ انسانیت کی میراث ہے۔“

(سیدہ سیدین حمید ،امام الہند :مولانا ابوالکلام آزاد،ص281)

غالب کے بعد مولانا آزاد تنہا ایسے شخص تھے ، جن کی تقلید کوئی نہ کر سکا ، علوم وفنون اور ادب و انشا کے میدان میں انھوں نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔اگر وہ اتنے بڑے عالم ، خطیب ، صحافی ، ادیب اور سیاست داں نہ ہوتے تو شاید ایک بڑے مصور یا ماہر موسیقی ہوتے ،جس زمانے میں موسیقی کی طرف میلان تھا۔طبیعت کی خود رفتگی اور محویت کے بعض نا قابل فراموش واقعات کا ذکر مولانا نے خود کیا ہے۔انھیں میں سے ایک واقعہ آگرے کے سفر کے دوران کا ہے۔ مولانا آزاد نے ایک خط میں تاج محل کا ذکر کرتے ہوئے بہت ہی دلچسپ منظر کھینچا ہے۔ساحرانہ انداز بیان ملاحظہ ہو:

> ”اپریل کا مہینہ تھا اور چاندنی کی ڈھلتی ہوئی راتیں تھیں۔جب رات کی پچھلی پہر شروع ہونے کو ہوتی تو چاند پردہ شب ہٹا کر یکا یک جھانکنے لگتا۔رات کو ستار لے کر تاج چلا جاتا اور اس کی چھت پر جمنا کے رخ بیٹھ جاتا۔پھر جوں ہی چاندنی پھیلنے لگتی ، ستار پر کوئی گیت چھیڑ دیتا اور اس میں محو ہو جاتا۔کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریب تخیل کے کیسے کیسے جلوے انہی آنکھوں کے آگے گزر چکے ہیں۔رات کا سناٹا ستاروں کی چھاؤں ، ڈھلتی ہوئی چاندنی اور اپریل کی بھیگی ہوئی رات۔چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے۔برجیاں دم بخود بیٹھی تھیں۔بیچ میں چاندنی سے دھلا ہو ا مر مر میں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا۔نیچے جمنا کی رو پہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے ستار سے نالہ ہائے بے حرف اٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے روک تیرنے لگتے۔“

8.3.4 فن شاعری:

فنون لطیفہ میں فن شاعری کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ شاعری میں مادی اشیا کا استعمال نہ کے برابر ہوتا ہے۔اس کا پورا دارومدار احساسات وجذبات پر ہوتا ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد کا تصور تعلیم عالم گیر انسانیت کو محیط ہے۔وہ سماج اور معاشرہ میں ہم آہنگی، توازن اور اعتدال کو تعلیم کے ذریعے فروغ دینا چاہتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ روئے زمین پر آباد تمام انسانوں کے جذبات واحساسات میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔لہذا علاقائی و مقامی رنگ میں رنگے اور خاص ماحول کے زائیدہ ہونے کے باوجود ادب اور فنون لطیفہ آفاقی صفات کے حامل ہوتے ہیں۔یہی خوبی ادب و دیگر فنون لطیفہ کو مکانی حدوداور زمانی قیود سے آزاد کرتی ہے اور انسانیت کا ترجمان بناتی ہے۔اسی لیے مختلف زبانوں کے ادب اور فنون لطیفہ میں گہری مماثلت یا یکسانیت دیکھنے کو ملتی ہے۔فنون لطیفہ انسان کے کردار سے نفس پرستی،خودغرضی،بغض وحسد،کینہ وعناد، مکاری، عیاری، دوسروں کو فریب اور سازش کا شکار بنانے کے وحشیانہ اور غیر اخلاقی میلانات کی برائی اور نقصان کو اجاگر کرتے ہیں۔فن

کاری،خاموشی اور معصومیت کے ساتھ زندگی کو فروغ دیتی رہی ہے۔مولانا آزاد اوائل عمر ہی سے ادب اور فنون لطیفہ کے شیدائی تھے۔وہ شاعری کو انسان کے باطن کی تطہیر کا ایک عمدہ ذریعہ خیال کرتے تھے۔ان کے مطابق اخلاق بھی ایک قوت ہے ، جو انسان کے باطن میں پوشیدہ ہوتی ہے۔شاعری اس مخفی صلاحیت کو رو بہ عمل لاتی ہے، حیوانی جذبات و خواہشات پر قابو پانے کا گر سکھاتی ہے۔انسان دوستی اور خیر خواہی کے جذبات کو فروغ بخشتی ہے۔یہ انسانی فطرت کی نیرنگی اور بو قلمونی کو ایک رنگ دیتی ہے۔یہ انسانوں کے درمیان تفریق اور حد بندی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔یہ عالم انسانیت کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔فنونِ لطیفہ کی ایک نمائش منعقدہ 5 مارچ1953) کا افتتاح کرتے وقت مولانا آزاد نے کہا تھا:

> ''فن برائے فن اور فن برائے زندگی کی بحث قطعی فضول ہے۔دراصل دونوں مقولوں کے بطن میں ایک ہی حقیقت مخفی ہے۔ حقیقی فن افراد کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا محتاج نہیں ہوا کرتا لیکن ایسی صورت میں وہ سب کے جذبات کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ معیاری فن ہمیشہ حقیقی تعلیم کا موثر ذریعہ ہوتا ہے۔وہ جذبات کو سنوارتا ہے اور ادراک و تخیل کی تربیت کرتا ہے۔سیاسی طور پر دنیا علاحدہ علاحدہ جماعتوں میں تقسیم ہوتی ہے لیکن فلسفہ، ادب اور فن کے معاملے میں انسانی برادری کی سالمیت برقرار ہی رہتی ہے۔اس میدان میں ایک ذہن کی تخلیق ، ساری نوع انسانی کا سرمایہ بن جاتی ہے۔''

مولانا آزاد بہت ہی ذہین اور حساس شخصیت کے مالک تھے۔انہوں نے اپنے ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔ان کو شاعری کا شوق عبدالواحد خاں سہر سامی کی وجہ سے پیدا ہوا۔مولانا آزاد نے اپنا پہلا مشاعرہ عبدالواحد خاں کے ساتھ پڑھا۔اس تعلق سے مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"یہ پہلی منظم دلچسپی ہے،جو میرے حافظے میں شاعری کی نسبت پائی جاتی ہے، مجھ پر اس کا بہت اثر پڑا۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی،حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی،1985،ص238)

اس مشاعرے کے بعد عبدالواحد خاں سے مولانا آزاد کی خاص صحبتیں رہنے لگیں۔وہ اردو شعرا کا ذکر کرتے،ان کے مقابلے اور معرکے کے لطائف سناتے اور اس طرح شاعری سے مولانا آزاد کی دلچسپی بڑھنے لگی۔مثال کے طور پر ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نشتر بدل ہے آہ کسی سخت جاں کی　　نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی
گنبد ہے گرد باد تو ہے شامیانہ گرد　　شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی
آزادؔ بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ　　پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

مولانا آزاد کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ شعر میں وہ بندش الفاظ کے نگینے جڑنے اور رعایت لفظی کی دکان سجانے سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ ابھی روایتی اور مقبول عام کلیوں ہی کے گرفتار تھے کہ یہ سلسلہ کثرتِ مشاغل کی بنا پر خود ترک ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد شاعری میں کچھ خاص مقام حاصل نہیں کر سکے۔

مولانا آزاد نے آرٹ کے فروغ میں عوامی اور غیر سرکاری اداروں کے باہمی تعاون پر کافی زور دیا ہے ان اکادمیوں کے قیام کا مقصد ادب اور فنون لطیفہ کے معیار و میزان کو بلند کرنا تھا۔ مولانا آزاد کی قیادت اور دانش مندی سے ادب بالخصوص، موسیقی، فن تعمیر، مصوری اور مجسمہ سازی وغیرہ کا خوب فروغ حاصل ہوا۔ ان اکادمیوں کے قیام کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد حسن لکھتے ہیں:

> "فنون لطیفہ اور ادبیات کے فروغ کے لیے مولانا آزاد نے اکادمیوں کی بنیادڈالی۔۔۔ ادب کے لیے ساہتیہ اکادمی ،رقص و موسیقی کے لیے سنگیت ناٹک اکادمی اور مصوری وغیرہ کے لیے للت کلا اکادمی۔ ان تینوں اکادمیوں کے سربراہ مولانا آزاد ہی تھے اور ان اکادمیوں کا یہی کام نہیں تھا کہ وہ ملک کے مقتدر فن کاروں کو انعام واکرام تقسیم کریں ، بلکہ یہ بھی تھا کہ وہ ملک کے مختلف علاقوں کے ادبی اور فنی میلانات کو سمو کر ، انھیں قومی سطح پر ایک فنی وحدت اور فروغ عطا کریں۔"

مولانا آزاد کا خیال ہے کہ جنگ و جدل اور نفرت و عداوت کے صحرا میں بھی ادب، فلسفہ ، آرٹ دوسرے فنون لطیفہ مل کر امن و آشتی اور خیر سگالی کو فروغ دے سکتے ہیں اور یہ فریضہ انھوں نے انجام بھی دیا ہے۔اور اس لیے ادب اور فنون لطیفہ کو لازمی طور پر قومی تعلیمی پالیسی میں بلند جگہ ملنی چاہیے ، تا کہ ہمارا ملک امن و سلامتی کا گہوارہ بنے اور انسان دوستی کا جذبہ عام ہو۔

8.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- فنون لطیفہ کو انگریزی میں (Fine Arts) کہا جاتا ہے۔ وہ فنون جو انسان کے ذوق، آرائش وجمال کی تسکین کے لیے وجود میں آتے ہیں، انہیں فنون لطیفہ کہا جاتا ہے۔
- جب سے آدم اور ابن آدم نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں اس وقت سے انسانی جذبات اس کے ساتھ ہیں۔ اس لیے فنون کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی زندگی کی تاریخ ہے۔
- البتہ گزرتے وقت کے ساتھ فنون کی لے بھی بدلی، رنگ بھی بدلے، تراش وخراش کے معیار بھی بدلے اور الفاظ کو مختلف

طریقوں سے ادا کرنے کا ڈھنگ بھی بدلتا گیا۔اس لیے فنون لطیفہ کو سمجھنے کے لیے انسانی جذبات و احساسات کا ادراک بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

- فنون لطیفہ کا مقصد تخلیق حسن ہے اور جو پیکر وجود میں آتا ہے وہ فن کا اظہار ہے۔ یہ اظہار مختلف صورتوں میں آتا ہے، کبھی یہ ہوتا ہے کہ فصل کٹتی ہے تو خوشی میں خود بہ خود انسان کے ہونٹوں سے ایسی آوازیں نکلتی ہیں، جن میں لے اور آہنگ پیدا ہوتا ہے اور پھر یہی فن بہت ساری شرائط کے ساتھ تال اور سُر سے ہم آہنگ ہو کر موسیقی میں بدل جاتا ہے۔
- فنون لطیفہ کی متعدد قسمیں بتائی گئی ہیں، جن میں فن تعمیر، فن مجسمہ سازی، فن مصوری، فن رقص و موسیقی اور فن شاعری یا ادب بہت اہم ہیں۔
- فنون لطیفہ کی ان تمام اقسام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک وہ جنہیں ہم آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں جیسے فن تعمیر، فن مجسمہ سازی اور فن مصوری اور دوسرا وہ جن کا لطف کانوں سے سن کر اٹھایا جاسکتا ہے جیسے رقص و موسیقی اور شاعری یا ادب۔
- بعض لوگ تقریر اور تحریر کو بھی فنون لطیفہ کی قسموں میں شمار کرتے ہیں۔اس کے علاوہ جدید دور میں کچھ لوگ پکوان اور فلم کو بھی فنون لطیفہ کا حصہ مانتے ہیں۔
- ہیگل کا خیال ہے کہ فنون لطیفہ کی پانچوں شاخوں میں درجات قائم کیے جاسکتے ہیں۔اس کا کہنا ہے کہ ایسی درجہ بندی کرتے وقت شاعری یا ادب کو سب سے بڑا درجہ دیا جاسکتا ہے اور فن تعمیر کو سب سے کم۔اس نے یہ درجہ بندی کرنے کے لیے جو اصول مقرر کیا ہے وہ ہے مادی وسائل کا استعمال، جن فنون میں مادی استعمال کم سے کم ہو گا اس میں فنی حیثیت بلند ہو گی۔
- ”غبار خاطر “کے مکاتیب سے یہ راز بھی منکشف ہوتا ہے کہ مولانا آزاد ادب و فنون لطیفہ کے شیدائی تھے۔اس فن کو سیکھنے کا شوق کب اور کیسے پیدا ہوا اس حوالے سے تفصیلی گفتگو ”غبار خاطر“ میں موجود ہے۔
- مولانا آزاد نے موسیقی میں سب سے زیادہ توجہ ستار پر دی اور اس فن میں مہارت تامہ بہم پہنچائی۔پھر یک قلم یہ سلسلہ منقطع ہو گیا ،لیکن انگلیوں پر مضراب کا نشان ایک زمانے تک نقش رہا۔
- موسیقی ہو یا دوسرے علوم وفنون جس میدان میں مولانا آزاد نے قدم رکھا ،اس میں کامل دست گاہ حاصل کی۔ مولانا کی طبیعت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جایئے، ناقصوں اور خام کاروں کی طرح نہ جایئے۔
- فنون لطیفہ میں فن شاعری کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔کیوں کہ شاعری میں مادی اشیا کا استعمال نہ کے برابر ہوتا ہے۔اس کا پورا دارومدار احساسات و جذبات پر ہوتا ہے۔
- مولانا آزاد بہت ہی ذہین اور حساس شخصیت کے مالک تھے۔انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔ان کو شاعری کا شوق عبدالواحد خاں سہرامی کی وجہ سے پیدا ہوا۔مولانا آزاد نے اپنا پہلا مشاعرہ عبدالواحد خاں کے ساتھ پڑھا۔
- مولانا آزاد اوائل عمر ہی سے ادب اور فنون لطیفہ کے شیدائی تھے۔وہ شاعری کو انسان کے باطن کی تطہیر کا ایک عمدہ ذریعہ خیال کرتے تھے۔

8.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
اکناف	:	کنف کی جمع، اطراف، سمتیں
مبہوت	:	بھونچکا، ہیبت زدہ، کمزور
مغنیہ	:	گانے والی، میراثن
اتالیق	:	معلم، استاد، تربیت دینے والا
بالیدگی	:	پختگی، پکاپن
متمدن	:	تمدن سے واقف، تربیت یافتہ
ثقاہت	:	سنجیدگی، بھاری بھرکم پن
صیقل	:	جلا دینے والا، آب و تاب
تجدید	:	نیا کرنے کا عمل، نئے سرے سے کوئی کام کرنے کی حالت
محویت	:	گہری سوچ میں ہونا، کسی خیال میں گم ہونا

8.6 نمونہ امتحانی سوالات

8.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. فنون لطیفہ کے لیے انگریزی میں کن الفاظ کا استعمال ہوتا ہے؟
2. رسالہ آج کل، دہلی نے مصور نمبر کب شائع کیا؟
3. سیدہ سیدین حمید نے مولانا آزاد پر کون سی کتاب مرتب کی ہے؟
4. مولانا آزاد نے مصر و شام کا سفر کس سنہ میں کیا؟
5. "جمالیات اور اردو شاعری" کس کی کتاب ہے؟
6. "غبار خاطر" کس نے مرتب کیا؟
7. "فنون لطیفہ اور جمالیات" کس کی تصنیف ہے؟
8. " ہندوستانی تاریخ و ثقافت اور فنون لطیفہ "کا مصنف کون ہے؟
9. ہیگل نے فنون لطیفہ کی کتنی شاخیں بتائی ہیں؟

10. "ادب کا مطالعہ" کس کی کتاب ہے؟

8.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. فنون لطیفہ کی تعریف و تفہیم پر مضمون لکھیے۔
2. فنون لطیفہ کی اقسام اور اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
3. فن تعمیر کے تعلق کے مولانا آزاد کے تصور کو واضح کیجیے۔
4. فن مصوری کے بارے میں مولانا آزاد کا کیا خیال ہے؟ بیان کیجیے۔
5. فنون لطیفہ کے تعلق سے ہیگل کے نظریے کو پیش کیجیے۔

8.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. فنون لطیفہ کے تعلق سے مولانا آزاد کے تصورات کو واضح کیجیے۔
2. فن شاعری کے بارے میں مولانا آزاد کا کیا تصور ہے؟ تفصیل سے بیان کیجیے۔
3. فن رقص و موسیقی کے متعلق مولانا آزاد کی آرا سے بحث کیجیے۔

8.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. فنون لطیفہ	مرزا سلطان احمد
2. ادب کا مطالعہ	اطہر پرویز
3. آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی	مولانا ابوالکلام آزاد
4. فنون لطیفہ اور جمالیات	محمد مظفر حسین
5. ہندوستانی تاریخ و ثقافت اور فنون لطیفہ	عتیق انور صدیقی
6. فنون لطیفہ (چند مضامین)	راشد انور راشد
7. مولانا ابوالکلام آزاد: فکر و فن	ملک زادہ منظور

بلاک III: مولانا آزاد کی صحافتی و ادبی خدمات

اکائی 9 : مولانا آزاد کی صحافتی خدمات

(الہلال اور البلاغ کے حوالے سے)

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 صحافت کا آغاز

9.2.1 نیرنگ عالم اور المصباح

9.2.2 لسان الصدق

9.2.3 حالی سے ملاقات

9.2.4 وکیل

9.2.5 الہلال

9.2.6 البلاغ

9.2.7 الہلال کی اہمیت

9.3 الہلال اور البلاغ کے بعد

9.3.1 پیغام

9.3.2 الہلال ثانی

9.3.3 الہلال کے مجموعی شمارے

9.4 مولانا آزاد کی صحافت کا ایک عمومی جائزہ

9.5 اکتسابی نتائج

9.6 کلیدی الفاظ

9.7 نمونہ امتحانی سوالات

9.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
9.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
9.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
9.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958) جدید ہندوستان کے سب سے نمایاں رہنماؤں میں سے ایک تھے۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے 20ویں صدی کے پہلے نصف میں مسلم سیاسی سوچ پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ نہ صرف ایک عظیم خطیب، سیاسی مدبر اور قومی رہنما تھے، بلکہ میدان صحافت کے شہسوار اور بے باک صحافی بھی تھے۔ مولانا آزاد نے 20ویں صدی کے پہلے عشرے میں کم از کم نصف درجن اخبارات اور رسائل کی کامیابی سے ادارت کی لیکن الہلال اور البلاغ ان کی صحافتی خدمات کی روشن مثال ہیں، جو ان کی حق پرست صحافت اور ان کی عظمت کی علامت ہیں۔ مولانا آزاد کی مادری زبان عربی تھی، اسی لیے ان کی تحریر میں عربی فارسی الفاظ کی کثرت پائی جاتی تھی۔ اس کے باوجود ان کی تحریر میں بلا کی دلچسپی اور جاذبیت تھی جو ان کی تحریر کو دیگر لوگوں سے ممتاز کرتی تھی۔ حالات حاضرہ اور دیگر توجہ طلب سماجی مسائل کو جس خوش اسلوبی سے مولانا بیان کرتے تھے، وہ دیگر مصنفوں اور ادیبوں سے بالکل مختلف اور منفرد تھا۔ وہ سماج میں موجود برائیوں کے ناقد تھے جیسا کہ انہوں نے جہیز کی تباہ کن رسم کو روکنے اور والدین کو قرض کے بوجھ سے بچانے کے لیے اسنیہالتا مکھوپادھیائے کی خودسوزی کے واقعے کی منظر کشی کرتے ہوئے سماج کو اس کا قاتل ٹھہرایا۔ اسی طرح وہ برطانوی حکومت کے ظلم و جبر کے خلاف بھی ہمیشہ آواز اٹھاتے رہتے تھے اور بحیثیت صحافی ان کا سب سے بڑا ہدف برطانوی سامراج تھا۔ انہوں نے اپنی ترکیبی طاقت، لچکدار لیکن پرجوش قلم سے مذہبی سچائی کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھنا شروع کیا جس میں ماضی کے ادوار اور واقعات کی مثالیں پیش کی گئیں جن میں ناانصافیوں اور ظلم کو برداشت کرنے کے نتائج پر زور دیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اخبارات حکومت کی سینسر شپ کی زد میں آجاتے تھے۔ الہلال اور البلاغ کے بھی مجموعی طور پر 146 شمارے ہی شائع ہو سکے اور بہت کم عرصے میں ہی یہ ہفتہ وار بند کر دیے گئے۔ اس اکائی میں ہم الہلال اور البلاغ کے خصوصی حوالے سے مولانا کی صحافتی کارناموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مولانا آزاد کی صحافتی خدمات بیان کر سکیں۔
- مولانا آزاد کے ذریعے جاری کردہ اخبارات کا تعارف کرا سکیں۔
- الہلال اور البلاغ کے نفس مضمون، اس کے اسلوب، اثرات اور اہمیت پر روشنی ڈال سکیں۔

- مولانا کی صحافت کا تنقیدی جائزہ لے کر سکیں۔

9.2 صحافت کا آغاز

9.2.1 نیرنگ عالم اور المصباح:

مولانا آزاد کی اہمیت اس بات سے واضح نہیں ہوتی کہ انہوں نے بہت ہی کم عمری میں شاعری شروع کر دی تھی اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے کیونکہ بعض اور افراد بھی کم عمری میں شعر کہنے لگے تھے۔ مولانا آزاد کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ انہیں اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ شاعری کے ساتھ ایک گلدستہ بھی شائع کرنا چاہیے، تاکہ ہر مہینے ایک 'مصرع طرح' پر ملک کے مختلف شعراء سے غزلیں منگوا کر اس میں شائع کی جائیں۔ اس سے جہاں ایک مشغلہ ہاتھ آجائے گا، وہیں مقابلے میں غزلیں کہنے سے مشق اور مزاولت میں بھی مدد ملے گی اور کلام میں بھی بہتری اور نکھار کا موقع ہاتھ آئے گا۔ ایک گیارہ برس کے لڑکے کا اس انداز سے سوچنا واقعی حیرت انگیز ہے۔ بہر کیف انہوں نے غالباً نومبر 1899 میں 'نیرنگ عالم' کے نام سے ایک ماہانہ گلدستہ، کلکتہ سے جاری کیا۔ اس میں صرف غزلیات چھپتی تھیں اور نثر بالکل نہیں تھی۔ نیرنگ عالم ایک برس بھی مکمل نہیں کر پایا تھا کہ اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ اس کے بعد مولانا نے کلکتہ ہی سے "المصباح" نام سے ایک اور ماہانہ جاری کیا۔ یہ بھی زیادہ دن نہ چل سکا۔ نیرنگ عالم اور المصباح دونوں ایک طرح سے مولانا آزاد کی صحافتی زندگی کا آغاز تھے، جس سے وہ اس میدان میں آنے والی مشکلات اور ذمہ داریوں سے واقف ہو سکے۔

9.2.2 لسان الصدق:

اب تک مولانا آزاد یہ سمجھ چکے تھے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں یا جو کچھ وہ اپنے قارئین کو پہنچانا چاہتے ہیں اس کے لیے نظم کا دامن چھوڑ کر نثر پر توجہ مرکوز کرنا پڑے گی۔ کچھ عرصے کی تیاریوں کے بعد انہوں نے 1903ء میں 'لسان الصدق' کے نام سے کلکتہ سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ پچھلے دونوں مجموعے چونکہ منظوم تھے اس لیے اس مجموعے میں مکمل توجہ نثر پر ہی دی گئی۔ لسان الصدق کا پہلا شمارہ 20 نومبر 1903 کو منظر عام پر آیا۔ اس کے پہلے شمارے میں اس کے مقاصد کو کچھ اس طرح بیان کیا گیا:

- سوشل ریفارم یعنی مسلمانوں کی معاشرت اور رسومات کی اصلاح کرنا۔
- ترقی اردو یعنی اردو زبان کے علمی لٹریچر کے دائرہ کو وسیع کرنا۔
- علمی مذاق کی اشاعت بالخصوص بنگال میں۔
- تنقید یعنی اردو تصنیفات پر منصفانہ ریویو۔

اس ماہنامے کے اجراء کے وقت جناب مدیر صاحب کی عمر 15 سال سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ اتنی کم عمر اور ماہنامے کے یہ بھاری بھر کم مقاصد جو کہ محض زبانی جمع خرچ تک محدود نہیں رہے بلکہ مولانا نے لسان الصدق میں ان مقاصد پر عمل کر کے دکھایا۔ لسان الصدق کے مضامین کا معیار اتنا بلند و بالا اور معتبر تھا اور انداز تحریر اتنا دلکش اور پر اثر تھا کہ اس نے ہم عصر دور کے صف اول کے جریدوں میں جگہ

حاصل کرلی۔ اس پر اس دور کے بعض پرانے اور مشہور جرائد میں بہترین تبصرے شائع ہوئے۔ اس کے مضامین میں لب و لہجے کی متانت و شگفتگی اور خوش اسلوبی سے بیشتر پڑھنے والوں کو خیال ہوا کہ مدیر کوئی پختہ عمر، کہنہ مشق اور تجربہ کار شخص ہیں۔ اس رسالے نے ملک بھر میں شہرت حاصل کی۔ لاہور کی انجمن حمایت اسلام، اس دور کا مشہور ادارہ تھا، آج بھی ہے۔ اس کے سالانہ اجلاس بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے منعقد ہوا کرتے تھے۔ انجمن کے ذمہ داران، اجلاس میں خطاب کرنے کے لیے باہر کے اصحاب علم حضرات کو خصوصی دعوت دے کر بلاتے تھے۔ لسان الصدق کے مضامین کے معیار اور انداز بیان نے انجمن کے ارباب مجاز کو اتنا متاثر کیا کہ اُنہوں نے اپنے 1903ء کے سالانہ جلسے کے لیے مولانا کو لاہور آنے اور اجلاس میں تقریر کی دعوت دی۔ یقیناً ان کے تصور میں جناب مدیر کوئی عمر رسیدہ، عالم دین تھے۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ جب مولانا آزاد کی شکل میں ایک 15,16 سال کا بے ریش و بروت لڑکا ان کے سامنے پیش ہوا ہو گا تو وہ کس قدر ششدر اور محو حیرت ہو گئے ہونگے۔ ان کا ذہن کس قدر سوالات کی آماجگاہ بن گیا ہو گا۔ بہر حال اگلے دن مولانا آزاد کی شاندار تقریر سے اُنہیں اپنے تمام سوالات کے جوابات مل گئے کیوں کہ اُن سے اگلے دن پھر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی۔ اُن کی تقریر کا موضوع تبلیغ اسلام کا طریق کار تھا۔ یہ اجلاس یکم اپریل 1904 تک اختتام پذیر ہوا۔

9.2.3 حالی سے ملاقات:

یہی وہ موقع تھا جب مولانا آزاد کی مولانا حالی سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ اس کا قصہ بھی بڑا پر لطف ہے۔ مولانا آزاد انجمن کے اجلاس شروع ہونے سے ایک دن پہلے ہی لاہور پہنچ گئے تھے۔ اسی دن وہاں ان کی ملاقات پانی پت کے رہنے والے مولوی وحید الدین سلیم سے ہوئی۔ مولوی سلیم صاحب کو جب معلوم ہوا کہ یہی لسان الصدق کے شہرہ آفاق مدیر ہیں تو انہوں نے بجا طور پر اسے عجوبہ عالم تصور کیا۔ وہ انہیں اپنے ساتھ لے کر مولانا حالی کے پاس پہنچے۔ جو جلسے میں شرکت کے لیے لاہور پہنچے ہوئے تھے اور کسی دوسری جگہ اپنے کسی دوست کے پاس مقیم تھے۔ جب مولوی سلیم مولانا آزاد کو ساتھ لیے ان کے پاس پہنچے تو تعارف سے پہلے انہوں نے حالی سے مولانا آزاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ:

مولوی سلیم: "آپ کے خیال میں ان صاحبزادے کی عمر کیا ہو گی؟"

حالی جو محتاط انداز میں قدرے ٹھہر کر جواب دینے کے عادی تھے، حسب عادت انہوں نے تأمل کرتے ہوئے کہا:

حالی: 'ابھی بہت کم ہیں۔'

اس پر سلیم صاحب نے اصرار کیا کہ

مولوی سلیم: 'نہیں فرمایئے، آپ کے خیال میں کیا عمر ہو گی؟'

بالآخر حالی نے کہا

حالی: 'یہی کوئی پندرہ سولہ سال کی ہو گی۔'

اب مولوی سلیم نے انکشاف کیا کہ

مولوی سلیم: 'یہی لسان الصدق کے ایڈیٹر ہیں۔'

حالی، لسان الصدق سے واقف تھے، اس کے مضامین کا مطالعہ کرتے تھے اور اس کے مضامین کے مداح بھی تھے۔ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی یہی گمان کرتے تھے کہ رسالے کے ایڈیٹر کوئی تجربہ کار عالم اور صحافی ہوں گے۔ یہ معلوم کر کے وہ سراپا حیرت بن گئے کہ یہی نوعمر صاحبزادے اس ماہنامے کے ایڈیٹر ہیں۔ اس طرح اس دن سے جو تعلقات قائم ہوئے وہ امتداد زمانہ کے ساتھ مزید مضبوط ہوتے چلے گئے اور ایک دوسرے سے متعلق عزت اور محبت کے جذبات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ افسوس کہ لسان الصدق بھی کوئی اٹھارہ مہینے ہی چھپ سکا۔ مولانا کی سیمابی فطرت انہیں جم کر کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ مزید برآں ان کا اکثر سفر میں رہنا لازماً اس پرچے کی باقاعدہ اشاعت پر اثر انداز ہوا۔ بعض اوقات دو دو مہینوں کے لیے صرف ایک شمارہ شائع ہوا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نومبر 1903 کے بعد جب دسمبر کا شمارہ شائع ہوا تو اس پر پہلی جلد کے مکمل ہونے اعلان کر دیا گیا۔ 1904ء کے پورے سال میں صرف 9 شمارے شائع ہوئے اور اس سال کا آخری شمارہ بھی اگست اور ستمبر 1904 کا مشترکہ شمارہ تھا اور اسی پر دوسری جلد کا اختتام ہو گیا۔ اس کے علاوہ اس سال میں اور کوئی شمارہ نہیں شائع ہوا۔ 1905 میں صرف ایک ہی شمارہ شائع ہوا جو کہ اپریل اور مئی کا مشترکہ شمارہ تھا۔ اس کے بعد لسان الصدق کی اشاعت بند کر دی گئی۔

1905ء میں مولانا شبلی نعمانی نے انہیں دار العلوم ندوۃ العلماء کے ماہانہ رسالے الندوہ کی ترتیب و تدوین میں اُن کا ہاتھ بٹانے کے لیے لکھنؤ بلوایا۔ الندوہ خالص علمی اور تحقیقاتی جریدہ تھا اور ندوۃ العلماء کا ترجمان ہونے کی وجہ سے اس کی ادارت بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔ اسی سبب سے اس کی ادارت کا ذمہ مولانا شبلی نے خود اپنے سر لیا اور وہی ندوۃ العلماء کی مجلس عاملہ کے سامنے اس کے لیے جوابدہ بھی تھے۔ مولانا شبلی جس پائے کے مصنف اور نقاد تھے اُس کے متعلق کچھ کہنا غیر ضروری ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کا سترہ سال کے نوجوان مولانا آزاد کو الندوہ کی ادارت میں شرکت کی دعوت دینا نہ صرف تعجب خیز ہے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ مولانا کی علمی صلاحیت، تحریری معیار اور پختگی، ان کی ذاتی متانت اور سنجیدگی کی اعلیٰ ترین سند ہے۔ مولانا آزاد تقریباً چھ مہینے تک یعنی اکتوبر 1905 سے مارچ 1906 تک وابستہ رہے اور اس کے بعد وہ کسی وجہ سے خود اس ادارت سے بری الذمہ ہو گئے۔

9.2.4 وکیل:

لسان الصدق کی ادارت کے زمانے میں ہی مولانا آزاد کی کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی اور بہت سے لوگ ان کے مداح بن گئے تھے۔ انہیں میں سے ایک صاحب شیخ غلام محمد امرتسر کے رہنے والے تھے جو امرتسر سے شائع ہونے والے اُس زمانے کے مشہور سہ روزہ اخبار 'وکیل' کے مالک تھے۔ الندوہ کی مجلس ادارت سے سبکدوش ہونے کے بعد شیخ غلام محمد نے انہیں امرتسر آنے اور 'وکیل' کی ادارت سنبھالنے کی دعوت دی۔ یہ دعوت قبول کر کے مولانا امرتسر چلے گئے۔ انہوں نے اپنے زمانہ ادارت میں 'وکیل' میں کافی خوشگوار تبدیلیاں لانے کی کوشش کی، جس سے اخبار کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ لیکن اسی درمیان ایک حادثے کی وجہ سے انہیں بادل نا خواستہ امرتسر سے واپس آنا پڑا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مولانا کے والد مولانا خیر الدین جو کہ ایک صوفی منش انسان تھے اور پیری مریدی کا

سلسلہ رکھتے تھے کلکتے اور بمبئی کے اطراف میں اُن کے مریدوں کی خاصی تعداد تھی۔ آزاد کے بڑے بھائی مولانا ابو نصر غلام حسین کو ان کے والد اپنی جانشینی کے لیے تیار کر رہے تھے۔ مولانا ابو نصر بھی راہ تصوف میں اپنے والد کے نقش قدم پر تھے، لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابو نصر سیاحت کے لیے عراق پہنچے لیکن وہاں جاکر بیمار پڑ گئے۔ حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی تو واپس بمبئی آئے تاکہ یہاں مناسب علاج ہو سکے۔ لیکن اس سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ حالت بجائے سدھرنے کے مزید بگڑتی چلی گئی۔ ان کے والد انہیں دیکھنے کلکتے سے بمبئی آئے جہاں سے انہیں وہ اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے، تاکہ مزید بہتر علاج مہیا کیا جا سکے، لیکن اُن کا آخری وقت آن پہنچا تھا۔ کلکتہ پہنچنے کے چند روز بعد ہی انہوں نے 1906 کے وسط میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس دوران مولانا آزاد امر تسر میں 'وکیل' سے وابستہ تھے۔ ان کے والد بزرگوار نے انہیں لکھا کہ 'اب تم گھر آجاؤ اور کام کاج میں میرا ہاتھ بناؤ۔' یہ ابھی جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ نومبر 1906ء میں والد نے ایک آدمی امر تسر بھیج دیا کہ انہیں اپنے ساتھ کلکتہ لے آئے۔ چار و ناچار انہیں کلکتہ جانا پڑا۔ اس طرح وہ اپریل 1906ء سے نومبر 1906 تک صرف آٹھ مہینے امر تسر میں رہے۔

والد کے حکم کی تعمیل میں مجبوراً کلکتہ چلے تو گئے لیکن حقیقت یہ تھی کہ انہیں دی گئی ذمہ داری سے وہ قطعی طور پر غیر مطمئن تھے۔ مریدوں کی تعلیم و تربیت، پند و نصیحت وغیرہ سے وہ کوسوں دور تھے۔ اُدھر صحافت کا مشغلہ ان کے دل میں کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ شیخ غلام محمد بھی ان کے کام سے ہر طرح مطمئن اور خوش تھے۔ چند دن بعد ہی انہوں نے اپنے والد سے کھل کر کہ دیا کہ میں اس پیری مریدی کے کام کاج کو نہیں سنبھال سکتا، نہ مجھے یہ پسند ہے کہ لوگ آئیں اور فرط عقیدت سے میرے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دیں۔ والد ایک صاحب فراست شخص تھے۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ ان کی مرضی کے خلاف انہیں کسی کام پر زیادہ دنوں تک مجبور نہیں کیا جا سکتا اس لیے انہوں نے اجازت دے دی کہ اچھا! اگر یوں ہے، تو ایسا ہی صحیح، تم واپس امر تسر جا سکتے ہو۔ اس کے بعد مولانا اگست 1907 میں دوبارہ امر تسر پہنچ گئے اور 'وکیل' کی ادارت کی ذمہ داری سنبھال لی۔ لیکن اس بار ان کی صحت جواب دے گئی اور وہ بیمار رہنے لگے۔ سال بھر بھی مشکل سے وہاں ٹک سکے اور جولائی اگست 1908 میں 'وکیل' سے علیحدگی اختیار کر لی۔

9.2.5 الہلال:

ان کی عمر اب 20 سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ اس دوران میں انہوں نے کئی رسالوں اور اخبارات میں کام کیا تھا۔ ان میں سے بعض ان کی ذاتی ملکیت تھے، بعض دوسروں کے، جہاں وہ تنخواہ پر ملازم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ لیکن وہ جہاں کہیں بھی گئے، ان کا نصب العین ہمیشہ بلند رہا۔ ان کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ صحافت کو ملک و ملت کی بہتری، فلاح و بہبود، خدمت گزاری اور خیر خواہی کا وسیلہ بنایا جائے۔ یہ اخبار و رسائل گویا ان کی تجربہ گاہ تھے، جہاں وہ اس تلاش میں رہے کہ ان کے اخبار کا مطمح نظر کیا ہونا چاہیے اور آخر کار جب انہیں معلوم ہوا کہ جس منزل مقصود کی تلاش میں وہ اتنے دنوں سے بھٹک رہے تھے، وہ کہیں باہر نہیں بلکہ خود ان کے پاس تھی۔ ان کے نصب العین کو ان کے جاری کردہ ہفتہ وار 'الہلال' نے پورا کیا۔

اور سب باتوں کو چھوڑ کر 'الہلال' کی صرف مجلس ادارت کو ہی لے لیجیے، تو آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے۔ مولانا آزاد کے

علاوہ اس میں مختلف اوقات میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد اللہ عمادی، مولانا عبد السلام ندوی اور بعض دوسرے اصحاب کام کرتے رہے اور سب کو باقاعدہ تنخواہ ملتی تھی۔ ہفتہ وار تو چھوڑیے، آج تک کسی اردو ماہنامے کو بھی اتنا وقیع اور شاندار ادارہ تحریر نصیب نہ ہوا ہو گا۔ اور پھر بطور اسٹاف کام کرنے والے ان مستقل معاونین کے علاوہ، اس کے مضمون نگاروں میں ملک کے صف اول کے ادیب اور انشا پرداز شامل تھے۔ مولانا شبلی کی بعض معرکۃ الآرا نظمیں پہلی مرتبہ 'الہلال' ہی میں شائع ہوئیں۔ غرض 'الہلال'، صحیح معنوں میں ہماری سیاسی، صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

'الہلال' کا پہلا شمارہ 13 جولائی 1912 کو شائع ہوا تھا جس کا ذیلی عنوان 'ایک ہفتہ وار مصور رسالہ' تھا۔ جیسا کہ انہوں نے ابتدا سے ہی بار بار اعلان کیا 'الہلال' ایک دعوت تھا، جس کا مقصد اس دین الٰہی کی تجدید اور اس کے بنیادی اصول، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کو زندہ کرنا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی کوئی قابل اعتراض بات دیکھتے، بے باکانہ طور پر اس کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کر دیتے۔ اس میں حکومت اور سرکاری افسران پر خاص طور سے سخت لب ولہجہ میں نکتہ چینی کی جانے لگی۔ حکومت کھلم کھلا اسے کیوں برداشت کرتی۔ 'الہلال' کو جاری ہوئے مشکل سے سال بھر ہی ہوا ہو گا کہ حکومت نے 18 ستمبر 1913ء کو اس سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی، جو فوراً ادا کر دی گئی۔

اگست 1914ء کو پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے ہندوستانی رہنماؤں سے کسی بھی قسم کا کوئی مشورہ کیے بغیر ہندوستان کی طرف سے بھی جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ مولانا آزاد ہر ہفتے حکومت کی بد عنوانیوں پر تو پہلے ہی سے لکھتے آرہے تھے، اب انہیں عالمی جنگ کی وجہ سے زیادہ وسیع میدان ہاتھ آگیا۔ یورپ میں جنگ کا پلڑا بھی اس وقت تک جرمنی کے حق میں تھا۔ 'الہلال' کے مضامین نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔ اس کے 14 اور 21 اکتوبر 1912ء کے دو شمارے (17,19) مشترکہ طور پر شائع ہوئے تھے۔ اس میں دو مضمون تھے، 'حدیث الجنود' اور 'سقوط اینٹورپ' نیز بیلجیم کے فوجیوں کی ایک تصویر بھی تھی جس کے نیچے یہ قرآنی آیت چھپی تھی:

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللهُ وَلٰكِن اَنفُسَهُم يَظلِمُوْنَ۔

(ترجمہ: اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔ پارہ 4 سورہ آل عمران، آیت 117)

ڈاکٹر شفیع ایوب لکھتے ہیں:

> 1914 میں جب پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی تو 'الہلال' نے انتہائی بے خوفی سے سامراج کی بد عنوانی کی قلعی کھولنی شروع کر دی۔ نہ صرف حکومت کے سنسر کا محکمہ بلکہ انگریز دوست حلقے تلملا اٹھے۔ الہ آباد سے اس زمانے میں انگریزی اخبار 'پانیئر' نکلتا تھا، جو مشہور ومقبول بھی تھا اور حکومت نواز بھی۔ پانیئر نے 'الہلال' کے خلاف ایک زبردست اداریہ لکھا اور حکومت کو 'الہلال' کی تحریروں کے خلاف کاروائی کرانے پر اکسایا۔ حکومت نے جب مزید ضمانت طلب کی تو مولانا نے طے کیا کہ اب اخبار بھلے ہی بند ہو جائے لیکن مزید ضمانت کی رقم ادا نہیں کریں گے، لہٰذا انہوں نے 'الہلال'

بند کر دیا۔ (تحریک آزادی اور الہلال، از ڈاکٹر شفیع ایوب، صفحہ 37-38)

حکومت آج تک 'الہلال' کے خلاف سخت اقدام سے اس لیے گریز کرتی رہی تھی کہ یہ ایک نیم مذہبی جریدہ ہے، لیکن وہ موقع کی تلاش میں تھی، لیکن اب جب 'الہلال' میں تلخ مضامین شائع ہوئے تو حکومت کے سب سے بڑے حمایتی اور الہ آباد سے چھپنے والے روزنامہ پائنیر(Pioneer)، نے اس کے خلاف ایک بہت سخت مضمون لکھا ہے جس کا عنوان تھا: Pre-Germanism in Calcutta۔ اس میں دیگر باتوں کے علاوہ اخیر میں لکھا تھا کہ جو حکومت:

برطانوی فوج اور بحریہ کے خلاف ایسے نفرت انگیز اور کینہ پرور الزامات لگانے کی کھلی چھٹی دیتی ہے، وہ سخت، غیر جرمن رواداری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ پائنیر نے یہ مضمون یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر کی ایما پر شائع کیا تھا۔ اس کے بعد بنگال انتظامیہ نے 'الہلال' کی بطور ضمانت ادا کی ہوئی دو ہزار روپے کی رقم ضبط کر لی۔ ساتھ ہی آخری اور مشترکہ شمارہ بھی ضبط کر لیا گیا اور اس سے مزید دس ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔ یہ اس ہفتہ وار کی استطاعت سے کہیں زیادہ بڑا مطالبہ تھا۔ مجبوراً مولانا کو یہ ہفتہ وار بند کرنا پڑا۔ اس کے آخری شمارہ پر نومبر 1914ء کی تاریخ تحریر ہے۔

9.2.6 البلاغ:

کوئی سال بھر کے التواء اور تیاری کے بعد مولانا نے 12 نومبر 1915ء کو دوسرا ہفتہ وار اخبار البلاغ جاری کر دیا۔ صرف نام کا فرق تھا، ورنہ دونوں کی صوری یا معنوی حیثیت میں کسی بھی قسم کا کوئی بھی فرق نہیں تھا۔ حالانکہ "البلاغ" بھی زیادہ دن جاری نہیں رہ سکا، یہی کوئی پانچ مہینے اور بہت جلد ہی حکومت کی تعزیری کارروائی کا شکار بن گیا۔ 1916 کے مارچ کے اوائل میں حکومت بنگال نے ڈیفنس آف انڈیا قانون کے تحت ان کو صوبہ بدر کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ چونکہ بیشتر دوسرے صوبوں کی حکومتیں اپنے ہاں ان کا داخلہ پہلے سے ہی ممنوع قرار دے چکی تھیں، اسی لیے چار و ناچار البلاغ کا بند ہو جانا لازمی ہو گیا۔ اب صرف بہار اور بمبئی ہی ایسے دو صوبے تھے، جہاں وہ جا سکتے تھے۔ بہار میں یہ سہولت تھی کہ یہ کلکتے سے قریب تھا اور ملنے جلنے والوں کو وہاں آنے جانے میں کم وقت اور خرچ لگتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنے قیام کے لیے رانچی کا انتخاب کیا۔ ابھی سرکاری فرمان آئے اور ان کے رانچی میں قیام پذیر ہوئے پانچ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ 8 جولائی 1916ء کو حکومت ہند نے ان کی رانچی ہی میں نظر بندی کا حکم جاری کر دیا۔ چار سال نظر بندی کے بعد وہ 27 دسمبر 1919 کو رہا کر دیے گئے۔

9.2.7 الہلال کی اہمیت:

'الہلال' کئی لحاظ سے عہد آفریں ثابت ہوا۔ اس سے قبل اس شان کا کوئی ہفتہ وار اخبار اردو میں شائع نہیں ہوا تھا، بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کے بعد بھی جو اخبار و رسائل نکلے ان کے سامنے نمونے کے طور پر 'الہلال' ہی رہا۔ ہر ایک کی یہی خواہش رہی کہ وہ شکل و صورت، مضامین کی ترتیب، اداریے، تصاویر وغیرہ میں 'الہلال' کی ہی پیروی کرے۔ حالانکہ ظاہری دلکشی اور طباعتی خوش اسلوبی سے

قطع نظر 'الہلال' کا اصلی کارنامہ اس کے باصلاحیت مدیر کے انداز تحریر کا انوکھا پن اور صاف گوئی تھی۔ شاید ہی کبھی کسی رسالے کے ایڈیٹر نے اپنے ہم وطنوں، ارباب حکومت، اکابر قوم اور علمائے دین کو یوں کھلم کھلا للکارا ہو گا۔ مولانا آزاد نے کسی کو بھی نہیں بخشا اور نہ ہی کوئی ان کے مواخذہ اور احتساب سے بچ سکا۔ جہاں بھی کوئی غلط بات ان کی نگاہ میں آئی، انہوں نے اس پر بے خوف و خطر اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر تنقید کی اور سب سے بڑی بات یہ کہ خوش نصیبی سے ان کی بے لاگ تنقید کا اثر بھی ہوا، اور اس سے حسب دلخواہ نتائج بر آمد ہوئے۔ غیر ملکی حکومت پر ان کی تنقید اور بھی شدید تھی اور جب اس بات پر توجہ دی جائے کہ 'الہلال' جولائی 1913 میں جاری ہوا اور 'البلاغ' سمیت اپریل 1916ء میں بند ہو گیا یعنی لے دے کے ساڑھے تین سال، تو اس کے نتائج اور اثرات سے مزید حیرت ہوتی ہے۔ اس وقت تک ہماری قومی تحریک اس مرحلے پر تھی کہ دوسروں کا تو کیا ذکر، خود کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بھی سب سے پہلے جو قرارداد منظور کی جاتی تھی وہ حضور قیصر ہند ملک معظم سے ملک و قوم کی وفاداری کے اظہار پر مبنی ہوتی۔ مہاتما گاندھی ابھی جنوبی افریقہ سے ہندوستان نہیں پہنچے تھے اور پوری ہندوستانی سیاسی تحریک بہت ہی نرم رو اور نرم گفتار تھی۔ برطانوی حکومت پر اور اس کے اعمال و اقوال پر کڑی نکتہ چینی کی ابتداء 'الہلال' ہی سے ہوئی۔

'الہلال' کو منظر عام پر لانے میں مولانا آزاد کو کس قدر محنت و جدوجہد کرنی پڑی اور اس کے لیے انہوں نے کس قدر مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ پہلے ہی شمارے میں اس کے بارے میں رقمطراز ہیں:

> '1906' کے موسم سرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں میری چشم بیدار نے ایک خواب دیکھا۔ انسان کے ارادوں اور منصوبوں کو جب تک ذہن و تخیل میں ہیں، عالم بیداری کا ایک خواب ہی سمجھنا چاہئے۔ کامل چھ برس اس کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہو گئے۔ امیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا اور یاس و قنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ و عزم پر غالب آیا لیکن الحمدللہ کہ ارادے کا استحکام اور توفیق الٰہی کا اعتماد ہر حال میں طمانیت بخش تھا، یہاں تک کہ آج اس خواب عزیز کی تعبیر عالم وجود میں پیش نظر ہے۔
>
> (الہلال، 13 جولائی 1912)

مولانا آزاد الہلال' کی اشاعت کے پیچھے عظیم مقاصد رکھتے تھے اور اس کے تئیں کافی حد تک جذباتی بھی تھے۔ جہاں ایک طرف وہ اس کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے تھے تو دوسری طرف دین کی تبلیغ بھی ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی۔ جیسا کہ خود لکھتے ہیں:

> "میری حالت الحمدللہ کہ عام حالات سے مختلف ہے۔ میں اپنے تمام کاموں کو ایک خالص دینی دعوت کی حیثیت سے انجام دیتا ہوں اور میرے پاس احکام دینی کے قوانین کی ایک کتاب موجود ہے پس میری نظر ہمیشہ اس پر رہتی ہے کہ خدا کے ساتھ میرا رشتہ کیسا ہے؟"
>
> (الہلال، 24 ستمبر 1913، جلد 3، شمارہ 13)

صحافت کو کئی وجوہات سے ادب میں شمار نہیں کیا جاتا، لیکن 'الہلال' کے کئی مضامین، اردو ادب میں بھی بلند مقام پانے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے جو مقالے مسلم یونیورسٹی سے متعلق لکھے تھے اور جن میں طنز و مزاح کا عنصر نمایاں ہے، وہ ادبی لحاظ سے بھی بہت قیمتی اور اہم ہیں۔ 'الہلال' کی ادبی خدمات اپنی جگہ، لیکن اس کے زمانے کے اور بعد کے لکھنے والوں نے اس کا جو اثر قبول کیا، وہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ ہمارے بعض مشہور ادیب، مولانا آزاد اور 'الہلال' کے انداز تحریر کے پیروکار اور خوشہ چین تھے۔ اس سلسلے میں فوری طور پر جو نام ذہن میں آتے ہیں وہ نیاز فتح پوری اور غلام رسول مہر کے ہیں۔

9.3 الہلال اور البلاغ کے بعد

'الہلال' میں مولانا کی شعلہ نوائی اور اس کی پاداش میں ان کی چار سالہ نظر بندی نے انہیں ملک کے تمام حلقوں کا منظور نظر بنا دیا تھا۔ جب جنوری 1920ء میں وہ رانچی سے رہا ہو کر واپس آئے تو ہر کوئی اُن کے استقبال کے لیے بے قرار اور چشم براہ منتظر تھا۔ لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چنانچہ مولانا، اہل وطن کے اس بھرپور اعتماد، اشتیاق اور عقیدت مندی کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، اور اسی سبب سے انہوں نے اس کے بعد اپنے آپ کو مکمل طور پر ملک کی سیاست کے لیے وقف کر دیا۔ اس کے بعد کا زمانہ مولانا آزاد کے لیے انتہائی مصروفیت کا رہا۔ کانگریس کی عدم تعاون تحریک اور خلافت تحریک نے ملک کے طول و عرض میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ مجلس خلافت کے نتیجے میں جمعیۃ العلماً ہند معرض وجود میں آ چکی تھی۔ مولانا آزاد ان سب تنظیموں کے بے حد سرگرم اور فعال رکن تھے۔ وہ ان بعض کی مجالس عاملہ کے رکن تھے اور بعض کے صدر بھی رہے۔ لہٰذا ان کے لیے سکون سے کسی ایک جگہ قیام کرنا محال ہو گیا تھا۔ صبح کہیں اور تو شام کسی دوسری جگہ۔ درمیان میں اگر کچھ وقت فرصت کا مل گیا تو وہ رفقائے کار اور ہم خیال احباب سے صلاح مشورے کی نذر ہو جاتا۔ ان سبھی مصروفیات کے باوجود وہ یہ کبھی نہیں بھولے کہ جب تک ایک اچھا اخبار اپنے پاس نہ ہو، اپنا مافی الضمیر عوام تک پہنچانا اگر ناممکن نہیں تو یقیناً محال تو ہے۔ بالآخر انہوں نے ایک اور ہفتہ وار کی اشاعت کا انتظام کیا اور اس کا نام 'پیغام' تجویز کیا۔

9.3.1 پیغام:

پیغام کا پہلا پرچہ 23 ستمبر 1921ء کو کلکتہ سے شائع ہوا۔ حالانکہ اس کی نگرانی تو مولانا نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی، لیکن ترتیب و تدوین کا سارا کام مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی کے سپرد کر دیا۔ پیغام میں بھی مولانا آزاد کے بعض اثر انگیز مضامین شائع ہوئے لیکن حقیقی صورتحال یہ تھی کہ ملکی اور سیاسی ذمہ داریوں نے انہیں اتنی اجازت اور فرصت نہ دی کہ وہ اس میں زیادہ کچھ لکھ سکتے۔ باوجود اس کے ایک اہم واقعے کا تذکرہ کرنا کافی ہو گا۔ اس سال کا اہم سیاسی واقعہ ہندوستان میں پرنس آف ویلز کی آمد اور اس کا ملک گیر بائیکاٹ تھا۔ 17 نومبر 1921ء کو اس کی یہاں آمد ہوئی۔ پیغام نے بھی اپنی بساط بھر اس بائیکاٹ کو کامیاب بنانے میں اپنا حصہ نبھایا۔ حکومت بھلا اسے کیوں کر معاف کر سکتی تھی۔ پہلے بحیثیت مدیر عبد الرزاق ملیح آبادی کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان پر مقدمہ چلا کر انہیں دو سال قید و بند کی سزا دی گئی۔ ان کے بعد 10 دسمبر 1921 کو مولانا آزاد بھی گرفتار کر لیے گئے۔ انہیں ایک سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ ان کے مقدمے کی آخری

پیشی 9 فروری 1922ء کو ہوئی تھی۔ اسی پیشی کے دوران انہوں نے اپنا وہ مشہور بیان عدالت کے سامنے پڑھا جو بعد کو 'قول فیصل' کے عنوان سے شائع ہوا۔

عبد الرزاق ملیح آبادی اور مولانا آزاد دونوں کے جیل چلے جانے سے پیغام بند ہو گیا۔ اس کے آخری شمارے پر 16 دسمبر 1921ء کی تاریخ ثبت ہے۔ گویا یہ بمشکل 3 مہینے ہی چل سکا۔ اس کے منجملہ 13 شمارے ہی شائع ہوئے تھے، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ تجربہ بھی بے حد کامیاب رہا اور اس کی اشاعت دس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ حالانکہ اس کی قیمت صرف دو آنہ فی شمارہ تھی، لیکن بعض اوقات یہ ایک ایک روپے میں بکا اور پھر بھی ناشر عوام کا مطالبہ پورا کرنے سے قاصر رہے۔

یہ صحیح ہے کہ مولانا آزاد ایک مذہبی اور صوفی خانوادے کے چشم و چراغ تھے اور ان کی تعلیم و تربیت بھی اسی نہج پر ہوئی تھی۔ لامحالہ عمر بھر مذہب ان کے غور و فکر کا مرکز رہا۔ انہوں نے جو تحریری ورثہ اپنے پیچھے چھوڑا، وہ بھی بیشتر مذہب اور مذہبی موضوعات ہی سے متعلق ہے، لیکن غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ عملی زندگی اور افتاد طبع کے لحاظ سے وہ بنیادی طور پر صحافی اور انشا پرداز تھے۔ انہوں نے انیسویں صدی میں آنکھیں کھولی تھیں اور ذرائع ابلاغ اور ترسیلی وسائل کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ پرنٹنگ پریس (چھاپہ خانہ) اور اخبار کو جدید تہذیب میں کس قدر اہم مقام حاصل ہے اور اس کی قوت کتنی اور کس قدر دور رس ہے۔ یہی سبب تھا کہ وہ ساری عمر کسی نہ کسی حیثیت سے رسائل و جرائد سے وابستہ رہے۔ اور جب بھی انہیں موقع ملا، انہوں نے اپنا ذاتی اخبار یا رسالہ جاری کرنے سے گریز نہیں کیا۔

9.3.2 الہلال ثانی:

مولانا آزاد پیغام کے بند ہو جانے بعد کافی عرصہ جیل میں اور پھر سیاسی معاملات میں مصروف رہے۔ اس دوران وہ برابر ایک روزانہ اخبار نکالنے کی سوچتے رہے۔ عبد القوی دسنوی لکھتے ہیں:

> آخر 1927 پہنچتے پہنچتے ایک بار ہمت کر کے روزانہ نکالنے کا فیصلہ کر لیا لیکن معلوم نہیں کن وجوہ سے وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکے اور روزانہ اخبار کی جگہ کلکتہ سے ہفتہ وار 'الہلال' نکالنے پر آمادہ ہو گئے۔

(حیات ابو الکلام آزاد از عبد القوی دسنوی، ص: 585-586)

مالک رام نے اردو روزنامہ نہ نکالنے کی وجہ وسائل و سرمایہ کی کمی کو قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> 'پیغام' کے بند ہو جانے کے بعد سیاسی سرگرمیوں نے انھیں کسی اور موضوع کے بارے میں سوچنے کی فرصت نہ دی لیکن وہ صحافت سے بے خبر نہیں رہے، کچھ دن وہ ایک روزنامہ جاری کرنے کے منصوبے پر بھی غور کرتے رہے، لیکن اس کے لیے جتنے سرمایے اور اہتمام اور لاؤ لشکر

کی ضرورت ہے اس کا انتظام آسان نہیں تھا۔ آخر کار انہوں نے روزنامے کا خیال چھوڑ دیا اور 'الہلال' ہی کو دوبارہ زندہ کرنے کی ٹھان لی۔

(کچھ ابو الکلام آزاد کے بارے میں، از مالک رام، ص:64)

الہلال کو دوبارہ نکالنے سے یہ فائدہ بھی تھا کہ لوگ اس نام سے بڑی حد تک مانوس تھے اور صحافت کے میدان میں اس کو بلند مقام حاصل تھا۔ چنانچہ 10 جون 1927ء کو دہلی سے 'الہلال' ثانی کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"الہلال کے تیسرے دور کا پہلا پرچہ شائع کرتے ہوئے مقتضائے وقت نے فکر و تصور کے گوشے میں جنبش پیدا کر دی، جی چاہتا ہے گیارہ سال کی خاموشی کی تلافی ایک ہی مجلس میں کر دیجئے لیکن مشکل یہ ہے کہ طبیعتیں طوالت بیان کی متحمل نہیں اور رشتۂ بیان کا یہ حال ہے کہ ایک مرتبہ کھل جائے تو پھر جلد لپیٹا نہیں جا سکتا۔ " (الہلال، 10 جون 1997)

اس کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری بھی مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی کے سپرد رہی۔ مولانا آزاد کی اپنی مصروفیات ایسی تھیں کہ وہ اس دور میں اس کے لیے بہت کم لکھ سکے۔ قارئین جو مولانا کی تحریروں کے لیے بیتاب اور بے قرار بیٹھے تھے، اس بات سے بہت مایوس ہوتے۔ لیکن مولانا آزاد بھی مجبور تھے۔ انہوں نے اتنے سارے کام اپنے ذمے لے رکھے تھے اور ہر روز مختلف امور سے متعلق اتنے مطالبات ان کے پاس پہنچتے تھے کہ وہ انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے میں وہ لکھنے کے لیے کس طرح وقت نکال سکتے تھے۔ 'الہلال' ثانی صرف چھ مہینے یعنی 10 جون 1927ء سے 9 دسمبر 1927ء تک ہی جاری رہا۔ اس دور میں اس کے صرف 20 شمارے ہی شائع ہو سکے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا یقیناً مناسب رہے گا۔ 'الہلال' کے دور ثانی میں ایک مسلسل مضمون 'انسانیت موت کے دروازے پر' شائع ہوتا رہا تھا۔ حسب معمول اس پر بھی مضمون نگار کا نام نہیں تھا۔ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ یہ مضمون مولانا آزاد تحریر کرتے ہیں۔ چنانچہ بعد کو کسی ناشر نے اُسے ان کے نام سے منسوب کر کے کتابی صورت میں شائع بھی کر دیا ہے جو کہ مالک رام صاحب کے بقول ٹھیک نہیں ہے۔ ان کے مطابق، یہ مضمون مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی کا تصنیف کردہ ہے اور اس کا مولانا آزاد سے انتساب غلط ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بات انہیں خود ملیح آبادی مرحوم نے بتائی تھی۔

9.3.3 الہلال کے مجموعی شمارے:

'الہلال' مجموعی طور پر تین ادوار میں شائع ہوا۔ پہلا دور 13 جولائی 1912 سے 18 نومبر 1914 پر مشتمل تھا۔ دوسرے دور میں جب اس کا نام 'البلاغ' تھا، 12 نومبر 1915 سے 31 مارچ 1916 تک چلا۔ 10 جون 1927 سے شروع ہونے والا تیسرا اور آخری دور 9 دسمبر 1927 پر اختتام پذیر ہو گیا۔ 'الہلال' کے مجموعی طور پر 135 شمارے شائع ہوئے۔ اب چونکہ 'البلاغ' کو بھی 'الہلال' میں شامل مانا جاتا ہے، اسی وجہ سے اس کے 11 شماروں کی شمولیت کے بعد الہلال کے مجموعی شماروں کی تعداد 146 تک پہنچ جاتی ہے۔

9.4 مولانا آزاد کی صحافت کا ایک عمومی جائزہ

مولانا آزاد کی تعلیم مکمل طور پر عربی اور فارسی زبانوں کے ذخیرے تک محدود رہی تھی۔ اس کے بعد ان کا مطالعہ بھی انہیں علوم تک محدود رہا۔ تقریر کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ مولانا کا خطابت کا یہ شوق عمر کے ساتھ مزید بڑھتا چلا گیا۔ بلکہ اب یہ شوق ان کی تحریر پر اثر انداز ہونے لگا۔ حالانکہ ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ بھلے ہی ان کی تحریر عربی فارسی کے ثقیل الفاظ اور تراکیب سے گرانبار تھی، نہ تو اس کی روانی میں کمی آئی، نہ ہی اس کی شگفتگی اور دلکشی کسی طور کم ہوئی۔ در حقیقت ان کے فقرے اور جملے ایسے نپے تلے اور تراشیدہ ہوتے تھے، جیسے کسی نے ہیرے کو کانٹ چھانٹ کر اسے اور بھی خوبصورت بنا دیا ہو۔

کئی لوگوں نے ان کی تحریر کی ثقالت اور اس میں عربی و فارسی کے مشکل الفاظ کی کثرت پر اعتراض کیا ہے۔ یہ اعتراض اپنی جگہ درست ہے اور اسے تسلیم کرنا ہی پڑے گا، لیکن اس کا سبب بھی یکسر واضح ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ 'الہلال' میں ان کے مخاطب، اہل علم طبقہ یا بہ لفاظ دیگر علمائے دین تھے۔ بیشتر موضوعات بھی انہیں اصحاب کی دلچسپی کے تھے۔ ایک طرف ان کی اپنی تعلیم کا پس منظر سامنے رکھیے اور دوسری طرف ان کے مخاطبین کے علم و فضل کا معیار، اس طرح آپ لازماً اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان مضامین میں انہوں نے جو زبان اور لب ولہجہ اختیار کیا، وہ حالات کے مطابق تھا۔ مولانا آزاد زیادہ آسان زبان بھی لکھ سکتے تھے جیسا کہ مثال کے طور پر ترجمان القرآن میں تفسیر سورہ فاتحہ کے بعض حصوں کو چھوڑ کر ان کی بقیہ تحریر، خصوصاً اس کا ترجمہ اور حواشی، کافی سلیس اور آسان زبان میں ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے بیشتر پڑھنے والے عوام اور عام تعلیم یافتہ افراد ہوں گے، اس لیے انہوں نے 'تکلموا الناس علی قدر عقولھم' (لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق گفتگو کرو) کے مصداق اسی سطح پر بات کی جو پڑھنے والے کے فہم و فراست کے عین مطابق تھی۔

اگرچہ ان کی تعلیم اپنی خاندانی روایات کے مطابق دینی علوم سے متعلق تھی لیکن وہ اسی پر مطمئن نہیں رہے۔ انہوں نے وسیع اور گوناگوں مطالعے سے اس میں مزید اضافہ کیا اور دوسروں کی تقلید پر ہی قناعت نہیں کی، بلکہ اپنے غور و فکر سے اپنی راہ آپ نکالی۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ جو پڑھا اس کا بیشتر حصہ دماغ میں محفوظ ہو گیا۔ شروع سے قرآن ان کے مطالعے اور غور وخوض کا محور و مرکز رہا تھا۔ 'الہلال' میں انہوں نے قرآن کو ایسے انوکھے اور دل نشین انداز میں پیش کیا کہ اُسے بالائے طاق سے اُتار کر روز مرہ کے حوالہ جات کی کتاب بنا دیا۔

مولانا آزاد صحافت کو خلق خدا کی خدمت کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور اسے کاروبار بنانے کے لیے قطعاً رضامند نہ تھے۔ دراصل مولانا آزاد نے دولت کو کبھی اہمیت نہیں دی نہ ہی کبھی انہوں نے دولت جمع کرنے کی کوئی کوشش کی، حتی کہ موقع ملنے کے باوجود بھی اس سے دور رہے۔ 21 جنوری کے شمارے میں شائع ان کی تحریر کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

> "میرے آگے دنیوی عزت کے حصول اور دولت وجاہ سے مالامال ہونے کی بہت سی راہیں آئیں اور اگر میں صرف تھوڑی سی غیر محسوس تبدیلی بھی اپنی روش میں کر دیتا تو حق پرستی کے دعووں کو باقی رکھ کر بھی دنیا حاصل کر سکتا تھا، پر خدا نے میرے دل کو ہمیشہ اپنی قدوس انگلیوں میں اس طرح رکھا

کہ چند لمحوں کے فانی تزلزل کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد میں اس کے تخت جلال و عظمت کی قسم کھا سکتا
ہوں کہ میں نے کبھی اپنے ذاتی فائدے کے لیے ایک رائی برابر بھی اعراض کرنا پسند نہیں کیا۔"
(الہلال: شذرات، 21 جنوری 1914، جلد نمبر 4، شمارہ 3)

'الہلال' کے خالص ادبی مضامین کی طرف پہلے ہی اشارہ کیا جا چکا ہے، لیکن اس کے بعد حالات کے تقاضے انہیں اس کوچے سے دور لے گئے۔ شعر و شاعری تو پہلے ہی کہیں چھوٹ چکی تھی، اب ادب بھی مجبوراً ترک ہونے لگا۔ حسن اتفاق سے آخری قید کے دوران میں انہوں نے خطوط کی شکل میں بعض ادبی مضامین سپرد قلم کیے، جو بعد میں 'غبار خاطر' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ 'الہلال'، ان کے عہد شباب کی یادگار ہے اور غبار خاطر، عہد کہولت یعنی کبر سنی کی، لیکن باوجود اس کے کوئی شخص اسے پڑھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی تھکے ہوئے دماغ یا قلم کی تخلیق ہے۔ یہاں بھی مولانا کے ذہن کی گرم جولانی اور قلم کی گل افشانی میں وہی وسعت اور دلکشی ہے، جو روز اول سے ان سے منسوب رہی ہے۔ ان کی تحریروں کو دیکھ کر پھر ایک مرتبہ افسوس کرنا پڑتا ہے کہ علم و ادب مولانا آزاد کی شکل میں سیاست کی بارگاہ پر کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ اگر تمام مشغولیتوں سے قطع نظر کر کے وہ اپنے آپ کو علم و ادب ہی کے لیے وقف رکھتے تو نہ معلوم آج اردو کے خزانے میں کیسے کیسے قیمتی جواہر کا اضافہ ہو گیا ہوتا۔

9.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت کے میدان میں قدم رکھنے کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ انہوں نے کمسنی میں ہی شاعری، تصنیف، ترجمہ نگاری، اور صحافت کا سفر شروع کیا۔
- مولانا ابوالکلام آزاد نے صحافت کے وسیع و عریض میدان میں بھی کم عمری میں قدم رکھ دیا۔ صرف 12 سال کی عمر میں انہوں نے کلکتہ سے شائع ہونے والے ہفتہ وار اخبار 'المصباح' کی ادارت سنبھالی۔
- کچھ لوگوں کے مطابق یہ اخبار 1900ء میں شروع ہوا، لیکن درست ترین معلومات کے مطابق اس کا پہلا شمارہ 22 جنوری 1901 کو شائع ہوا۔ اس کی اشاعت عید الفطر کے موقع پر ہوئی تھی اور اس سال عید الفطر کلینڈر کے مطابق 22 جنوری 1901 کو واقع ہوئی تھی۔
- حالانکہ اس اخبار کی اشاعت بمشکل تین چار مہینے ہی ہو سکی، لیکن اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مولانا ادارتی ذمے داریاں سنبھالنے سے کافی عرصہ پہلے سے ہی صحافت سے وابستہ ہو چکے تھے۔
- اردو، عربی اخبارات و جرائد کی کثرتِ مطالعہ کے سبب مولانا کو شاعری سے زیادہ صحافت میں دلچسپی ہونے لگی اور پھر جلد ہی ایک پیشہ کے طور پر اسے اپنا لیا۔ اپنے صحافت کے سفر میں مولانا نے کئی اخبارات، رسائل اور جرائد کی ادارت سنبھالی یا بذات خود جاری کیے۔ ان میں الہلال اور البلاغ نہایت مقبول ہوئے۔

- الہلال کی مقبولیت کی وجہ اس کا غیر معمولی اور دلچسپ انداز بیان اور عصری مسائل سے اس کا سروکار تھا۔اس دوران مولانا حکومت پر بھی تنقید کرتے رہے، جس کی وجہ سے بالآخر انہیں اپنی صحافت بند کرنی پڑی اور بعد میں قومی تحریک کے عروج اور اس میں ان کی مصروفیات بڑھنے کی وجہ سے وہ میدان صحافت سے مجبوراً کنارہ کش ہوگئے۔

9.6 کلیدی الفاظ

ڈیفنس آف انڈیا آرڈی نینس : (The Defence of India Act, 1915)19مارچ،1915 کو نافذ کیا گیا تھا، تاکہ عوام کی حفاظت اور برطانوی ہندوستان کے دفاع کو محفوظ بنانے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جائیں اور بعض جرائم کی زیادہ تیزی سے سماعت کی جائے۔

پرنٹنگ پریس : (Printing Press) چھاپہ خانہ جس سے مشین کی مدد سے تیزی سے کاغذ پر چھپائی کی جا سکے۔ہندوستان میں پہلا پرنٹنگ پریس 1556 میں سینٹ پال کالج، گوا میں قائم کیا گیا تھا۔

کہولت : بڑھاپا، بڑی عمر

9.7 نمونہ امتحانی سوالات

9.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کی مادری زبان کیا تھی؟
2. الہلال اور البلاغ کے مجموعی طور پر کتنے شمارے شائع ہوئے؟
3. مولانا نے نیرنگ عالم کب جاری کیا؟
4. لسان الصدق کہاں سے جاری کیا گیا؟
5. لاہور میں کس انجمن نے مولانا آزاد کو سالانہ اجلاس میں مدعو کیا؟
6. حالی سے مولانا کی ملاقات کس نے کرائی؟
7. امرتسر سے شائع ہونے والے مشہور سہ روزہ اخبار 'وکیل' کے مالک کون تھے؟
8. الہلال کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا؟
9. الہلال پر کس اخبار نے سخت ترین تنقید کی؟
10. کس قانون کے تحت الہلال کو حکومت بنگال نے صوبہ بدر کر دیا؟

9.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کے ابتدائی حالات پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. لسان الصدق پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. مولانا آزاد کی حالی سے ملاقات پر روشنی ڈالیے۔
4. وکیل کے زمانہ ادارت اور اسے ترک کرنے پر روشنی ڈالیے۔
5. الہلال ثانی پر ایک مضمون لکھیے۔

9.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. الہلال کی صحافتی اہمیت پر نظر ڈالتے ہوئے ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔
2. الہلال اور البلاغ کے بعد کے دور پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. مولانا آزاد کی صحافت کا ایک عمومی جائزہ پیش کیجیے۔

9.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں	مالک رام
2. حیات ابوالکلام آزاد	عبدالقوی دسنوی
3. الہلال کے تبصرے	ابوالکلام آزاد
4. مولانا ابوالکلام آزاد فکر و فن	ملک زادہ منظور احمد
5. مولانا آزاد کے مراسلات کا کیلنڈر	سید محمد عزیز الدین حسین

اکائی نمبر 10: مولانا ابو الکلام آزاد کی ادبی خدمات

(غبارِ خاطر کے حوالے سے)

اکائی کے اجزا

10.0		تمہید
10.1		مقاصد
10.2		مولانا آزاد کی ادبی خدمات (غبارِ خاطر کے حوالے سے)
	10.2.1	غبارِ خاطر کا اسلوب
	10.2.2	غبارِ خاطر کی زبان
10 .3		غبار خاطر سے اقتباسات برائے مطالعہ
10 .4		اکتسابی نتائج
10 .5		کلیدی الفاظ
10 .6		نمونہ امتحانی سوالات
	10 .6 .1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	10 .6 .2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	10 .6 .3	طویل جوابات کے حامل سوالات
10 .7		تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

مولانا ابو الکلام آزاد مختلف النوع صلاحیت کے مالک ہمہ جہت انسان تھے۔ وہ طبعاً ذہین و فطین اور جرأت مند واقع ہوئے تھے۔ آزاد بیدار مغز اور مثبت فکر و خیال کے صحافی، عمدہ نثار، خوش فکر شاعر، انشا پرداز قلم کے سپاہی، دور بیں اور دور اندیش سیاست داں تھے۔ مولانا آزاد کی شخصیت مانند بحر بیکراں تھی۔ غبارِ خاطر ان کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط 1945-1942 کے درمیان زمانۂ اسیری میں قلعہ احمد نگر جیل میں نواب صدر یار جنگ اور مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے نام لکھے گئے تھے۔ یوں تو مولانا آزاد کی زندگی کا بیشتر حصہ قید و بند میں گزرا مگر جب قلعہ احمد نگر کے جیل میں انھیں کسی سے ملنے اور خط و کتاب کرنے کی بھی اجازت

نہیں تھی تب انھوں نے اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے خط لکھنا شروع کیا اور انہیں اپنے پاس محفوظ کر کے منظر عام پر لایا جس کا نام ''غبارِ خاطر'' رکھا۔

غبار خاطر مولانا آزاد کی معجز بیانی کا ایک خوبصورت نمونہ اور ان کی آزاد طبیعت کا شاہکار ہے۔ جسے پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انھوں نے یہ خطوط اپنے نام ہی تحریر کیے ہوں۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح اور شخصیت کے تعلق سے لکھ سکیں۔
- مولانا آزاد کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کر سکیں۔
- غبارِ خاطر کی زبان، اسلوب اور ادبیت سے واقف ہو سکیں۔
- مولانا آزاد کی متعدد اسالیب نثر پر قدرت، ان کے زبان کی انفرادیت اور ان کی نثر کے بارے میں واقف ہو سکیں۔

10.2 مولانا آزاد کی ادبی خدمات (غبار خاطر کے حوالے سے)

مولانا آزاد کا علمی قد عظیم اور ادبی کارنامہ گراں قدر ہے۔ ان کا علمی اور ادبی دائرہ بے حد وسیع اور متنوع ہے۔ انھوں نے ادبی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور صحافتی موضوعات پر اہم اور غیر معمولی مضامین لکھے، رسائل و جرائد شائع کیے، قرآن کا ترجمہ کیا نثر میں ''تذکرہ'' اور ''غبارِ خاطر'' جیسی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ابتدا میں طبع موزوں کی مناسبت سے شاعری کی مگر بعد میں شاعری سے ایسے بے تعلق ہوئے کہ پھر پلٹ کر کبھی اس طرف نہیں دیکھا۔ مولانا ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بچپن سے ہی ان کی تربیت بھی اسی نہج پر کی گئی۔ جس کے سبب بچپن ہی سے ان کا رجحان تعلیم و تعلم کی جانب تھا۔ ان کی تربیت اس طرح ہوئی تھی کہ کم عمری ہی سے لکھنے پڑھنے لگے اور مضامین بھی شائع ہونے لگے تھے۔ جس کے سبب علمی اور ادبی محفلوں میں ان کا نام گردش کرنے لگا تھا۔ نو عمری کے اسی عہد میں مولانا آزاد نثر کے اسلوب اور ترجمہ کے فن سے واقف ہونے کے ساتھ عربی اور فارسی پر عبور حاصل کر چکے تھے۔ جس کی واضح مثال ''ترجمان القرآن'' کی ہے۔ ان کی اسی لیاقت کو دیکھتے ہوئے علامہ شبلی نے انھیں ''الندوہ'' میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی، جہاں سے کئی اہم علمی مضامین شائع ہوئے۔ جس سے ان کی غیر معمولی صلاحیت اور تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے ادب کے تقریباً میدان میں بے لوث اور بے بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ادب ہو کہ صحافت، سیاست ہو کہ مذہب، شاعری ہو کہ طنز و مزاح ان تمام موضوعات پر انھوں نے مضامین لکھ کر یہ ثابت کیا کہ وہ ادب کے باصفا اور باوفا قلم کار ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی فکر اور قلم کے جادو سے ادب میں انقلاب لانے کے خواہاں تھے۔ اسی سبب سے انھوں نے ''نیرنگ عالم'' جاری کیا جو کہ ماہ نامہ تھا۔ اس کے بعد ''المصباح''، ''النکاح''، ''احسن الاخبار'' ہفت روزہ پیغام اور الجامعہ وغیرہ میں اپنی خدمات دیں۔ جب کلکتہ سے 'لسان الصدق' جاری ہوا اس سے وابستہ ہوئے۔ پھر کلکتہ سے

مولانا نے اپنی ادارت میں ہفتہ وار 'الہلال' جاری کیا۔ پھر تقریباً ڈھائی برس کے بعد جب حکومت نے الہلال بند کر دیا تب 'البلاغ' جاری کیا۔ جب ہم مولانا ابو الکلام آزاد کی تحریر و تقریر اور علمی و ادبی سرگرمیوں کے تعلق سے پڑھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ صحافت کا میدان ہو کہ سیاست کا یا علمی ہو کہ ادبی ہر میدان میں وہ پیش پیش رہتے تھے اور جنون کی حد تک کام کرنے کے عادی تھے۔

عبد القوی دسنوی اپنے مونو گراف میں مولانا کے 'علمی اور ادبی خدمات' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا آزاد کے مضامین احسن الاخبار 'مخزن' تحفہ احمدیہ ایڈورڈ گزٹ، خدنگ نظر وغیرہ مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے جس کی وجہ سے مولانا پڑھے لکھے حلقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، ماہنامہ 'لسان الصدق' شائع ہوا تو مولانا کی فکر میں گہرائی اور قلم میں پختگی آچکی تھی۔''
>
> (ابو الکلام آزاد، عبد القوی دسنوی، ص167)

مولانا آزاد کی ادبی خدمات کے تعلق سے یہ بات درست ہے کہ انھوں نے پہلو بدل کر ادب اور زبان کی خدمت کی ہے۔ نہ وہ کبھی اپنے کاموں سے مطمئن ہو کر بیٹھے اور نہ ہی کاموں پر اکتفا کیا بلکہ ہر لمحہ ایک نئی فکر اور ایک نئی سوچ کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ جس کا احساس ہمیں ان کی پہلی کتاب ''تذکرہ'' جو کہ ایک مستقل کتاب ہے اس سے ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی طرح بے سکونی کے عالم میں لکھی۔ جس کا شمار جدید تذکرے میں ہوتا ہے۔ باوجود اس کے اس کا اسلوب لائق تحسین اور اس کی زبان پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جس میں کہیں انداز خطیبانہ ہے تو زبان کی سادگی بے مثال ہے، جس کا پیرایہ بیان دل کش اور دل نشیں ضرور ہے مگر عربیت اور فارسیت کی زیادتی کی وجہ سے کہیں کہیں دلکشی اور شیرینی مجروح ہوئی ہے۔ عبد القوی دسنوی لکھتے ہیں کہ:

> ''جب 1912 میں 'الہلال' جاری ہوا اور اس میں مولانا کی زیادہ سے زیادہ تحریر شائع ہونے لگیں تو نثر کی زبان اچانک تبدیل ہو کر ''الہلال'' بن گئی۔ جس پر عربی فارسی کے اثرات نمایاں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود روکھی، پھیکی اور بوجھل نہیں تھی، بلکہ بڑی رواں، دواں، پر وقار اور پر شکوہ تھی۔۔۔۔ مولانا کا یہ فیض تھا کہ انھوں نے صحافت کی عام زبان کو عالمانہ وقار اور ادبی شان عطا کی۔''
>
> (عبد القوی دسنوی، ابو الکلام آزاد مونو گراف ، ص168-169)

مولانا ابو الکلام آزاد کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے علمی اور ادبی کاموں کو پروان چڑھانے کے لیے متعدد موضوعات پر تحریر لکھی، جیسے چائے نوشی، قلعہ احمد نگر، مذہب، موروثی عقائد، سحر خیزی، قید خانہ، خلوت پسندی، خاندان، عادات و خصائل، تعلیم، زندگی کائنات، خدا اور وحدت الوجود وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مگر ان کی نگارشات کی ادبیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے موضوعات کے برتاؤ میں شخصی نقطۂ نظر کو یکساں قائم رکھا ہے۔ ان کی شخصیت کی چمک دمک سے ان کی تحریر کا ہر فقرہ روشن ہے۔ ان کا نثری اسلوب منفرد اور توانا لہجہ ان کی ذات اور شخصیت سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔ ہم ان کی شخصیت میں جو نظم و ضبط دیکھتے ہیں، تعقل، شائستگی، تمکنت شعریت اور

ان کا اسلوب بھی ان ہی خصوصیات سے آراستہ اور پیراستہ ہے۔ مولانا کی پوری شخصیت اور ان کا علمی وقار ہم غبار خاطر کے خطوط میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اس تعلق سے حامدی کاشمیری اپنے مضمون ''مولانا آزاد کی ادبی شخصیت غبار خاطر کے حوالے سے'' ۔ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ان مکتوبات میں مصنف نے دوران اسیری، زندگی کے واردات، مطالعات، مشاہدات، فلسفیانہ افکار اور ذاتی تاثرات کی ایک عالمانہ اور محققانہ سطح پر باز آفرینی کی کوشش کی ہے، یہ خطوط علم و آگہی کے دفاتر کھولتے ہیں۔ مثلاً معمہ ہستی، فن موسیقی یا انانیتی ادب کے بارے میں مصنف کے عالمانہ اور فلسفیانہ خیالات پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنے حافظے کی مدد سے ان موضوعات و مسائل کے بارے میں اپنے علم و خیر کا اظہار کر رہے ہیں۔ ''

(ایوان اردو، دہلی ص169، دسمبر 1988)

مولانا آزاد کی ادبی خدمات کا دائرہ وسیع ہے، انھوں نے صحافت اور صحافتی مضامین کے ذریعہ سے بھی ادب اور ادبیت کو باقی رکھ کر یہ ثابت کیا ہے وہ ادب کی خدمت صحافت اور صحافتی مضامین کے ذریعہ سے بھی کرنے کے خواہاں ہیں۔ اسی طرح ''تذکرہ'' ہو کہ خطوط کا مجموعہ انھوں نے ان سبھی جگہوں پر ادب کی چاشنی، کشش اور دلکشی کو باقی رکھا ہے۔ غبار خاطر مولانا ابوالکلام کی شاہکار تصنیف ہے۔ غبارِ خاطر کے تعلق سے حامدی کاشمیری رقم طراز ہیں:

> ''حریفانِ سقف و بام یعنی چڑیوں سے محاذ آرائی جیسے مزاحیہ واقع کے بیان تک، مصنف نے پوری ذہنی آزادی اور طبیعت کی ترنگ کے مطابق، اپنے خیالات و تاثرات کو قلم بند کیا ہے۔''

(ایوان اردو، دہلی ص169، دسمبر 1988)

غبارِ خاطر کا مطالعہ اگر ہم اس کے کلی جزئیات کے ساتھ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا کا مطالعہ کس قدر وسیع اور وہ ذہنی طور پر کس قدر حاضر دماغ تھے۔ کیوں کہ غبارِ خاطر کو جس طرح علمی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے اسی طرح سے فنی اعتبار بھی حاصل ہے۔ انھوں نے غبارِ خاطر میں تقریباً دو درجن شعرا ایک سو دس اشعار اور مصرعے بے محابا استعمال کر کے متعجب کیا ہے۔ جن میں مرزا غالب کے بیشتر اشعار ہیں۔ غبارِ خاطر کو پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف خطوط کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں مولانا آزاد کی انشاء پردازی کے جوہر بھی بکھرے پڑے ہیں، تاریخ نگاری اور قلعہ احمد نگر کی تاریخ اور صلیبی جنگوں کے احوال بھی بیان ہوئے ہیں۔ چائے نوشی کے ساتھ موسیقی سے دلچسپی کے اظہار کے نمونے بھی موجود ہیں۔ اس سے مولانا آزاد کے وسیع مطالعہ اور کثیر الجہات ادیب ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

10.2.1 غبارِ خاطر کا اسلوب:

غبارِ خاطر مولانا ابوالکلام آزاد کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو 1942 تا 1945 کے درمیانِ اسیری نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی رئیس بھیکم پور ضلع علی گڑھ کے نام لکھے گئے۔ مولانا آزاد کی زندگی جس قدر متنوع اور تہہ دار ہے، سیاسی اعتبار سے اسی قدر متنازع بھی رہی ہے جس کی وجہ سے حکومت وقت کے عتاب اور جور و ستم کا شکار ہوتے رہے اور اپنی زندگی کا زیادہ حصہ قید و بند میں

گزارا۔ قید میں رہنے کے سبب مولانا نے اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے خط لکھ کر اپنے پاس محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ جسے بعد میں غبار خاطر کے نام سے شائع کر دیا گیا۔ بظاہر تو یہ کتاب خطوط کا مجموعہ ہے مگر اس میں مکتوب کی صفت کم پائی جاتی ہے کیوں کہ مولانا نے اس میں حبیب الرحمن خان شروانی کو مخاطب تصور کر کے بے تکلفی کے ساتھ اپنے جذبات و احساسات اور خیالات کو تحریر کرتے چلے گئے۔ یہ کتاب خطوط کی شکل میں ضرور ہے مگر اس کی نثر ایسی شگفتہ اور دلنشیں ہے کہ جو بھی پڑھتا ہے مولانا آزاد کی نثر کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس کی تہہ داری اور شان نرالی ہے۔ اس کی تحریر کا معجزاتی اور کرشماتی پہلو یہ بھی ہے کہ یہ دنیائے ادب کی سب سے کثیر الجہات پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ دوسرے یہ کہ دنیائے ادب کا شاید ہی کوئی ادیب یا چاہنے والا ایسا ہو جس نے "غبارِ خاطر" کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کیا ہو۔ اس کے اسلوب نگارش کے تعلق سے غبار خاطر کے مقدمہ بعنوان "کفِ غبار" میں عبد الرشید ارشد لکھتے ہیں کہ:

> "اس کا اسلوب نگارش ایسا ہے کہ ممتاز اور نامور ادیب جب کبھی اعصابی دباؤ کا شکار ہوتے ہیں تو وہ "غبارِ خاطر" کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں اور پھر ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں کہ جہاں کیف و سرور ہے، جذ و سوز ہے اور فرحت و شگفتگی ہے۔"
>
> (غبارِ خاطر، کف غبار، ص 7-8)

"غبارِ خاطر" مولانا ابو الکلام آزاد کی ایسی یادگار کتاب ہے جس سے ان کی ہمہ جہت زندگی کا سراغ ملتا ہے۔ آزاد کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اسلوب نگارش کو کئی ڈھنگ سے برتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر موضوع ایک خاص طرح کے اسلوب کا متقاضی ہوتا ہے۔ اور اسی اسلوب میں اس کا نمایاں رنگ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس لیے مولانا آزاد کا یہ اختصاص ہے کہ انھوں نے اپنے علم و ذوق کے تنوع کی طرح اپنا اسلوب تحریر بھی مختلف رکھا ہے۔ جب وہ کوئی دینی اور علمی مباحث پر بحث کرتے ہیں تو اس کا اسلوب مختلف ہوتا ہے۔ اور جب وہ صحافتی مضمون تحریر کرتے ہیں تو اس کا طرز نگارش جدا ہوتا ہے۔ اسی طرح خالص ادبی انشا پردازی کے لیے ان کا طرز اسلوب ان دونوں اسالیب سے مختلف ہے۔ اس تعلق سے محمد اجمل خان ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "انھوں نے جس وقت سے قلم ہاتھ میں سنبھالا ہے ہمیشہ پیش رو اور صاحب اسلوب رہے ہیں۔ کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ کسی دوسرے پیش رو کے نقش قدم پر چلیں چنانچہ ان مکاتب میں بھی ان کا مجتہدانہ انداز ہر جگہ نمایاں ہے۔ بغیر کسی اہتمام اور کاوش کے قلم برداشتہ لکھتے گئے ہیں لیکن قدرتِ بیان ہے جو بے ساختگی میں بھی ابھری چلی آتی ہے اور کاوش فکر ہے جو آمد میں بھی آورد سے زیادہ بنتی اور سنورتی رہتی ہے۔ ظرافت ہے تو وہ اپنی بے داغ لطافت رکھتی ہے، واقعہ نگاری ہے تو اس کی نقش آرائی جواب نہیں۔ فکر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند ہے۔"
>
> (غبارِ خاطر، ص 47-46)

مولانا ابو الکلام آزاد کا دلکش انداز اور اسلوب نگارش ہی غبارِ خاطر کا اسلوب ہے۔ ان کے حکیمانہ اسلوب اور زعیمانہ انداز کی جھلک

کے ساتھ ان کی ادیبانہ وجاہت کا عکس بھی ہم ان کے خطوط میں دیکھ سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے ان کی نثر کو شعر منثور سے تعبیر کیا ہے۔ مولانا کی پر کشش ذات والاصفات اور ان کی تحریر کے اسلوب کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ان کا اسلوب نگارش اور شخصی جاذبیت کو دیکھتے ہوئے رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''مولانا کا اسلوب تحریر ان کی شخصیت تھی اور ان کی شخصیت ان کا اسلوب دونوں کو ایک
دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔'' (کلیات رشید احمد صدیقی، جلد سوم، ص347)

مولانا ابو الکلام آزاد تقریر و تحریر کے بے تاج بادشاہ تھے۔ غبار خاطر مولانا کی تبحر علمی، انشاپردازی اور زبان دانی کا شاہکار ہے۔ اس میں ان کا فطری اسلوب، طنز و مزاح، قلمی مصوری، مناظر فطرت کی خوبصورت عکاسی اور اشعار کا بر محل استعمال کر کے ظرافت کا خوبصورت نمونہ پیش کیا ہے۔ غبارِ خاطر کا فطری اسلوب، اس کی سادگی، عربی اور فارسی تراکیب کا خوبصورت استعمال اور بے تکلف طرز تحریر ہی انہیں دیگر انشاپردازوں سے منفرد اور ممتاز کرتی ہے۔ جب ہم غبار خاطر کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی نثر ادبی مرصع کاری اور رنگین عبارت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ لفظی اور معنوی رعایت و مناسبت کے ساتھ فقروں کی صوتی دروبست بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اسی کے ساتھ متوازن تراکیب و ترتیب اور اظہار کے بدلے ہوئے منفرد پیرائے، نئے نئے تلازمات اور نایاب ترکیبات نے اس کی دل کشی اور حسن میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

غبار خاطر کا اسلوب اول تا آخر فطری ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں غیر معمولی روانی، فطری پن اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے قطع نظر غبار خاطر کے تعلق سے چند لوگوں کی یہ بھی رائے ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد کی تصانیف میں غبار خاطر اول درجے کی تصنیف نہیں ہے۔ اس کی توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ اس میں ان کا قلم بیمار اور ضعیف معلوم ہوتا ہے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر عبد اللہ لکھتے ہیں کہ:

''غبار خاطر تو اس ضعف و پیری کی یادگار ہے جس میں انسان اپنے خول سے باہر نکل کر انحطاط
وجود کا علاج محض اظہار و نمائش سے کیا کرتا ہے، نمود ہستی کی یہ خواہش اس وقت پیدا ہوتی ہے
جب انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اب اپنے متعلق مجھے خود بھی کچھ کہنا چاہیے۔''
(ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ، ص145)

ڈاکٹر عبد اللہ کے متذکرہ بالا قول سے یہ واضح نہیں ہو سکا کہ وہ آخر غبار خاطر کے اسلوب کا کس بنیاد پر انکار کر رہے ہیں۔ اور نہ ہی ان کے اس دعوے میں کوئی دم ہے۔ اس کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انکار برائے انکار ہے جس کا کوئی ٹھوس جواز پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اگر کوئی بات متن کے دعوے کے ساتھ دلیل دی جاتی ہے تو وہ قابلِ قبول ہوتی ہے مگر یہاں ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح اسلوب احمد انصاری نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس تعلق سے لکھتے ہیں کہ:

''غبارِ خاطر کے خطوط--- میں بے ساختگی، عصری ہمدردی اور زندگی کے سخت و سست کو ہموار
کر کے دل آویزی پیدا کرنے کا فقدان ہے، ان میں اچھی نثر کی خوبیاں نہیں ہیں۔ ابو الکلام

آزاد یا تو مقدمات کبریٰ و صغریٰ قائم کرتے ہیں یا فارسی اور عربی آمیز الفاظ اور اشعار سے ان کا تخیل اس درجہ آتش گیر ہو جاتا ہے کہ جسارت توجہ کو اپنی جانب کھینچتی ہے او اسلوب بیان سکون یافتہ نہیں رہتا اور وہ اپنی خطابت اور طاقت لسانی کے رحم و کرم پر نظر آتے ہیں اس طرح یہ خطوط نثری شاعری کی مایوس کن مثال بن گئے ہیں۔"

(غبارِ خاطر کا تنقیدی مطالعہ۔ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، ص145)

یہ سچ ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد جیسی ہمہ جہت شخصیت اور غبار خاطر جیسی معرکۃ الآرا کتاب کے تعلق سے اس طرح کی غلط فہمیاں اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب ہم اس کتاب یا شخصیت کا مطالعہ کسی ایک رخ سے کرتے ہیں۔

جب کوئی ناقد غبار خاطر کا موازنہ تذکرہ اور الہلال کی تحریروں سے کرے گا تب اس قسم کی غلط فہمیوں کا پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔ کیوں کہ وہ بھول جاتے ہیں کہ آزاد کے یہاں انشا پردازی کے کئی اسالیب ہیں۔ ان کی تحریروں کا یہ اعجاز ہے کہ اس کا اسلوب موضوع کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

10.2.2 غبارِ خاطر کی زبان:

غبارِ خاطر مولانا ابو الکلام آزاد کی شاہکار تخلیق ہے۔ یہ اپنی زبان، اسلوب اور انشا پردازی ہر اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ عظمت اللہ بے خبر کے رسالہ "غبارِ خاطر" سے اس کا عنوان ماخوذ ہے۔ آزاد کے مکتوب الیہ حبیب الرحمن خان شیروانی ہیں۔ مگر مجموعہ میں کچھ خطوط اپنے عنوان کے تحت ہیں۔ جیسے مکتوب سرینگر، مکتوب نسیم باغ، مکتوب سفر، داستان بے ستون و کوہ کن، حکایات بادہ و تریاک، حکایت زاغ و بلبل، چڑیا اور چڑے کی کہانی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد کی تصانیف میں اسلوب اور زبان الگ الگ ہیں۔ اگر وہ صحافتی مضمون تحریر کرتے ہیں تو اس میں ان کی زبان دینی مضامین سے مختلف ہوتی ہے۔ اگر وہ سیاسی مضمون لکھتے ہیں تو اس کی زبان و اسلوب ان کے خطوط سے جدا اور الگ ہوتے ہیں۔ مگر یہ بات محل نظر رہے کہ غبار خاطر میں انھوں نے بنیادی طور پر زعیمانہ یعنی پر اعتمادی، حکیمانہ اور ادیبانہ انداز خاطر نشان ہیں ٹھیک اسی طرح زبان میں بھی ہیں۔ سادہ اور عام فہم زبان غبار خاطر کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ "حکایت بادہ و تریاک" کہانی سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

"لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں میں لائیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی کام نہیں ہونا چاہیے۔"

(حکایت بادہ و تریاک ، غبارِ خاطر مرتبہ: مالک رام، ساہتیہ اکادمی، ص93)

غبار خاطر کا بغور مطالعہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زبان نثر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مولانا آزاد نے کمال ہنر مندی سے اس کی زبان کو شعریت سے مملو کیا ہے۔ در اصل یہ مولانا کی شعری آہنگ سے متصف ایسی زبان ہے جس نے انھیں نثر کی صف میں باکمال نثار

ہوتے ہوئے صف شاعری میں لا کھڑا کر دیا۔ جس کے پر تاثیر نمونے ہمیں غبار خاطر میں جابجا مل جاتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر ''داستان بے ستون و کوہ کن'' کا یہ اقتباس دیکھیے۔

''اس کارخانہ ہزار شیو رنگ میں کتنے ہی دروازے کھولے جاتے ہیں تا کہ بند ہوں اور کتنے ہی بند کیے جاتے ہیں تا کہ کھولے جائیں۔''

(داستان بے ستون و کوہ کن، غبار خاطر، مکتبہ رشیدیہ لمیٹڈ لاہور، 1988، ص 71)

اسی طرح اگر ہم غبار خاطر کا مطالعہ باریک بینی سے کریں تو جگہ جگہ متحیر کن انکشافات ہوتے ہیں۔ جس کو پڑھ کر قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ جیسے ان کی فارسی آمیز زبان کو لے لیجیے۔ انھوں نے غبارِ خاطر میں جگہ جگہ فارسی اشعار، الفاظ اور تراکیب کے ساتھ محاوروں کا سہارا لیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد جس قدر اردو زبان پر عبور رکھتے تھے اسی قدر فارسی زبان پر بھی انھیں دسترس تھی۔ جیسے ایک خط کا عنوان ہی انھوں نے ''داستان بے ستون و کوہ کن'' منتخب کیا ہے۔ اسی طرح مکمل غبار خاطر پڑھ جایئے آپ محسوس کریں گے کہ صفحہ در صفحہ فارسی اور عربی اشعار نقل کر کے انھوں نے نہ صرف متحیر کیا ہے بلکہ متعجب بھی کیا ہے۔ مگر ان کا کمال ہنر یہ ہے کہ خواہ وہ عربی کے اشعار ہوں یا فارسی کے بڑی چابکدستی اور بر محل استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی نثر کا رنگ دوبالا ہو گیا ہے۔

ان کی یادداشت اور فنی ہنر مندی کا احساس اس بات سے ہوتا ہے کہ اپنی بات کی دلیل میں وہ جگہ جگہ شعروں کو بھی اسی کی مناسبت سے تحریر کر دیتے ہیں۔ کہیں کہیں تو ایک مصرع تحریر کر کے بھی اپنی بات بڑی خوبصورتی کے ساتھ مکمل کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے شعر و نثر دونوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھیے مولانا آزاد نے چڑیوں کے غول کا تذکرہ کر کے اپنے گھر کی ویرانی سے تشبیہ دی ہے اور کس خوبی کے ساتھ اردو کا یہ شعر یہاں استعمال کیا ہے۔

اگ رہا ہے درودیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے۔

اسی طرح انھوں نے اپنے گھر میں چڑیوں کے ہجوم کو دیکھ کر انھیں اپنا عدو تصور کرتے ہوئے چھتری اٹھا کر اعلانِ جنگ کا ارادہ کرتے ہیں چڑیوں کا پورا غول چوں چوں کر کے شور مچانے لگتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ '' ان حریفانِ سقف و محراب کا مقابلہ ممکن نہیں'' اور حافظ کا یہ شعر بے ساختگی کے ساتھ نقل کر دیتے ہیں۔

خیال قند بلند تو می کند دل من
تو دستِ کوتہ من بین و آستین دراز

اسی طرح جب وہ چڑیوں کے گھونسلے اجاڑنے کی سوچتے ہیں اور بانس کو ان کے گھونسلے پر ٹکا دیتے ہیں تا کہ وہ اپنے گھونسلے میں نہ جا سکیں، مگر چڑیوں نے اس بانس کو آلہ کے طور پر استعمال کر کے مولانا کو متعجب کر دیا۔ اس منظر کو پیش کرتے ہوئے چڑیوں کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں کہ ''عجب نہیں یہ مصرع گنگنا رہے ہوں'' کہ اور یہ مصرع ٹانک دیتے ہیں۔

عدو شود سبب خیر گر خداخواہد

غبار خاطر میں عربی الفاظ وتراکیب کا استعمال بھی خوب کیا گیا ہے۔ جس کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اردو رسم الخط میں عربی لکھی ہے۔ یہی ان کی معجز بیانی ہے۔

10.3 غبار خاطر سے اقتباسات برائے مطالعہ

(1)

قلعہ احمد نگر

17 دسمبر 1942

صدیق مکرم

وقت وہی ہے مگر افسوس، وہ چائے نہیں ہے جو طبعِ شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکر عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی:

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانی گفتار
رکھ دے کوئی پیانہ صہبا میرے آگے

وہ چینی چائے جس کا عادی تھا، کئی دن ہوئے، ختم ہو گئی، اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنسِ گرانمایہ سے آشنا نہیں:

یک نالہ مستانہ زجائے نہ شنیدم
ویراں شود آں شہر کہ مے خانہ نہ دارد

مجبوراہندوستان کی اسی سیاہ پتی کا جوشاندہ پی رہا ہوں، جسے تعبیر وتسمیہ کے اس قاعدے کے بموجب کہ:

بر عکس نہند نام زنگی کافور

لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں:

درماندہ صلاح و فسادیم الحذر
زین رسم ہا کہ مردمِ عاقل نہاندہ اند

اس کارگاہِ سود وزیاں کی کوئی عشرت نہیں کی کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلال صافی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا کہ درد کدورت اپنی تہ میں نہ رکھتا ہو۔ بادہ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارِ

ناکامی لگا رہا ہوں، اور خندہ بہار کے پیچھے ہمیشہ گریہ خزاں کا شیون برپا ہوا۔ ابوالفضل کیا خوب کہہ گیا ہے: قدحے پُر نہ شد کہ تہی نہ کردند، وصفحہ تمام نہ شد کہ ورق برنہ گردید:

نیکو نہ بود ہیچ مرادے بہ کمال
چوں صفحہ تمام شد، ورق برگردد

امید ہے کہ آپ کی عنبرین چائے کا ذخیرہ جس کا ایک مرتبہ رمضان میں آپ نے ذکر کیا تھا، اس نایابی کی گزند سے محفوظ ہو گا:

امید کہ چوں بندہ تنک مایہ نہ باشی
مے خوردن ہر روزہ زعادات کرام است

(غبار خاطر، مرتبہ مالک رام، صفحہ 152، 151)

(2)

چائے چین کی پیداوار ہیں اور چینیوں کی تصریح کے مطابق پندرہ سو برس سے استعمال کی جارہی ہے، لیکن وہاں کبھی کسی کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نئی گزری کی اس جوہر لطیف کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کیا جا سکتا ہے۔ جن جن ملکوں میں چین سے براہ راست گئی، مثلاً روس، ترکستان۔ ایران۔ وہاں بھی کسی کو یہ نہیں خیال گزرا۔ مگر سترہویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے، تو نہیں معلوم ان لوگوں کو کیا سوجھی، انہوں نے دودھ ملانے کی بدعت ایجاد کی، اور چونکہ ہندوستان میں چائے کا رواج انہی کے ذریعے ہوا اس لیے یہ بدعت سیئہ یہاں بھی پھیل گئی۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ لوگ چائے میں دودھ ڈالنے کی جگہ دودھ میں چائے ڈالنے لگے۔ بنیاد ظلم در جہاں اندک بود۔ ہر کہ آمد بر آں مزید کرد۔ اب انگریز تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ زیادہ دودھ نہیں ڈالنا چاہیے لیکن ان کے تخم فساد نے جو برگ وبار پھیلا دیے ہیں انہیں کون چھانٹ سکتا ہے، لوگ چائے کی جگہ ایک طرح کا سیال حلوہ بناتے ہیں، کھانے کی جگہ پیتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے چائے پی لی۔ ان نادانوں سے کون کہے کہ:

ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

(غبار خاطر، مرتبہ مالک رام، صفحہ 153)

(3)

پھر ایک چڑیا آئی اور اِدھر اُدھر کودنے لگی۔ بظاہر چہچہانے میں مشغول تھی مگر نظر دانوں پر تھی۔ وحشی یزدی کیا خوب کہہ گیا ہے:

چہ لطفہا کہ دریں شیوہ نہانی نیست
عنایتے کہ تو داری بمن، بیانی نیست

پھر دوسری آئی اور پہلی کے ساتھ مل کر دری کا طواف کرنے لگی۔ پھر تیسری اور چوتھی بھی پہنچ گئی۔ کبھی دانوں پر نظر پڑتی، کبھی دانہ ڈالنے والے پر، کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے آپس میں کچھ مشورہ ہو رہا ہے، اور کبھی معلوم ہوتا ہر فرد غور و فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپ نے غور کیا ہو گا کہ گّوریا جب تفتیش اور تفحص کی نگاہوں سے دیکھتی ہے، تو اس کے چہرے کا کچھ عجیب سنجیدہ انداز ہو جاتا ہے۔ پہلے گردن اٹھا کے سامنے کی طرف دیکھے گی، پھر گردن موڑ کے داہنے بائیں دیکھنے لگے گی۔ پھر کبھی گردن کو مروڑ دے کر اوپر کی طرف نظر اٹھائے گی، اور چہرے پر تفحص اور استفہام کا کچھ ایسا انداز چھا جائے گا، جیسے ایک آدمی ہر طرف متعجبانہ نگاہ ڈال کر اپنے آپ سے کہہ رہا ہو کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا، اور ہو کیا رہا ہے؟ ایسی ہی متفحّص نگاہیں اس وقت بھی ہر چہرہ پر ابھر رہی تھیں:

پایم بہ پیش از سر ایں کو نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

پھر کچھ دیر بعد آہستہ آہستہ قدم بڑھنے لگے۔ لیکن براہ راست، دانوں کی طرف نہیں۔ آڑے ترچھے ہو کر بڑھتے اور کترا کر نکل جاتے۔ گویا یہ بات دکھائی جا رہی تھی کہ خدانخواستہ ہم دانوں کی طرف نہیں بڑھ رہے ہیں۔ دروغ راست مانند کی یہ نمایش دیکھ ظہوریؔ کا شعر یاد آ گیا:

بگو حدیث وفا، از تو باورست، بگو
شوم فدائے دروغے کہ راست مانند ست

آپ جانتے ہیں کہ صید سے کہیں زیادہ صیّاد کو اپنی نگرانی کرنی پڑتی ہے، جونہی ان کے قدموں کا رخ دانوں کی طرف پھرا، میں نے دم سادھ لیا، نگاہیں دوسری طرف کر لیں، اور سارا جسم پتھر کی طرح بے حس و حرکت بنا لیا، گویا آدمی کی جگہ پتھر کی ایک مورتی دھری ہے، کیونکہ جانتا تھا کہ اگر نگاہِ شوق نے مضطرب ہو کر ذرا بھی جلد بازی کی، تو شکار دام کے پاس آتے آتے نکل جائے

گا۔ یہ گویا ناز حسن اور نیاز عشق کے معاملات کا پہلا مرحلہ تھا:

نہاں ازو بہ رخش داشتم تماشائے
نظر بہ جانب ما کرد وشرمسار شدم

(چڑیا چڑے کی کہانی ، مشمولہ غبار خاطر، مرتبہ مالک رام، صفحہ 215،216)

(4)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے تقریباً تمام تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے، مگر قلعہ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ایک مرتبہ جب بمبئی میں تھا، تو قصد بھی کیا تھا، مگر پھر حالات نے مہلت نہ دی۔ یہ شہر بھی ہندوستان کے ان خاص مقامات میں سے ہے، جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے انقلابوں کی داستانیں وابستہ ہوگئی ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے ایک اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔ پندرہویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑ گئی، تو ملک احمد نظام الملک بھیری نے علم استقلال بلند کیا۔ اور بھینگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈال کر جینز کی جگہ اسے حاکم نشین شہر بنایا۔ اس وقت سے نظام شاہی مملکت کا دارالحکومت یہی مقام بن گیا۔ فرشتہؔ، جس کا خاندان مازندران سے آکر یہیں آباد ہوا تھا، لکھتا ہے: چند برسوں کے اندر اس شہر نے وہ رونق و وسعت پیدا کرلی تھی کہ بغداد اور قاہرہ کا مقابلہ کرنے لگا تھا:

کس پایمالِ آفتِ فرسودگی مباد
دیروز ریگِ بادیہ آئینہ خانہ بود

ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا، اس کا حصار مٹی کا تھا۔ اس کے لڑکے برہان نظام شاہ اوّل نے اسے منہدم کرکے از سر نو پتھر کا حصار تعمیر کیا، اور اسے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مصر اور ایران تک اس کی مضبوطی کا غلغلہ پہنچا۔ 1803ء کی دوسری جنگ مرہٹہ میں جب جنرل ویلزلی نے (جو آگے چل کر ڈیوک آف ویلنگٹن ہوا) اس کا معائنہ کیا تھا تو اگرچہ تین سو برس کے انقلابات سہہ چکا تھا۔ پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے مراسلے میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جاسکتی ہے:

کارواں رفتہ و اندازہ جاہش پیدا ست
زاں نشانہا کہ بہ ہر راہگذار افتادست

یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم وشجاعت کی یادگارِ زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنھیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کر لیا ہے:

بیفشاں جرعہ بر خاک وحال اہل شوکت بیں

کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد

اسی احمد نگر کے معرکوں میں عبدالرحیم خان خاناں کی جوانمردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا تھا جس کی سرگزشت عبدالباقی نہاوندی اور صمصام الدولہ نے ہمیں سنائی ہے جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آ گئیں اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقتور فوج سے ٹکرانا پڑا، تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا" چنیں انبوہے در پیش (است) وفتح آسانی۔ اگر (شکست) رودہد، جائے نشاں دہید کی (ما) شمار در یابیم"۔ خانخاناں نے جواب دیا تھا:"زیر لاشہا۔"

(داستان بے ستون و کوہ کن، مشمولہ غبار خاطر، مرتبہ مالک رام، صفحہ 25،26،27)

(5)

جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوتی۔ اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے جہاں کہیں اپنے پر کھول دیگا، ایک چمنستانِ بو قلموں کھل جائے گا:

نہ با صحرا سرے دارم نہ با گلزار سودائے

نہ ہر جامی روم،از خویش می جوشد تماشائے

قید خانے کی چاردیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں، تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیران قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگے گی، تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے، کسی کو محروم کر دے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرے سے نقاب الٹتی ہے، تو سب کو یکساں طور پر نظارہ حسن کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں اور صرف اپنے گرد و پیش ہی میں کھوئے رہتے ہیں:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں، ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردہ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہانتاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح وشام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش وعشرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے۔ یہاں سروسامانِ کار کی اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشہ میں بھی گم نہیں ہو سکتا۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ خود ہمارا دل ودماغ ہی گم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈھتے رہیں گے، مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈھیں گے، حالانکہ اگر اسے ڈھونڈھ نکالیں، تو عشرت ومسرت کا سارا سامان اسی کوٹھری کے اندر سمٹا ہوا مل جائے۔

بغیر دل ہمہ نقش ونگار بے معنی ست
ہمیں ورق کہ سیہ گشت، مدعا ایں جا ست

ایوان ومحل نہ ہوں، تو کسی درخت کے سایے سے کام لے لیں۔ دیبا ومخمل کا فرش نہ ملے، تو سبزہ خودرو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسر نہیں ہیں، تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے۔ اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوشنمائیاں اوجھل ہو گئی ہیں، تو ہو جائیں، صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی، چاندنی اب بھی ہمیشہ جلوہ فروشیاں کرے گی۔ لیکن اگر دلِ زندہ پہلو میں نہ رہے، تو خدارا بتلایئے، اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں، اس کی خالی جگہ بھرنے کے لیے کس چولہے کے انگارے کام دیں گے:

مجھے یہ ڈر ہے، دلِ زندہ، تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

(حکایت بادہ وتریاک، مشمولہ غبار خاطر، مرتبہ مالک رام، صفحہ 70،69،68)

10.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مولانا ابوالکلام آزاد علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ان کی والدہ مدینہ منورہ کے ذی مرتبت خانوادے کی بیٹی تھیں۔ آپ فطرتاً ذہین واقع ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بہت کم عمری میں ہی عربی اور فارسی کا نصاب مکمل کر لیا تھے۔

- مولانا آزاد نے عنفوانِ شباب ہی میں جلیل القدر مذہبی اور دینی علما کی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ اسی طرح تقریباً ادبا و شعرا کے علاوہ سیاسی رہنماؤں کے کارناموں سے بھی واقف ہو چکے تھے۔
- مولانا آزاد ذہانت کے ساتھ ہی وہ بے حد حساس اور سلیم الطبع واقع ہوئے تھے۔ زور د فہمی، دانائی، ہوش مندی اور دور بینی انھیں ورثے میں ملا تھا۔ مولانا ابو الکلام آزاد دیندار، خدا ترس اور صبر و شکر کا عملی نمونہ تھے۔
- مولانا ابو الکلام آزاد کی شناخت کئی اعتبار سے نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اللہ نے انھیں علم و فضل سے بے پناہ نوازا تھا۔ وہ اپنے وقت کے ممتاز اور معاملہ فہم عالم دین اور جلیل العظمت سیاسی رہنما تھے۔ آپ کے عہد میں ہی کیا آج تک ان کا کوئی ثانی پیدا نہیں ہوا۔ گھر کی تربیت ایسی تھی کہ محض دس سے پندرہ برس کے مابین مدارس اسلامیہ کے نصاب کو نہ صرف مکمل کر لیا تھا بلکہ خوب اچھی طرح ازبر بھی کر لیا تھا۔
- ابو الکلام آزاد نے کم سنی میں ہی مناصب جلیلہ پر فائز اردو اور عربی کے زیادہ تر دینی علما اور ادبا و شعرا کے تذکرے اور تصانیف پڑھ چکے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت میں جہاں ان کے ماحول اور گھر کا دخل تھا اس سے کہیں زیادہ ان کے والدین کا رول تھا۔
- مولانا ابو الکلام آزاد کی فطانت اور قابلیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے محض پندرہ برس کی عمر میں ''لسان الصدق'' جیسا اہم رسالہ جاری کیا، اور جب چوبیس برس کے ہوئے یعنی 1912 میں صحافت کی دنیا کا بے تاج اور بے نظیر رسالہ ''الہلال'' اور 1916 میں ''البلاغ'' نکالا۔
- آزاد نے اسی شباب کے عالم میں انھوں نے ''الصباح''، ''وکیل''، ''دار السلطنت''، ''تحفہ'' اور ''الندوہ'' جیسے غیر معمولی اہمیت کے حامل رسائل کی ادارت بھی فرمائی۔
- مولانا آزاد کی علمیت اور قابلیت کا شہرہ اس وقت اور زیادہ ہوا جب 1904 میں جس وقت ان کی عمر کوئی سولہ برس کی رہی ہو گی لاہور کی انجمن ''حمایت اسلام'' کے اجلاس میں بلائے گئے۔ جس جلسے میں مایہ ناز ادیبوں اور شاعروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا جس میں قابل ذکر شخصیات ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالی اور علامہ اقبال ہیں۔ جب مولانا ابو الکلام آزاد نے اجلاس میں اپنا خطبہ پڑھا تب لوگوں کو بمشکل یقین ہوا کہ یہی مولانا آزاد ہیں جو ''لسان الصدق'' کے مدیر ہیں۔ یہ مولانا آزاد کے علم و فضل کا کرشمہ اور ان کی نابغہ شخصیت کی روشن تمثیل ہے۔
- مولانا ابو الکلام آزاد کی شخصیت ایک بڑے ادیب، انشا پرداز، ماہر علوم دینیہ و عصریہ، ایک عمدہ شاعر، معروف عالم دین، مفسر قرآن اور دور رس و دور بیں سیاست داں کے طور پر جانی جاتی ہے۔ مولانا آزاد نے سینکڑوں کتابیں تصنیف کیں اور اپنی صلاحیت کا لوہا منوایا ان میں ''تذکرہ''، ''ترجمان القرآن''، ''غبار خاطر'' اور ''کاروان خیال''، قابل ذکر ہیں۔
- غبار خاطر مولانا کے خطوط کا مجموعہ ہے جس کے مکتوب الیہ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ہیں۔ جب آزاد قلعہ احمد نگر (گجرات) کی جیل میں قید و بند کی صعوبتیں گوارا کر رہے تھے جہاں ان پر سخت پہرے تھے۔

- ایسی صورت میں انھوں نے مناسب سمجھا کہ خود اپنی ذات سے مخاطب ہو کر خطوط تحریر کر لیا جائے جس کے لیے غائبانہ طور پر اپنے رفیق حبیب الرحمٰن خاں شیر وانی کو تخاطب کر کے خود کلامی کا سلسلہ شروع کیا اور تمام خطوط محفوظ بھی رکھے جسے بعد میں شائع کیا۔ اور پھر یہ خطوط کا مجموعہ متواتر شائع ہوا۔
- غبار خاطر نہ صرف خطوط کا مجموعہ ہے بلکہ علم کا ایک ذخیرہ ہے، جس میں زبان دانی کے مختلف النوع نمونے موجود ہیں۔ جس کا اسلوب بیان اور اسلوب تخاطب اپنی مثال آپ ہے۔ مولانا آزاد کی زبان دانی اور ان کی زیر کی کا بخوبی علم ہوتا ہے۔

10.5 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
مختلف النوع	:	الگ الگ قسمیں، مختلف اقسام کے
بحر بے کراں	:	وسیع و عریض سمندر، جس کا کنارہ نہ ہو
انشا پرداز	:	مضمون لکھنے والا، نثر نگار، ادیب
معجز بیانی	:	اعلی درجے کی خوش بیانی، کمال فصاحت و بلاغت
اسالیب	:	اسلوب کی جمع، طور طریقے، اطوار، آداب
ذکاوت	:	تیز فہمی، ذہن کی تیزی، ذہانت
طبعاً	:	فطری طور پر، مزاج یا عادت سے
طبع موزوں	:	موزوں اور ناموزوں اشعار میں فرق کرنے والی حس
تبحر علمی	:	علم کی فراوانی
باصفا	:	صاف و شفاف، صاف دل، مخلص
اکتفا	:	قناعت، کفایت، کافی
پر شکوہ	:	عظیم الشان، شان و شوکت والا
باز آفرینی	:	دوبارہ وجود میں لانا

10.6 نمونۂ امتحانی سوالات

10.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. غبار خاطر کس طرح کی کتاب ہے؟
2. غبار خاطر کا سنہ تصنیف کیا ہے؟
3. مولانا آزاد نے غبار خاطر کس جیل میں تحریر کی؟

4. غبار خاطر کے مکتوب الیہ کون ہیں؟
5. مولانا ابو الکلام آزاد کا اصل نام کیا ہے؟
6. مولانا ابو الکلام آزاد کی اہلیہ کا نام کیا تھا؟
7. مولانا آزاد نے قرآن مجید کا ترجمہ کس نام سے کیا ہے؟
8. مولانا آزاد نے "الہلال" کس سن میں جاری کیا؟
9. مولانا آزاد نے ادبی تحریر کن کن موضوعات پر تحریر کی ہیں؟
10. مولانا ابو الکلام آزاد کے کسی ماہنامہ کا نام لکھیے؟

10.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا ابو الکلام آزاد کے خاندانی پس منظر کے تعلق سے لکھیے۔
2. مولانا ابو الکلام آزاد کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
3. غبارِ خاطر پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اسلوب کو واضح کر کیجیے۔
4. غبارِ خاطر کے حوالے سے مولانا ابو الکلام آزاد کی زبان دانی پر روشنی ڈالیے۔
5. غبارِ خاطر کے خطوط کی خصوصیات لکھیے۔

10.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. مولانا ابو الکلام آزاد کی ادبی خدمات غبار خاطر کے حوالے سے بیان کیجیے۔
2. ابو الکلام آزاد کے مختلف طرز اسلوب پر روشنی ڈالیے۔
3. غبارِ خاطر پر مفصل نوٹ لکھیے۔

10.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. دیوان ابو الکلام آزاد	ڈاکٹر عبد الغفار شکیل
2. ابو الکلام آزاد (مونو گراف)	عرش ملسیانی
3. ابو الکلام آزاد کا اسلوب نگارش	عبد المغنی
4. ابو الکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت	رشید الدین خان
5. غبارِ خاطر ایک مطالعہ	ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ قاضی
6. حیاتِ ابو الکلام آزاد	عبد القوی دسنوی

اکائی 11: مولانا آزاد کی شاعری

اکائی کے اجزا

11.0		تمہید
11.1		مقاصد
11.2		مولانا ابوالکلام آزاد کا شعری سفر
11.3		مولانا آزاد کی شاعری کی خصوصیات
11.4		مولانا آزاد کا شعری اسلوب
11.5		نمونہ کلام
11.6		اکتسابی نتائج
11.7		کلیدی الفاظ
11.8		نمونہ امتحانی سوالات
	11.8.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	11.8.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	11.8.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
11.9		تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم اور قومی رہنما مولانا ابوالکلام آزاد جامع الصفات شخصیت اور مجمع اخلاق انسان تھے۔ وہ علوم دینیہ اور عصری علوم کے بحر بسیط تھے۔ اس کے علاوہ وہ انشاپرداز اور زبان داں ادیب، بے باک اور بے مثال صحافی ہونے کے ساتھ جادو بیاں خطیب اور بہترین مفسر بھی تھے۔ آزاد بصیرت افروز، عاقبت اندیش اور دور بیں سیاست داں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو علمی، دینی اور سیاسی بساط پر سرخ رو دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے سیاسی تبحر کو دیکھتے ہوئے انھیں انڈین نیشنل کانگریس ورکنگ کمیٹی کے لیڈر کے ساتھ ساتھ کئی دفعہ پارٹی کا قومی صدر بھی منتخب کیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار بیسویں صدی کے بہترین اور ممتاز مصنف کے طور پر ہوتا ہے۔ ان کی مقبول و معروف کتابوں میں ''غبارِ خاطر'' انڈیا ونس فریڈم (انگریزی) تذکرہ اور ترجمان القرآن قابل ذکر ہیں۔ اسی کے ساتھ ان کی

شخصیت علمی اور ادبی اعتبار سے منفرد و نمایاں رہی ہے۔ آزاد کی ادبی شخصیت کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فطری نثار اور شاعر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اول اول انھوں نے شعر گوئی میں طبع آزمائی کی مگر بہت جلد شاعری کی جانب سے منھ موڑ کر نثر کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔ جس کے سبب مولانا کی شاعری کے حوالے سے جتنا کام ہونا چاہیے تھا نہیں ہوا۔ ان کے فارسی اور اردو کلام کو ڈاکٹر عبد الغفار شکیل نے ''دیوان ابو الکلام آزاد'' کے نام سے آراستہ کر کے منظر عام پر لایا ہے جس کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا آزاد ایک اچھے شاعر بھی تھے۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مولانا ابو الکلام آزاد کے شعری سفر کے آغاز پر روشنی ڈال سکیں۔
- مولانا آزاد کے شعری اسلوب کی وضاحت کر سکیں۔
- آزاد کی شاعری کے رنگ و آہنگ اور ان کی شاعری کے نمایاں پہلوؤں کا تجزیہ کر سکیں۔

11.2 مولانا ابو الکلام آزاد کا شعری سفر

مولانا ابو الکلام آزاد ایک اچھے اور پختہ کار شاعر تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی شاعری کے تعلق سے کم ہی لوگوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔ جب کہ انھوں نے محض 12-11 برس کی عمر میں اپنے اندر شعری ذوق پروان چڑھا لیا تھا۔ جب ابتدائی دور میں وہ مشق سخن کر رہے تھے اس وقت فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی اور امیر الشعرا امیر مینائی سے اصلاح لیتے تھے۔ انھوں نے اپنی کہانی ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں اپنے شعری ذوق اور پسند کے تعلق سے واضح طور پر لکھا ہے کہ میں سب سے پہلے جس چیز سے واقف کار ہوا وہ شاعری ہے۔ اس تعلق سے مولانا کا یہ قول دیکھیے:

> یہ عجیب بات ہے کہ درسیات کے باہر جس چیز سے سب سے پہلے آشنا ہوا وہ شاعری تھی۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ پہلے پہل کیوں کر میں اس چیز سے واقف ہوا لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ زیادہ شوق اس کا مولوی عبد الواحد خاں سہسرامی کی وجہ سے ہوا۔''
>
> (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی)

مندرجہ بالا اقتباس سے دو باتوں کا علم ہوتا ہے ایک تو یہ کہ مولانا آزاد کا شاعری سے قلبی لگاؤ تھا اور طبیعت کی موزونیت کے سبب وہ شاعری سے نہ صرف شغف رکھتے تھے بلکہ سب سے پہلے شاعری شروع کی۔ دوسری بات یہ کہ مولانا کو شعر کہنے اور شعر گوئی کی طرف مولوی عبد الواحد خاں سہسرامی نے مائل کیا۔ یہیں سے ان کی شاعری کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے مولوی عبد الواحد خاں سہسرامی کو ان

کا پہلا استاد تسلیم کرنا چاہیے۔ اسی عہد میں کلکتہ میں سہ روزہ مشاعرہ کا انعقاد ہوا تھا جس سے مولانا آزاد کو کافی تحریک بھی ملی تھی اس تعلق سے وہ مفصل لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

> اس زمانے میں کلکتے میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا، اس کا انتظام پٹنہ کے بادشاہ میاں نامی ایک رئیس نے کیا تھا۔ اس کے لیے کلکتے کے باہر کے بھی مشہور اشخاص، مثلاً جلال مرحوم بلائے گئے تھے..... تین دن تک مسلسل مشاعرہ جاری رہا تھا۔ مولوی عبد الواحد نے غزلیں لکھی تھیں اور مشاعرے میں سنائیں۔ یہ پہلی منظم دلچسپی جو میرے حافظے میں شاعری کی نسبت پائی جاتی ہے۔''
>
> (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی)

گویا مولوی عبد الواحد خاں کی ہی بدولت ابو الکلام آزاد کے اندر نہ صرف شعری ذوق پیدا ہوا بلکہ انہی کے سبب انھوں نے باضابطہ شعر کہنا شروع کیا۔ چوں کہ آزاد طبعاً ذہین اور فطرتاً زیرک واقع ہوئے تھے اس لیے انہیں صرف اشارے اور سہارے کی ضرورت تھی۔ اس مکافات عمل کے تعلق سے وہ خود ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''چنانچہ میں نے بعض اساتذہ کے دواوین خریدے۔ مثلاً سودا اور میر وغیرہ اور فرصت کے اوقات میں ان کا مطالعہ کرنے لگا۔ ساتھ ہی خود بھی شعر کہنے کا شوق ہوا اور روز بروز طبیعت میں اس کا شوق اور کاوش بڑھتی گئی۔ چنانچہ مختلف زمینوں میں بہت سے اشعار کہے مگر خود اعتمادی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے مولوی عبد الواحد خاں کو کبھی نہیں سنائے..... اسی زمانے میں بمبئی سے گلدستہ ارمغان فرخ نکلتا تھا اور کلکتے میں بعض لوگ اس کی طرحوں پر ماہوار مشاعرہ بھی منعقد کیا کرتے تھے، سب سے پہلی غزل جو میں نے لکھ کر دوسروں کو سنائی وہ اسی ایک طرح پر تھی۔ اس میں طرح ہوتی تھی.....ع ''پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی''..... اور کلکتے کے مشاعرے میں بھی یہی طرح قرار پائی تھی۔ عبد الواحد نے اپنے چند اشعار اس میں سنائے اور مجھ کو اس درجہ شوق ہوا کہ بڑی کوشش اور جانکاہی سے تقریباً تیس شعر لکھ کر ان میں سے سترہ شعر منتخب کیے تاہم طبیعت مطمئن نہ تھی اور کسی کو سناتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔''
>
> (آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ فطرتاً موزوں طبع واقع ہوئے تھے اور وہ اپنے شعری ذوق کی تسکین کے لیے شعر کہنا پسند بھی کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس وقت کے رسائل میں ان کا کلام شائع بھی ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں شاعری میں وہ شہرت نہیں ملی جس کے وہ متقاضی تھے۔ چوں کہ ہر ذی علم اور اہم شخصیات کا میدان کار وسیع اور متنوع ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ ازراہِ تفنن طبع دیگر میدانوں میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مولانا آزاد کی طرح منفرد اور ممتاز شخصیات جن کے شاعرانہ پہلو اور شعری انفراد پر کم ہی

توجہ دی گئی۔ ان میں سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں اور علامہ قاری طیب اہم ہیں۔ جب کہ مولانا آزاد کے تعلق سے حتمی طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنا شعری سفر کم سنی ہی سے شروع کیا تھا۔ اس طور پر ان کی شاعری عہد طفلی ہی سے مشق سخن کی مرہون ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی سب سے پہلی غزل جو ''ارمغانِ فرخ۔ بمبئ'' میں شائع ہوئی تھی۔ وہ چار اشعار پر مشتمل ہے ملاحظہ کریں:

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جاں کی — نکلی صداتو فصد کھلے گی زبان کی
گنبد ہے گرد بار تو ہے شامیانہ گرد — شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی
ہوں نرم دل کہ دوست کی مانند رو دیا — دشمن نے بھی جو اپنی مصیبت بیان کی
آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ — پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

آزاد کی یہ سب سے پہلی غزل ہے جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک فطری شاعر تھے۔ انہیں شاعری کا یہ ملکہ خدا کا عطیہ تھا۔ کیوں کہ مندرجہ بالا اشعار کو پڑھ کر کسی طور پر محسوس نہیں ہوتا کہ یہ غزل کسی نو عمر یا تازہ کار شاعر کی ہے۔ بلکہ لفظوں کے استعمال، شعر کی روانی اور متنوع خیالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے دلجمعی کے ساتھ مشاقی کر کے فن شاعری پر کمال درجہ قدرت حاصل کی۔

11.3 مولانا آزاد کی شاعری کی خصوصیات

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے طرزِ نگارش کے خوبصورت شاعر تھے یہ اور بات ہے کہ ان کی شاعری کا شُہرہ عام نہیں ہو سکا۔ مولانا آزاد کی شعر فہمی اور شعر گوئی فطری تھی۔ ان کی نثر کو ''شعر منثور'' سے تعبیر کیا جاتا ہے جب کہ انہیں شاعری سے فطری لگاؤ تھا اور یہ تعلق انھیں تاعمر رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد نثر بھی لکھتے تھے تو شعر کا گمان ہوتا۔ ان کی نثر پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نثر بھی ہے اور شاعری بھی۔ اگر وہ اپنے شعری سفر کو بدستور جاری رکھتے تو بعید نہیں کہ دنیا ایک دوسرے اقبال کے نام سے ان کو یاد کرتی۔ علامہ اقبال اور آزاد ایک ہی عہد کی دو شخصیتیں تھیں دونوں کے افکار و خیالات جدا ضرور تھے مگر ایک دوسرے سے ہم آہنگ تھے۔ اور دونوں نے اپنے فکری خیالات اور فنی برتاؤ سے چونکایا ہے۔ مولانا آزاد کو شعر فہمی کا جو ملکہ حاصل تھا وہ خداداد تھا۔ اس تعلق سے ان کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔ شعر سے دلچسپی اور فہم و خیالات کی روشن مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ انھوں نے کبھی کوئی ایسا شعر پسند نہیں کیا جس سے ان کے وجدان، جذبات اور جمالیات کا خوشگوار امتیازی پہلو نمایاں نہ ہوتا ہو۔ انھوں نے ''غبار خاطر'' میں اشعار کے انتخاب سے اپنی فکر، خوش سلیقگی، تازہ کاری، فہم کی پختگی اور جمالیاتی ذوق کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے جس کی نظیر اردو زبان وادب میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے اور ان کے فطری شاعر ہونے کی بھی دلیل ہے۔ انھوں نے نثر میں شعر کو کھپا کر نثر کا حصہ بنا دیا اور یہ وہی کر سکتا ہے جسے شعر گوئی کے ساتھ شعر فہمی کا ادراک ہو۔ مولانا آزاد کا شعری سرمایہ ''کلیات آزاد'' کے نام سے ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری نے ترتیب دیا ہے۔ جس میں ان کے اردو اور فارسی کلام کو یکجا کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے ان کی چار نعتوں کو شامل کیا ہے۔ اس کے بعد صرف نو غزلیں شامل ہیں۔ پہلی غزل سات اشعار پر مشتمل

ہے۔ دوسری گیارہ اور تیسری انسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ جو مصرع طرح ''توبہ کا نام لیں مرے دشمن بہار میں'' پر کہی گئی ہے۔ چوتھی غزل چودہ اور پانچویں چار اشعار پر مشتمل ہے۔ اسی طرح چھٹی اور ساتویں غزل میں سات سات اشعار ہیں۔ آٹھویں غزل میں پانچ اشعار ہیں اور نویں غزل میں تینتیس اشعار شامل ہیں۔ غزلوں کے بعد رباعیات کا گوشہ ہے جس میں صرف پانچ رباعیاں شامل ہیں۔ اس کے بعد قطعات اور قطعات تاریخ کا گوشہ ہے جس میں دس قطعات شامل ہیں۔ اسی طرح چند ابیات اور پھر فارسی کلام کے ساتھ عکس کلام مولانا ابو الکلام آزاد شامل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا شعری سرمایہ مختصر ہے مگر اس بات کا تذکرہ بھی ملتا ہے کہ تقسیم ملک کے حادثے میں مولانا آزاد کا خاصا سرمایہ ضائع بھی ہوا ہے، جس میں شعری سرمایہ کا ذکر بھی ہے جو آزادی سے قبل کا سرمایہ تھا وہ تقسیم ملک کی نذر ہو گیا۔ مولانا آزاد کا شعری ذوق بے حد مصفا تھا، روایت کی پاسداری، کلاسیکی رچاؤ اور لہجے کی روانی ان کی شاعری کا اصل زیور ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ کریں:

کچھ ایسے محو ہوگئے اقرار یار میں
لطف انتظار کا ہے ملا انتظار میں

کسی میں تو نظر آجائے گا تیرا جلوہ
اسی خیال سے ہم ہر بشر کو دیکھتے ہیں

پھر جو وعدہ بھی ہو پورا تو یہ شکوہ ہے تمہیں
کہ کبھی وقت معین پہ میں آتا ہی نہیں

وعدہ وصل بھی کچھ طرفہ تماشہ کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو بھی یاد نہ ہو

مندرجہ بالا اشعار کا باریک بینی کے ساتھ محاکمہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ مولانا ابو الکلام آزاد کلاسیکی فکر و خیال، تراکیب اور لفظیات کے استعمال سے اول تا آخر دست بردار نہیں ہوئے، بلکہ شروع سے آخر تک اپنا شعری رجحان اور رویہ کلاسک ہی رکھا۔ جابجا وہ داغ، امیر مینائی، شوق نیموی، ظہور میر ٹھی وغیرہ کی اتباع کرتے نظر آتے ہیں۔ چوں کہ انھیں شعر گوئی کا ملکہ قدرت کی جانب سے ودیعت تھا جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے کلام میں ہنر مندی کا جوہر دکھایا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری کی نہیں ہے بلکہ طبیعت نے کہلوائی ہے۔ آزاد کی شاعری میں جو چیز سب سے زیادہ لطف دیتی ہے وہ یہ کہ انھوں نے فطری مناسبت کے ساتھ خارجی عوامل کو بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی شاعری میں جو چیز سب سے زیادہ ابھری ہوئی ہے۔ ان کی

زبان دانی ہے کیوں کہ انھوں نے جگہ جگہ اپنی زبان دانی کا استعمال کر کے شعریت کو کہیں بھی زائل ہونے یا شعر کی کیفیت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔ مولانا آزاد کی پوری شاعری میں کمیت کا اعتبار نہیں بلکہ کیفیت کا ہے۔ کیوں کہ ان کی شاعری ایک قسم کی کیفیت سے عبارت ہے۔ اس طرح ان کی شاعری کو پڑھ کر فطری مناسبت کے ساتھ زبان و بیان پر مہارت اور فن سے پوری طرح واقفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں مزید چند منتخب اشعار پیش کیے جارہے ہیں جس کو پڑھ کر ان کے شعری کمالات، ہنر مندی، فنی رچاؤ اور بیان کے تسلسل کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکے گا۔

اس نے تلواریں لگائیں ایسے کچھ انداز سے
دل کا ہر ارماں فدا ے دستِ قاتل ہوگیا

پہلے تھا رخ کا تصور اب ہے گیسو کا خیال
وہ تھی صبح عشق گویا اور یہ ہے شام عشق

محفل میں اپنی دیکھ کے مجھ کو وہ کہہ اٹھے
رسوا نہ کیجیے مجھے سو میں ہزار میں

اے دل خدا کی یاد میں اب صرف عمر ہو
کچھ کم پھرے صنم کدۂ روزگار میں

کھلا ہے منہ جو لحد میں کھلا ہی رہنے دو
جگہ نئی ہے مسافر ہیں، گھر کو دیکھتے ہیں

خجلت کے مارے لعل یمن ہوگیا سفید
ان کے ہونٹ پہ دیکھ لی سرخی جو پان کی

مولانا آزاد کی شاعری کا جو بھی سرمایہ محفوظ ہے اس کو پڑھ کر یہ احساس شدت کے ساتھ ذہن و دل میں جاگزیں ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں کمیت کا نہیں بلکہ کیفیت کا مسئلہ ہے۔ کیوں کہ ان کی پوری شاعری کا رچاؤ ان کے افتاد طبع کی مرہون ہے۔ انھوں نے متقدمین کی طرح تقریباً اصناف سخن مثلاً غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، قطعہ تاریخ اور نعت میں طبع آزمائی کی ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ تمام صنفوں میں غزل ہی کی طرح جولانی طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی طرح ان کی فارسی کی شاعری میں بھی اردو شاعری کی ہی طرح زبان و بیان، روانی اور فنی

چابک دستی کا اظہار ہوا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد خوش فکر شاعر ہونے کے ساتھ بے دار مغز شاعر ہیں جن کی شاعری میں فن شاعری کی تمام خوبیاں بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔

11.4 مولانا ابو الکلام آزاد کا شعری اسلوب

مولانا آزاد عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ جب ہم ان کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تب اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اچھے ادیب، سیاسی لیڈر، خطیب اور صحافی ہی نہیں بلکہ شاعرانہ مزاج کے حامل انسان بھی تھے۔ ان کی شخصیت کا عکس ہم ان کے خطوط اور دیگر تخلیقات کے ساتھ ان کی شاعری میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ مولانا روایت پسند شاعر تھے جدت پسندی سے وہ کوسوں دور تھے غالباً یہی وجہ تھی کہ ان کے شاعری میں، ان کا اسلوب کلاسیکی رچاؤ سے مملو ہے۔ ان کے یہاں ہمیں روایتی طرز شاعری کا بھرپور عکس دیکھنے کو ملتا ہے، غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ انھوں نے امیر مینائی، داغ دہلوی، مومن خاں مومن اور حسرت موہانی کے طرز اسلوب کو اپنایا جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں متذکرہ شعرا کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس کے سبب ان کی شاعری میں روایتی الفاظ کا خوبصورت برتاؤ ہوا ہے۔ مثلاً اسیر گیسوئے خم دار ہونا، رنگِ محفل کا دگر گوں ہونا، دیدۂ نرگس کا نور زائل ہونا اور دل کے ارمانوں کا فدائے دستِ قاتل ہونا، قیس و مجنوں، لیلیٰ و محمل، کمندِ زلف کا اسیر ہونا وغیرہ۔ نمونتاً یہاں ایک ایسی غزل پیش کی جارہی ہے جس میں مولانا آزاد نے متذکرہ روایتی الفاظ کو بے حد خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

کیوں اسیر گیسو سے خم دار قاتل ہوگیا — ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہوگیا
کوئی نالاں، کوئی گریاں، کوئی بسمل ہوگیا — اس کے اٹھتے ہی دگر گوں رنگِ محفل ہوگیا
اس نے تلواریں لگائیں ایسے کچھ انداز سے — دل کا ہر ارماں فدائے دستِ قاتل ہوگیا
انتظار اس گل کا اس درجہ کیا گلزار میں — نور آخر دیدہ نرگس کا زائل ہوگیا
قیس مجنوں کا تصور بڑھ گیا جب نجد میں — ہر بگولا دشت کا لیلیٰ کا محمل ہوگیا
یہ بھی قیدی بن گیا آخر کمندِ زلف کا — لے اسیروں میں ترے آزادؔ شامل ہوگیا

اگر مولانا ابو الکلام آزاد کی بیشتر غزلوں کا غائر مطالعہ کیا جائے تو بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا اسلوب اور طرزِ خیال کس طرح کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے یہاں نیا پن نہیں ہے اور نہ ہی انھوں نے لفظوں کی سطح پر کسی قسم کا تجربہ کیا ہے۔ اسی طرح ان کے یہاں تراکیب کا استعمال بر محل ضرور ہے مگر اس کا برتاؤ اپنی روایت سے پیوست ہے۔ نئے پن کی آہٹ لفظوں اور تراکیب کی سطح پر ہمیں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ باوجود اس کے زبان کی لذت، بیان کی پرکاری، تراکیب کا برتاؤ اور طرز اسلوب خوب مزہ دیتے ہیں۔ مولانا کے شعری رویے اور رجحان سے محسوس ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے شعری سفر کو جاری رکھتے اور نثر کی طرف بالکلیہ مائل نہ ہوتے تو یقین تھا کہ وہ شاعری میں ید طولیٰ حاصل کرتے اور شاعری کے میدان میں بھی وہی کارنامہ انجام دیتے جو انھوں نے سیاست،

صحافت اور نثر کے میدان میں دیے ہیں۔

مولانا آزاد نے اپنے شعری سفر کے آغاز ہی میں اپنے اسلوب کے انوکھے برتاؤ اور لفظوں کے برمحل استعمال سے متعجب اور متحیر کیا۔ جس سے ان کے شعری کمال ہنر کا اندازہ ہوتا ہے۔ جب ہم ان کی شاعری کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ان کا اسلوب سادہ، سلیس، پرکشش، جاذب اور دل کو چھو لینے والا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے احساسات وخیالات ولولہ انگیز، فکر کی تازگی سے مزین اور غیر مبہم ہیں۔ نثر کی طرح شاعری میں بھی ان کا اسلوب رواں پر لطف اور پرکاری سے آراستہ ہے۔

11.5 نمونہ کلام

نعت:

موزوں کلام میں جو ثنائے نبی ہوئی — تو ابتدا سے طبع رواں منتہی ہوئی
ہر بیت میں جو وصف پیمبر رقم کیے — کاشانہ سخن میں بڑی روشنی ہوئی
ظلمت رہی نہ پر تو حسن رسولؐ سے — بیکار اے فلک شب مہتاب بھی ہوئی
ساقی و سلسبیل کے اوصاف جب پڑھے — محفل تمام مست مے بے خودی ہوئی
دل کھول کر رسولؐ سے میں نے کیے سوال — ہرگز طلب میں عار نہ پیش سخی ہوئی
تاریک شب میں آپ نے رکھا جہاں قدم — مہتاب نقش پا سے وہاں روشنی ہوئی
ہے شاہدیں سے کوثر و تسنیم کا کلام — یہ آبرو تمام ہے حضرت کی دی ہوئی
سالک ہے جو کہ جادہ عشق رسولؐ کا — جنت کی راہ اس کے لیے ہے کھلی ہوئی
آزاد اور فکر جگہ پائے گی کہاں — الفت ہے دل میں شاہ زمن کی بھری ہوئی

غزلیات:

(1)

جوش وحشت میں مسلم ہو گیا اسلام عشق — کوچہ گردی سے مری پورا ہوا احرام عشق
میرے مرنے سے کھلا حال محبت خلق پر — سنگ مرقد بن گیا آئینہ انجام عشق
یہ صلہ پایا وفا کا حسن کی سرکار سے — چہرۂ عاشق کی زردی ہے زر انعام عشق
پہلے تھا رخ کا تصور اب ہے گیسو کا خیال — وو تھی صبح عشق گویا اور یہ ہے شام عشق
آستان یار پر ہر وقت سجدہ کیجیے — ہے یہی بس دین عشق ایمان عشق اسلام عشق

ہوں اسیر زلف ظاہر ہے خط تقدیر سے
دائرے حرفوں کے مل کر بن گئے ہیں دام عشق

عرش اعظم سے بھی اونچی ہو گئی میری فغاں
آج تک پایا نہ اے آزادؔ اوج بام عشق

(2)

ان شوخ حسینوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
اور ان کی اداؤں میں مزا اور ہی کچھ ہے

یہ دل ہے مگر دل میں بسا اور ہی کچھ ہے
دل آئینہ ہے جلوہ نما اور ہی کچھ ہے

ہم آپ کی محفل میں نہ آنے کو نہ آتے
کچھ اور ہی سمجھے تھے ہوا اور ہی کچھ ہے

بے خود بھی ہیں ہوشیار بھی ہیں دیکھنے والے
ان مست نگاہوں کی ادا اور ہی کچھ ہے

آزادؔ ہوں اور گیسوئے پیچاں میں گرفتار
کہہ دو مجھے کیا تم نے سنا اور ہی کچھ ہے

(3)

فراق یار میں دل یا جگر کو دیکھتے ہیں
جدھر لگی ہے ہمیں چوٹ ادھر کو دیکھتے ہیں

جفا کا شوق ہے کہتے ہیں نازکی بھی ہیں
وہ پہلے تیغ کو اور پھر کمر کو دیکھتے ہیں

کھلا ہے منہ جو لحد میں کھلا ہی رہنے دو
جگہ نئی ہے مسافر ہیں گھر کو دیکھتے ہیں

ہمارے درد کو جاتا ہے لادوا کہہ کر
نگاہ یاس سے ہم چارہ گر کو دیکھتے ہیں

کسی میں تو نظر آجائے گا تیرا جلوہ
اسی خیال سے ہم ہر بشر کو دیکھتے ہیں

یہاں تک اپنی طبیعت ہے بدگماں ان سے
کہ ان کی بزم میں ہر اک نظر کو دیکھتے ہیں

جوانی آتے ہی ان کو غرور حسن آیا
کچھ اب پھری ہوئی ان کی نظر کو دیکھتے ہیں

یہ کیوں زبان سے ارشاد ہو گا خط کا جواب
کہ نامہ دیکھ کے اب نامہ بر کو دیکھتے ہیں

غضب ہے دیکھ کے غیروں کو وہ کنکھیوں سے
یہ پوچھتے ہیں کہو ہم کدھر کو دیکھتے ہیں

ہر ایک سخن میں نہاں ہیں وہ صورت معنی
ہم ان کے حسن کے حسن اثر کو دیکھتے ہیں

ستانے کو مجھے کہتے ہیں غیر کی نظریں
یہ وہ نظر ہیں کہ ہم جن نظر کو دیکھتے ہیں

تسلیاں شب فرقت میں دیں کے آخر کار
ابھی ترقی درد جگر کو دیکھتے ہیں

پڑے لچک نہ کہیں راہ میں بوقت خرام
سنبھل سنبھل کے وہ اپنی کمر کو دیکھتے ہیں

وہ خود ہی ہوگئے آزاد طالب دیدار
ہم آہ آہ کے حسنِ اثر کو دیکھتے ہیں

قطعات:

(1)

آزاد کل جو سیر کو صحرا کی میں گیا — دیکھا کہ ایک شخص وہاں بے قرار تھا
اپنی بنا کے قبر اسے دیکھتا تھا وہ — پھر دیکھ کر اسے وہ بہت زار زار تھا
کہتی تھی اس کو خلق کہ دیوانہ ہوگیا — دیکھا جو میں نے ایک ہی وہ ہوشیار تھا

(2)

چھیڑو نہ مجھے کہ ہم صفیرو — مجھ مست کو مے کی بو بہت ہے
مجھ سے نہ کہو فسانہ قیس — دیوانے کو ایک ہو بہت ہے

قطعہ تاریخ:

ہوئی لندن میں از فضل الٰہی — نہایت شان سے جب تاجپوشی
کہا آزادؔ نے بڑھ کر ادب سے — مبارک شاہ کو اب تاجپوشی

1330ہجری

رباعیات:

(1)

آفت ہے قصہ جوانی میرا — ظاہر ہے حال نوحہ خوانی میرا
اک جان بچاؤں کس طرح میں آزادؔ — دل کا دشمن ہے یار جانی میرا

(2)

تھا جوش وخروش اتفاقی ساقی — اب زندہ دل کہاں ہے باقی ساقی
مے خانے نے روپ بدلا ایسا — میکش میکش رہا نہ ساقی ساقی

(3)

کیوں طعنہ خویش اقربا سہتے ہیں — ہے بات کوئی کہ آپ چپ رہتے ہیں
ہیں کس کے خیال میں جناب آزادؔ — سنتے ہیں کسی کی اور نہ کچھ کہتے ہیں

(4)

افسوس وہ بے غمی کی طفلی نہ رہی　　افسوس وہ عیش کی جوانی نہ رہی
لے دے کے رہی تھی ایک پیری اے مرگ　　تو کیا آئی کہ ہائے وہ بھی نہ رہی

(5)

کیوں ہے یہ خراب اور کیوں ہے یہ برا　　چاہ اپنی ہے اور شوق اپنا اپنا
ہے وعظ کی لت اسے ہمیں شراب مدام　　اس کو اس کا ہے شوق ہم کو اس کا

(6)

سنتے ہیں رقیب سے ملاقاتیں ہیں　　صحبت دن رات ہے مداراتیں ہیں
ہم کو نہیں اعتبار جو چاہو کہو　　عاشق سے وہ منھ لگائے یہ باتیں ہیں

11.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درجہ ذیل باتیں سیکھیں:

- مولانا ابو الکلام آزاد ایک ذہین ادیب اور خوش فکر شاعر تھے۔ شاعری سے ان کی فطری وابستگی تھی یہی سبب ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے شعر کہنا شروع کیا۔
- مولانا ابو الکلام ذہین اس قدر تھے کہ وقت سے پہلے ہی بھانپ گئے کہ ان کا مستقبل کس میدان میں روشن ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے عہد طفلی ہی میں شاعری سے دست بردار ہو گئے اور نثر لکھنے لگے۔ جس کی وجہ سے ان کا شعری سرمایہ کم ہے۔ مگر جو کچھ بھی ہے وہ کیفیت کے اعتبار سے وقیع ہے۔
- آزاد کی شخصیت بے حد پر وقار اور صاحب تمکنت تھی۔ وہ مخلص، ملنسار اور ہمدرد انسان تھے۔ ان کے ملنے کا انداز اور گفتگو کا طور طریق پر کشش اور جاذب تھا۔
- مولانا ابو الکلام خالص اردو زبان میں گفتگو کرتے جسے سن کر کتابی زبان کا احساس ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعری اسلوب جدت پسندی سے عاری اور کلاسیکی الفاظ و تراکیب سے مزین ہے۔
- مولانا آزاد کا شعری اسلوب رواں، پر کشش اور دلکشی سے آراستہ ہے۔ ان کی شاعری کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ فطری شاعر تھے اور ان کی شاعری ان کی فطرت کی آواز تھی۔
- مولانا ابو الکلام آزاد کی شاعری کا غائر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کا شعری سرمایہ کم ضرور ہے مگر ان کی شاعری اپنی کیفیت کے اعتبار سے ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔

- آزاد کی شاعری ان کی فطرت کی آواز تھی جس کی وجہ سے ان کی تخلیقات کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ فطری شاعر تھے اور ان کی شاعری ان کے باطن کی آواز تھی۔
- مولانا آزاد کے کلام پڑھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا ہے کہ یہ کلام کسی کم عمر بچے کا ہے۔ بلکہ اس کی زبان، بیان، انداز اور تراکیب کے برتاؤ سے کسی پختہ کار اور کہنہ مشق شاعر کا عکس ذہن میں ابھرتا ہے۔
- مولانا آزاد کی نثر پڑھنے والوں کو جس قدر مزہ آتا ہے۔ اسی قدر ان کی شاعری پڑھنے والے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔
- آزاد کی شاعری کی دو خصوصیات ایسی ہیں جس کا انکار کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ مولانا آزاد نے کلاسیکی فکر و خیال کے ساتھ کلاسیکل انداز سے کبھی روگردانی نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ ان کا مکمل شعری سرمایہ ایک پختہ کار اور کہنہ مشق شاعر کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ زیادہ تر کلام عنفوان شباب کا ہے۔
- آزادؔ نے اپنی شاعری میں زبان و بیان کا وہی جادو جگایا ہے جو نثر میں ہے۔ مگر ہنر کا کمال یہ ہے کہ زبان دانی اور مشکل تراکیب کے استعمال کے باوجود بھی شعر کی شعریت کو زائل ہونے نہیں دیا ہے۔

11.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
سرخ رو	:	فتح مند، کامیاب، کامران
تبحر	:	دریا جیسا ہونے کی صفت، بڑا عالم ہونا، کسی ہنر میں کامل ہونا، گہرائی، بے پایانی
نثار	:	نثر لکھنے والا، انشا پرداز، مصنف
طبع آزمائی	:	ذہن و فکر کی جودت دکھانا، اپنے فن کے جوہر دکھانا
خامہ فرسائی	:	اپنے خیالات کو ضبط تحریر میں لانا، لکھنا، تحریر کرنا، خامہ برداری
مشق سخن	:	شعر و سخن کی مشق و مہارت، شعر کہنا، شعر گوئی
موزونیت	:	موزوں طبع ہونا، حسب حال ہونا، موزوں ہونا، درستی، مناسبت، قابل عمل ہونا
اسیر	:	قیدی، محبوس، گرفتار
گیسو	:	لمبے بال جو سر کے دونوں طرف ہوتے ہیں، سر کے لمبے بال
خم دار	:	بل کھایا ہوا، پیچ دار، گرہ گیر، خمیدہ
نالاں	:	روتا ہوا، مجبور، نالہ کرتا ہوا، شاکی، فریادی، عاجز، تنگ
متعجب	:	تعجب کرنے والا، حیرت زدہ، حیران، ششدر، متحیر، دنگ
متحیر	:	حیران، حیرت زدہ، دنگ، حواس باختہ، سراسیمہ، ہکا بکا، مبہوت

کمیت	:	مقدار جو تولی یا ناپی جائے (کیفیت کی ضد)
افتادِ طبع	:	مزاج، طبیعت، فطرت، جبلت، رجحان، ذہنی جھکاؤ

11.8 نمونہ امتحانی سوالات

11.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کے ذہن میں جس اولین مشاعرے کی یاد محفوظ تھی وہ کہاں منعقد ہوا تھا؟
2. درسیات کے بعد مولانا آزاد کس کی طرف مائل ہوئے؟
3. مولانا آزاد کی پہلی غزل کس رسالے میں شائع ہوئی؟
4. کلیات آزاد میں کتنی غزلیں شامل ہیں؟
5. آزاد کے دیوان کا مکمل نام کیا ہے؟
6. مولانا آزاد کا کلام کس نے مرتب کیا؟
7. ابوالکلام آزاد نے جب شاعری شروع کی اس وقت ان کی عمر کیا تھی؟
8. مولانا آزاد نے سب سے پہلے شاعری کا استاد کسے بنایا؟
9. آزاد نے اپنی شاعری کے تعلق سے اپنی کس کتاب میں تفصیل سے لکھا ہے؟
10. مولانا ابوالکلام آزاد نے شاعری میں جن لوگوں کی اتباع کی ان میں سے کسی دو شاعر کا نام لکھیے؟

11.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کے معاصرین میں کون سی ممتاز شخصیات تھیں جن کی شاعری کو شہرت نہیں ملی۔
2. مولانا آزاد کی شاعری کو کس لیے کلاسیکی رنگ کی شاعری کہا جاتا ہے؟
3. مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی شاعری کے تعلق سے اپنی کتاب میں جو لکھا ہے، اسے اپنے لفظوں میں لکھیے۔
4. مولانا آزاد کی شاعری پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. ان اشعار کی تشریح کیجیے۔

ہوں نرم دل کہ دوست کی مانند رو دیا
دشمن نے بھی جو اپنی مصیبت بیان کی

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

11.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا ابوالکلام آزاد کے شعری سفر کو بیان کیجیے۔
2. مولانا ابوالکلام آزاد کے شعری اسلوب پر روشنی ڈالیے۔
3. مولانا ابوالکلام آزاد کی شاعری کے رنگ و آہنگ کی وضاحت کیجیے۔

11.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. کلیات آزاد	مرتب: ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری
2. مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے	مرتبہ: خلیق انجم
3. مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت، سیاست اور پیغام	رشید الدین خان
4. مآثر مولانا ابوالکلام آزاد	پروفیسر خلیق احمد نظامی
5. کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں	مالک رام
6. مولانا آزاد کے مراسلات کا کلنڈر	پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین

اکائی 12: مولانا آزاد کی خطابت

(قولِ فیصل کے حوالے سے)

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید

12.1 مقاصد

12.2 خطابت کی تعریف، اہمیت وافادیت

12.3 خطابت کے عناصر اوراغراض ومقاصد

12.4 خطابت کا آغاز وارتقااور اردو خطابت

12.4.1 خطابت کا آغاز وارتقا

12.4.2 اردو خطابت پر ایک اجمالی نظر

12.5 مولانا آزاد اور قولِ فیصل کا تعارف

12.6 مولانا آزاد بحیثیتِ خطیب

12.6.1 مولانا آزاد کی خطابت کے موضوعات اور اسلوبِ خطابت کی خصوصیات

12.6.2 مولانا آزاد کی خطابت کے بارے میں دانشوروں کے تاثرات

12.7 مولانا آزاد کی خطابت قولِ فیصل کے حوالے سے

12.8 اکتسابی نتائج

12.9 کلیدی الفاظ

12.10 نمونہ امتحانی سوالات

12.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

12.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

12.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

12.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید

مولانا ابوالکلام آزاد ایک صاحبِ طرز ادیب، متحرک وفعال صحافی اور منفرد لب ولہجے کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر خطیب اور شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ اور ان کا شمار برِ صغیر کے چوٹی کے خطیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کے خطبات نے ملک کی تحریکِ آزادی کو سر گرم کرنے اور اس تحریک کو عوامی تحریک بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس اکائی میں خطابت کی تعریف، اہمیت وافادیت کے ساتھ ساتھ ہم مولانا آزاد کی خطابت کے بارے میں جانیں گے اور ان کی تقریروں کے نمونوں خاص طور سے قولِ فیصل کے حوالے سے یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ کس طرح انہوں نے اپنی ولولہ انگیز تقریروں کے ذریعے ملک کے طول وعرض میں آزادی کی ایسی روح پھونک دی جس کی گرمی سے ایوانِ سیاست میں زلزلہ آگیا اور جس کی وجہ سے انگریزوں نے انہیں قید وبند کی بیڑیوں میں جکڑ کر ان پر مقدمات چلائے، لیکن ان تمام صعوبتوں اور مشقتوں کے باوجود جب بھی انہیں موقع ملا انہوں نے عوام اور حکومت کے سامنے اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- خطابت کے لفظی معنی اور اصطلاحی تعریف بیان کر سکیں۔
- خطابت کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈال سکیں۔
- خطابت کے عناصر اور اہداف ومقاصد اور اس کے اسلوب سے متعارف ہو سکیں۔
- اجمالی طور سے خطابت کے آغاز وارتقا اور اردو خطابت اور اس کے مشہور خطبا سے واقف ہو سکیں۔
- مولانا ابوالکلام آزاد کو بحیثیتِ خطیب بھی جان سکیں۔
- ان کی خطابت کے موضوعات اور اسلوبِ خطابت کی خصوصیات سے واقف ہو سکیں۔
- ان کی خطابت کے بارے میں مشاہیر کے تاثرات کو جان سکیں۔
- قولِ فیصل سے مولانا آزاد کے بیان کے نمونوں کی روشنی میں ان کے طرزِ بیان، طریقۂ استدلال اور ان کی لسانی وتعبیراتی پہلوؤں کو سمجھ سکیں۔

12.2 خطابت کی تعریف اور اہمیت وافادیت

خطابت قدیم نثری اصنافِ سخن میں سے ایک ایسی صنف ہے جو اپنے طریقۂ اظہار میں کسی حد تک مکتوب نگاری سے ملتی جلتی ہے، البتہ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مکتوب نگاری کا تعلق تحریر سے ہے جبکہ فنِ خطابت تقریر سے تعلق رکھتا ہے۔ اور خطابت ابلاغِ عامہ کا سب سے قدیم ذریعہ ہے اور اس بات میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں کہ تقریر سے ہی ابلاغِ عامہ کا آغاز ہوا، اور تقریر کا استعمال انسان نے

تحریر سے پہلے کیا ہے، کیونکہ فنِ تحریر سے انسان بہت بعد میں متعارف ہوا، اور اس کا استعمال بڑی دیر سے شروع ہوا۔ اور سب سے پہلا خطیب وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے اپنے ساتھیوں یا اپنے ارد گرد کے مجمع سے خطاب کیا، اسی وجہ سے یہ کہنا درست ہے انسان نے جب سے بولنا شروع کیا اس نے اپنے افکار وخیالات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے تقریر ہی کا سہارا لیا، اور پھر آہستہ آہستہ زمانہ اور انسانی ترقی کے ساتھ اس نے ایک فن کی حیثیت اختیار کر لی، اس طرح یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ خطابت نے اپنا ارتقائی سفر انسان کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ہی طے کیا ہے۔

اصنافِ سخن کے درمیان فنِ خطابت کی اہمیت کی وجہ سے ہم ذیل میں خطابت کے لفظی معنی اور اس کی اصطلاحی تعریف اور اس کی اہمیت وافادیت کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

خطابت، خطبہ اور تقریر یہ تینوں عربی لفظ ہیں، خطابت اور خطبہ کے لفظی معنی ہیں بات چیت کرنا، کسی کو مخاطب کرنا، بیان اور تقریر کرنا۔ اور تقریر عربی میں رپورٹ کو کہتے ہیں اسی طرح کسی معاملہ کی وضاحت و تحقیق اور ثابت کرنے اور طے کرنے کے معنی میں بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ اردو میں خطبہ تقریر کے مضمون کو کہا جاتا ہے اور خطابت مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر خطاب کرنے کو کہا جاتا ہے۔ جبکہ تقریر کا لفظ اردو میں خطبہ اور خطابت دونوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

عوام سے اجتماعی طور پر ہم کلام ہونے کو خطاب کہا جاتا ہے اور اصطلاحی طور پر خطابت اس فن کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ انسان مختلف قسم کے سامعین سے مخاطب ہو کر ان کے سامنے زبانی طور پر اپنی باتیں رکھتا ہے اور انہیں نہ صرف اپنی باتوں پر قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اپنی منشا و مراد کو سامعین کے دل و دماغ میں اتار کر انہیں اپنا ہم خیال اور ہم نوا بنانے کی کوشش کرتا ہے، اور اپنے حسبِ منشا ان کے اندر کسی عمل کے کرنے یا نہ کرنے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔

خطابت کی تعریف سے ہی اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، کہ وہ ایسا فن ہے جو انسان کے افکار وخیالات کو مختلف پس منظر رکھنے والے مجمع اور متعدد نقطۂ نظر کے حامل سامعین تک مؤثر انداز میں پہنچاتا ہے اور ان کے دل و دماغ کو اس قدر متاثر کرتا ہے جس کے زیرِ اثر ان کے افکار وخیالات میں تبدیلی رونما ہوتی ہے اور ان کے اندر خطیب کے حسبِ منشا کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اپنی اسی افادیت کی وجہ سے خطابت کو نثری اصنافِ سخن میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ خطابت کا دائرہ بہت وسیع ہے اور دنیا کا کوئی موضوع خطابت کی دسترس سے باہر نہیں، ہر موضوع پر تقریر کی جا سکتی ہے اور کسی بھی عنوان کو موضوعِ سخن بنایا جا سکتا ہے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے خطابت کو ابلاغِ عامہ کا بہت مؤثر ذریعہ مانا جاتا ہے۔ اور خطابت دنیا کے ہر گوشے اور ہر انسانی معاشرے میں زمانۂ قدیم سے اب تک نہ صرف رائج، بلکہ نہایت مقبول رہی ہے۔

12.3 خطابت کے عناصر اور اغراض و مقاصد

خطابت خطیب کی زبان دانی اور قوتِ استدلال کا مظہر ہوتی ہے، جس میں سامعین یا مجمع کے سامنے خطیب کسی خاص موضوع یا مسئلے کے متعلق اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے اور انہیں اپنے زورِ بیان اور طریقۂ استدلال کے زور پر اپنے موقف سے قائل کرنے اور اپنا ہم نوا

بنانے کی کوشش کرتا ہے، اس کے پیشِ نظر خطابت کے مندرجہ ذیل تین بنیادی عناصر ہیں:

1. سب سے پہلے خطیب جو اپنے فن اور شخصیت کے مطابق مجمع سے خطاب کرتا ہے۔
2. خطیب کا موضوع یا پیغام جس کا اظہار تو انفرادی ہوتا ہے لیکن اس کا مقصد اور ہدف اجتماعی ہوتا ہے۔
3. مجمع یا سامعین جن سے خطیب مخاطب ہوتا ہے۔

اسی طرح خطبہ کے مضمون کو بھی مندرجہ ذیل تین ذیلی عناصر میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

i. خطبہ کا مقدمہ یا دیباچہ جس سے خطیب اپنی خطابت کا آغاز کرتا ہے۔ خطبہ کا یہ حصہ عام طور سے تمہیدی اور تعارفی کلمات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ضروری ہے کہ یہ تمہیدی کلمات مختصر اور پر کشش ہوں جو سامعین کو اصل موضوع کی طرف متوجہ کر سکیں اور موضوع کے اندر ان کی دلچسپی میں اضافہ کر سکیں تاکہ دورانِ خطاب وہ خطیب کی طرف پوری طرح متوجہ رہیں اور ہمہ تن گوش ہو کر اس کے خطاب کو سنیں۔

ii. خطبہ کا اصل موضوع جس کو سامعین کے سامنے پیش کرنے کے لیے خطیب کھڑا ہوا ہے، خطاب کا یہ حصہ اصل مضمونِ خطابت پر مشتمل ہوتا ہے، جس میں خطیب مضمون یا مسئلہ کا بیان اور اس کی تشریح وتوضیح کرتا ہے اور شواہد ودلائل کی روشنی میں اپنے موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی حصے سے خطیب کے خطاب کا مقصد اور اس کے اہداف بھی سامعین پر عیاں ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہ حصہ زبان وبیان کے لحاظ سے بہت واضح اور دلائل سے اس قدر آراستہ ہو جو سامعین کے دل دماغ کو جھنجھوڑ سکے اور ان کے اندر خطیب کے موقف کی تائید کی تاثیر پیدا کر سکے۔

iii. خطبہ کا اختتامی حصہ جس میں خطیب اپنی تقریر کا نچوڑ اور خلاصہ پیش کر کے سامعین کو پھر سے اپنے بنیادی مقصد کی طرف بلاتا ہے، یہ حصہ بھی بہت مختصر، نہایت جامع اور اس طرح پر اثر ہونا چاہیے کہ سامعین خطیب کے موقف سے مطمئن اور اس کے اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لیے دل سے آمادہ نظر آئیں۔

اسی طرح خطیب کی آواز، لب ولہجہ، زبان کی روانی وسلاست، جسمانی حرکات وسکنات، خطیب کی طبیعت اور مزاج کی متانت وسنجیدگی یا ظرافت وشگفتگی، خطیب کا طرزِ استدلال، پیشکش اور طریقۂ اظہار اسی طرح مناسب تمثیلات اور بر محل اشعار کا استعمال مؤثر خطابت کے ضروری عناصر یا اجزائے ترکیبی میں شامل ہیں۔

خطابت کا بنیادی مقصد خطبہ کے مضمون یا پیغام کو سامعین تک پہنچانا اور انہیں اس پیغام پر قائل کرنا ہوتا ہے، خواہ خطیب کا مقصد سامعین کو کسی موضوع یا مسئلہ کی اہمیت اور افادیت سے واقف کرا کر ان کے اندر اس کے لئے تحریک پیدا کرنا ہو، یا کسی چیز کے نقصانات اور مضر اثرات کو بیان کر کے اس سے احتراز اور بچنے کی ترغیب دینا ہو۔

چونکہ خطیب کا اولین مقصد سامعین کو اپنا ہم خیال بنانا یا انہیں کسی تجویز یا رائے پر متفق کرنا ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ خطابت کا موضوع ایسا ہو جسے لوگ اہمیت دیتے ہوں اور اسے اپنی زندگی یا مقاصد کے لیے ضروری سمجھتے ہوں۔ بنیادی طور پر خطابت کے

اغراض ومقاصد کا انحصار اس کے موضوعات اور سامعین کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ موضوع کا تعلق اگر کسی ایسے سماجی مسئلے سے ہے جس کی طرف معاشرے کی توجہ کی ضرورت ہے تو خطابت کے اغراض ومقاصد سماجی ہوں گے، اسی طرح مسئلے کا تعلق اگر دین، تعلیم وتربیت، یا سیاست سے ہے تو خطابت کا مقصد علی الترتیب دینی واصلاحی یا تعلیمی وتربیتی یا سیاسی ہو گا۔

12.4 خطابت کا آغاز وارتقا اور اردو خطابت

12.4.1 خطابت کا آغاز وارتقا:

خطابت کے آغاز کے بارے میں علمائے لسانیات کی رائے یہ ہے کہ جب سے انسان نے بولنا سیکھا اور زبانی طور سے اپنے مافی الضمیر کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا سیکھا اسی وقت سے خطابت کا آغاز ہوا، اور سب سے پہلا خطیب وہ شخص تھا جس نے اپنے گردوپیش کے مجمع سے خطاب کیا۔ اور یہ کہ انسان کے ارتقائی سفر کے ساتھ ہی خطابت نے بھی اپنے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ تاہم ایک فن کے طور خطابت کا ظہور یونانیوں کے یہاں ملتا ہے، اور اس موضوع پر سب سے پہلے خامہ فرسائی کرنے والا شخص ارسطو(Aristotle384-322 ق۔م) ہے۔ جس نے اپنی کتاب "Rhetoric" میں فنِ خطابت کے اصول وضوابط منضبط کیے۔ ابن رشد نے ارسطو کی کتاب کی تلخیص کی جو "تلخیص الخطابۃ" کے عنوان سے عبد الرحمن بدوی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکی ہے، اسی طرح فارابی اور ابن سینا نے بھی ارسطو کی اس کتاب سے مضامین اخذ کیے۔

یونانیوں کا سب سے بڑا خطیب ڈیموستھینیز(Demosthenes 322 -282ق۔م) مانا جاتا ہے، اہلِ یونان کے بعد یہ فن رومیوں کے ہاتھوں پروان چڑھا، اور سیسرو(Cicero 43-106ق-م) کو سب سے بڑا رومی خطیب سمجھا جاتا ہے

یونانیوں اور رومیوں کے بعد عربوں نے خطابت کو فروغ دیا اور اس فن کو بامِ عروج تک پہنچا دیا، قدرت نے عربوں کو زبان دانی اور الفاظ کی جادوگری کا فن بڑی فیاضی سے عطا کیا تھا، اور ان کے یہاں تحریری اور نثری اصنافِ سخن کا رواج بہت بعد میں ہوا اس لیے ان کی تمام تر توجہ کا مرکز شاعری اور فنِ خطابت ہی تھے، شعر وسخن اور خطابت کی مشق وتربیت ان کے معاشرے کا لازمی جزو تھے۔ انہیں اپنی زبان، حافظے اور خطابت وشاعری پر اس قدر ناز تھا کہ وہ اپنے علاوہ ساری دنیا کو عجم (گونگا) کہتے تھے۔ اور ان دونوں فنون کو عربی معاشرے میں نہایت نمایاں مقام حاصل تھا، ہر قبیلہ کوشاں ہوتا کہ ان میں کوئی بلند پایہ شاعر وخطیب ضرور پیدا ہو۔ ان کے درمیان قبائلی عصبیت اور مسابقت کی وجہ سے فنِ خطابت کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

جاہلی دور کے عرب خطبا میں قس ابن ساعدہ ایادی، عمرو ابن کلثوم تغلبی اور اکثم ابن صیفی کافی معروف نام ہیں، جبکہ اسلامی دور کے بڑے خطبا میں خود پیغمبر اسلام جناب محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین حضرت ابو بکر، عمر فاروق، عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کے علاوہ سحبان ابن وائل، زیاد ابن ابیہ، معاویہ ابن ابی سفیان، حجاج ابن یوسف، طارق ابن زیاد، یزید ابن مہلب، واصل ابن عطا اور مصعب ابن زبیر قابل ذکر ہیں۔

مغرب میں مختلف سیاسی و سماجی انقلاب کے نتیجے میں علم وادب اور فنونِ لطیفہ کے ارتقا کے ساتھ ساتھ فنِ خطابت کو بھی فروغ ملا۔ اور ایک زمانے تک فرانسیسی اور انگریزی خطابت کا دور دورہ رہا، جاک بینین بوسویہ (Jacques-Bénigne Lignel Bossuet 1627ء-1704ء) فرانس کا سب سے بڑا خطیب مانا جاتا ہے۔ مغرب کے دیگر مشہور مقرروں میں ایڈمنڈ برک (1729-1797)، ابراہیم لنکن (Abraham Lincoln 1809--1865ء) اور ونسٹن چرچل (Winston Churchill 1874ء-1965ء) کا شمار انگریزی کے بڑے خطبا میں ہوتا ہے۔ دنیا کی وہ تمام اقوام جو اہل مغرب کی سیاسی و علمی بالادستی سے مرعوب تھیں انہوں نے ان کی خطابت کا لوہا مانا اور اس فن میں انہیں کی نقل اور پیروی کی، البتہ اردو خطابت پر عربی خطابت کے اثرات نمایاں ہیں، کیونکہ اردو خطابت کی ابتدا دینی وعظ اور ذاکرانہ مجلسوں سے ہوئی اور ذاکرین اور واعظین زیادہ تر عربی زبان وادب اور اسی کے اسلوبِ خطابت سے متاثر تھے۔

12.4.2 اردو خطابت پر ایک اجمالی نظر:

اردو خطابت کی ابتدا اور اس کے اسلوب کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے، کیونکہ اس کے اولین نمونے ہم تک نہیں پہنچ سکے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو میں انہیں مرتب اور تحریری شکل میں محفوظ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اور جو نمونے آج دستیاب ہیں وہ زیادہ تر صوفیا کے تذکروں اور ان کے ملفوظات کے مجموعوں کے توسط سے ہم تک پہنچے ہیں، اور وہ عام طور سے پند و نصائح اور مواعظ و حکم پر مشتمل ہیں۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو خطابت کی ابتدا وعظ و نصیحت اور دینی مجالسِ ذکر سے ہوئی اور ذاکرین اور واعظین ہی اردو کے اولین خطبا تھے، ظاہر ہے کہ ان کے خطبات کے موضوعات بھی دینی نوعیت کے حامل رہے ہوں گے۔

انیسویں صدی کا نصفِ ثانی اردو خطابت کے لیے اہم موڑ ثابت ہوا، جس میں 1857ء کی پہلی جنگ آزادی نے نہ صرف خطابت کے لب ولہجہ کو تبدیل کیا بلکہ اردو خطابت کو وعظ و ذکر کی مجلسوں سے نکال کر عوامی جدوجہد، سیاست کے ایوانوں اور جنگ کے میدانوں تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد سر سید احمد خان اور ان کی تحریک نے قلم اور زبان دونوں کا رخ موڑ دیا، چنانچہ 1886ء سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہونے والی مسلم ایجوکیشنل کانفرنسوں کے سالانہ جلسوں نے خطابت کے تیور بدل دیے۔ اور ان جلسوں میں سر سید کے علاوہ نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حالی جیسے زبان وادب کے ماہرین خطابت کے جوہر دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پھر انڈین نیشنل کانگریس اور اس کے بعد مسلم لیگ کے قیام سے اردو خطابت کا ایک نیا اور انقلابی دور شروع ہوا، اسی طرح مسلمانوں کے تعلیمی اداروں نے اردو خطابت کو جلا بخشی، چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد نے تحریری تقریروں میں نام پیدا کیا، شبلی نے تحریک ندوہ کی معرفت سے کئی عمدہ خطیب پیدا کیے۔

ہندوستان کی آزادی کی تحریکوں نے اردو خطابت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا، چنانچہ اس وقت ملکی سطح پر جتنی بھی سیاسی تحریکات سرگرم عمل تھیں ان کی لیڈر شپ کا اجتماعی مزاج اردو تھا۔ تقریباً سبھی تحریکوں کے پاس اردو زبان کا شعلہ بیان خطیب موجود تھا۔ اس طرح آزادی کی جدوجہد میں نہ صرف اردو صحافت بلکہ اردو خطابت نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، اور اردو خطبا نے اپنی شعلہ بیانیوں سے آزادی کی تحریکوں میں نئی روح پھونک دی اور ہندوستان کی آزادی عوامی حمایت کا معرکہ اردو خطابت کے بل بوتے پر ہی سر کیا۔ یہ وہ دور تھا

جس میں اردو خطابت اپنے ارتقا کی تاریخ کا زریں باب رقم کر رہی تھی، انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، تحریکِ خلافت، تحریکِ ترک موالات یا عدمِ تعاون اور اس جیسی دوسری تحریکوں نے خطابت کے ذریعے پورے برصغیر کے طول و عرض میں آزادی کا ایسا بگل بجادیا جو آزادئ ہند پر ہی جا کر بند ہوا۔

اس دور کے مشہور خطبا میں مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ بخاری، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، نواب بہادر یار جنگ، مولانا سعید احمد دہلوی، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور شورش کاشمیری سر فہرست ہیں۔

عصرِ حاضر میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی نے پوری دنیا کو ایک عالمی معاشرے میں تبدیل کر دیا ہے، اور آج کا انسان رنگ و نسل کے اختلاف، تہذیبی و سیاسی تصادم اور ملک و قوم کی سرحدوں اور حد بندیوں کے باوجود ذہنی اور فکری لحاظ سے ایک دوسرے سے قریب ہے۔ عالمی سطح پر مختلف سیاسی نظام کے ظہور اور فکری نظریات و رجحانات کی کثرت اور سامعین و مخاطبین کے تنوع کی وجہ سے خطابت کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا ہے اور خطباء کے لیے غور و فکر اور نقد و نظر کے نئے در وا ہو رہے ہیں اور آج کے خطیب کے سامنے دن بدن اظہار و بیان کے نت نئے موضوعات آرہے ہیں۔

12.5 مولانا آزاد اور قولِ فیصل کا تعارف

عزیز طلبا! آپ اس بلاک کی گذشتہ اکائیوں میں مولانا ابو الکلام آزاد کی شخصیت کے متعدد پہلوؤں سے روشناس ہو چکے ہیں۔ اس اکائی کا تعلق قولِ فیصل کے حوالے سے مولانا آزاد کی خطابت سے ہے اس لیے ہم تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے ذیل میں قولِ فیصل کا مختصر تعارف پیش کریں گے تاکہ قولِ فیصل کی روشنی میں مولانا آزاد کی شخصیت کی متعدد جہتیں آپ کے سامنے آسکیں۔

قولِ فیصل سے مراد مولانا ابو الکلام آزاد کا وہ بیان ہے جو انہوں نے انگریزی حکومت کے استغاثہ کے جواب میں تحریر کیا تھا، جس میں انہوں نے تحریکِ خلافت و سوراج کے قیام کے اسباب و عوامل اور اغراض و مقاصد اور ملک کے قومی و مذہبی مسائل اور سیاسی صورت حال پر روشنی ڈالی ہے، ان موضوعات پر مولانا کا یہ بیان ایک مستند تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

قولِ فیصل کا جو نسخہ راقم کے پیشِ نظر ہے اس نسخے میں مولانا آزاد کے اس بیان کے علاوہ مولانا کا وہ پیغام بھی درج ہے جو انہوں نے گرفتاری سے دو دن پہلے قلم بند کر کے اپنے کاغذات میں رکھ دیا تھا، اور جو ان کی گرفتاری کے بعد شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد کی گرفتاری کی مختصر سرگزشت گرفتاری کی تاریخ اور تمام پیشیوں کی روئداد بھی درج ہے اور اس کے بعد مولانا کا مذکورہ بالا بیان ہے اور آخر میں بطورِ ضمیمہ مولانا کا وہ مضمون بھی شامل ہے جو انہوں نے کلکتہ پہنچ کر "پیغام" میں شائع کیا تھا اور جس میں انگریزی حکومت کے تازہ جبر و تشدد کے جواب میں عوام سے ایک نئی مدافعانہ حرکت کی اپیل کی تھی۔

مولانا آزاد کا یہ بیان 51 صفحات پر محیط ہے۔ قولِ فیصل میں مولانا آزاد کی حق گوئی، صداقت بیانی اور اپنے موقف مضبوطی سے ڈٹے رہنے کا عزم ابھر کر سامنے آتا ہے، اور ان کی شخصیت کا یہ پہلو ان کی عوامی زندگی کے ہر حصے میں نمایاں رہا ہے۔ قول اور فعل میں

مطابقت اور بے باک صداقت پسندی کے کیا معنی ہیں؟ مولانا آزاد نے سب سے پہلے اپنے بیان میں اسی سوال کی طرف توجہ کی ہے، اور نہایت بے باکی سے صاف صاف تسلیم کیا ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں قانون اور حکومت کی نظر میں وہ مجرم ہیں۔ اس سے بڑھ کر جب انہوں نے استغاثہ کے مواد کو کمزور پایا تو خود کو بچانے کے بجائے بے مثال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے استغاثہ کا بارِ ثبوت اپنے ذمہ لے لیا اور تفصیل کے ساتھ وہ تمام باتیں اپنے اس بیان میں لکھ دی ہیں جن کا ثبوت استغاثہ کے لیے بہت دشوار تھا۔ چنانچہ وہ بیان کے شروع میں یہ کہتے ہیں کہ ان کا ارادہ بیان دینے کا نہ تھا کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ان کے خلاف حکومت کو جو کچھ کرنا ہے وہ سب کے ثبوت پیش کر دے گی۔ لیکن جب کارروائی شروع ہوئی اور اُنہوں نے یہ دیکھا کہ صرف دو تقریروں کو بنیاد بنا کر استغاثہ دائر کیا گیا ہے، اور وہ بھی ان کی بہت سی ایسی باتوں سے خالی ہیں، جو وہ اکثر اپنی تقریروں میں کہتے رہے ہیں۔ تو اُنہوں نے سوچا کہ حکومت ان کے خلاف تمام ضروری مواد مہیا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی اس لیے ان کا فرض ہے کہ عدالت کو اصلیت سے آگاہ کریں۔

وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ قانونِ عدالت کی رو سے یہ ان کے فرائض میں داخل نہیں ہے، "لیکن حقیقت کا قانون عدالتی قواعد کی حیلہ جوئیوں کا پابند نہیں ہے۔ یقیناً یہ سچائی کے خلاف ہو گا کہ ایک بات صرف اس لیے پوشیدہ رہنے دی جائے کہ مخالف اپنی عاجزی کی وجہ سے ثابت نہ کر سکا۔"

اس کے بعد وہ نتائج کی پرواہ کیے بغیر بڑی جرأت مندی کے ساتھ اپنے جرم کا اقرار کرتے ہیں۔ اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ انہوں نے اقرارِ جرم کیوں کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی قوم اپنے ملک کی آزادی کا مطالبہ کرتی ہے تو اس کا مقابلہ اس طاقت سے ہوتا ہے جو عرصہ دراز سے اس ملک پر قابض و متصرف ہے۔ اور کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ اس کے قبضہ میں آئی ہوئی چیز واپس چلی جائے۔ لہٰذا فطری طور پر یہ مطالبہ قابض طاقت پر گراں گزرتا ہے اور وہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ اس کی یہ کوشش اور جدوجہد خواہ کتنی ہی خلافِ انصاف کیوں نہ ہو، مگر مولانا اسے قابلِ ملامت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ اسے وہ تنازع للبقا (Struggle for Existance) کی جنگ سمجھتے ہیں، اور ہر وجود اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔

وہ مانتے ہیں کہ ہندوستان میں بھی یہ جدوجہد اور مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں کہ حکومت ان لوگوں کو مجرم سمجھے اور ان کے خلاف ایکشن لے جو اس سے آزادی کا مطالبہ اور اس کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، وہ حکومت کے طرزِ عمل کو اس کی بقا کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک یہ بات بالکل بھی خلافِ توقع نہیں کہ جس کا وہ شکوہ کریں، وہ اپنے جرم کا اقرار بڑی بے باکی سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

> "میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرت اس کا مجرم ہوں، بلکہ ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے اور اس کی آبیاری کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے 1912ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے ان کا رخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے

پر پیچ فریب نے مبتلا کر رکھا تھا۔"

ان کے نزدیک گورنمنٹ نہ کوئی فرشتہ ہے اور نہ مسیحا لہذا وہ تو وہی کرے گی جو ہمیشہ استبداد نے آزادی کے مقابلے کیا ہے، ان کے نزدیک یہ ایک ایسا قدرتی معاملہ ہے جس میں دونوں فریقوں میں سے کسی کے لیے شکوہ و شکایت کی گنجائش نہیں۔ لہذا دونوں کو اپنا اپنا کام کیے جانا چاہیے۔ مولانا آزاد کی یہ سوچ عام روش سے کس قدر مختلف ہے، وہ بڑی فراخ دلی سے اپنے مخالف کو بھی اپنی بقا کی خاطر جد وجہد کا پورا اختیار دیتے ہیں اور اس کے لیے اسے قابلِ ملامت بھی نہیں سمجھتے اور قانونِ قدرت کا حصہ سمجھ کر اسے اپنی جد وجہد کا دوسرا پہلو مانتے ہیں اور کھل کر پوری بہادری سے اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

مولانا آزاد کا یہ بیان "نان کو آپریشن" عدمِ تعاون کا عملی نمونہ ہے۔ ترکِ موالات اور عدالت کے بائیکاٹ سے مقصود یہ تھا کہ عدالت میں کسی طرح کا دفاع نہ کیا جائے۔ کیونکہ نان کو آپریشن عدالت کے انصاف اور جواز ہی سے منکر ہے۔ چناں چہ اُنہوں نے اپنے دفاع میں کچھ کہنے کے بجائے جرم کا صاف صاف اقرار کیا اور انصاف کی اپیل کرنے کے بجائے خود ہی عدالت کے سامنے اپنے تمام جرائم کی فہرست رکھ دی۔ اور کسی طرح کی کوئی قانونی بحث نہیں کی۔ اور اسی ضمن میں وہ ظالم و جابر حکومتوں اور ان کی عدلیہ کے بارے میں اپنا یہ مشہور تاریخی جملہ کہتے ہیں:

> "تاریخِ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں۔"

اس بیان سے ان کے مزاج کا تحمل اور ان کی متانت کا پہلو بھی سامنے آتا ہے، ان کے بیان کی ہر سطر سے سنجیدگی اور کامل ضبط جھلکتا ہے اور بیان کے کسی بھی حصے میں جذبات کے جوش کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ اُنہوں نے جوش انگیز سیاسی معاملات پر اس طرح بحث کی ہے، گویا ایک شخص نہایت سنجیدگی کے ساتھ محض واقعات و حقائق کو پیش کر رہا ہے۔ گویا وہ گرفتاری کے بعد غصے اور انتقامی جذبات سے بالکل خالی ہو گئے تھے۔

سب سے زیادہ اثر انگیز حصہ بیان کا خاتمہ ہے جس میں انہوں نے ان تمام لوگوں کا ذکر کیا ہے، جو ان کے خلاف مقدمہ میں کام کر رہے تھے۔ اپنے مخالف گواہوں، سرکاری وکیل اور مجسٹریٹ کے بارے میں پوری کشادہ قلبی اور خوش دلی کے ساتھ کہا ہے کہ انہیں ان لوگوں سے کوئی شکایت یا رنج نہیں ہے۔ اور اگر ان لوگوں سے کوئی قصور اس بارے میں ہوا ہے تو وہ انہیں سچے دل سے معاف کرتے ہیں۔ مجسٹریٹ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ تو اپنا فرض انجام دے رہا ہے اور حکومت کی مشینری کا ایک پرزہ ہے۔ اور جب تک مشینری نہیں بدلے گی، اس کے پرزے بھی اپنا فعل نہیں بدل سکتے۔ لہذا اس سے بھی انہیں کوئی شکایت نہیں ہے! اور وہ ان کے لیے دعاء خیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور آخر میں نہایت بے باکی سے اٹلی کے "قتیلِ صداقت گارڈینیر برونو" کے الفاظ میں کہتے ہیں:

> "زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جاسکتی ہے، بلا تامل دے دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمہارے دل میں پیدا ہو گی، اس کا عشرِ عشیر اضطراب بھی سزا سن کر

میرے دل کو نہ ہو گا۔"

مولانا آزاد کا یہ بیان اپنی تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ ادبی نقطۂ نظر سے بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے، جو مولانا آزاد کے خطیبانہ اسلوب اور طریقۂ اظہار اور اس کی بے پناہ تاثیر کی غمازی کرتا ہے۔

گاندھی جی نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" کے 23 فروری 1922ء کے شمارے میں مولانا ابو الکلام آزاد کے اس بیان کو ایک عظیم الشان بیان قرار دیا تھا، اور "A Great Statement" (ایک عظیم الشان بیان) کے عنوان سے انہوں مولانا آزاد کے اس بیان پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے:

> "مولانا ابو الکلام آزاد نے جو بیان عدالت میں دیا ہے، اس کی نقل ابھی میرے پاس پہنچی ہے۔ یہ فل سکیپ سائز کے 33 صفحوں پر ٹائپ کیا ہوا ہے، لیکن اس قدر طول طویل ہونے پر بھی سب کا سب پڑھنے کے قابل ہے۔ اصل بیان مولانا کی فصیح و بلیغ اردو میں ہو گا۔ یہ اُس کا انگریزی ترجمہ ہے۔ ترجمہ برا نہیں ہے لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اس سے بہتر ممکن تھا۔"

12.6 مولانا آزاد بحیثیتِ خطیب

عزیز طلبا! اب تک آپ یہ اچھی طرح جان چکے ہیں کہ مولانا آزاد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، وہ ایک وسیع النظر مفکر و دانشور، صاحبِ طرز انشا پرداز، ذمہ دار اور کامیاب صحافی، متحرک و فعال لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے باک اور شعلہ بیان خطیب بھی تھے، جو اپنے زورِ خطابت اور اندازِ بیان سے مجمع پر چھا جاتے تھے، اور اپنے طرزِ گفتار اور خطابت کے سحر میں سامعین کے دل و دماغ کو مسخر کر لیا کرتے تھے، بارہا اپنے زورِ بیان سے انہوں نے عوامی مجمعوں کو تحریک میں بدل دیا، اور کئی بار ایسا ہوا کہ جو لوگ خطاب سننے آئے تھے وہ ان کی خطابت کے زیرِ اثر انگریز حکومت کے خلاف سراپا احتجاج بن کر جیل چلے گئے۔

خطابت کا ملکہ مولانا آزاد کو ورثے میں ملا تھا، ان کا تعلق ایک ایسے علمی خانوادے سے تھا جو ایک زمانے سے عوام کی رہنمائی کا فریضہ سر انجام دے رہا تھا، ان کے والد گرامی مولانا خیر الدین ایک زبردست عالم اور ممتاز خطیب اور واعظ تھے، مولانا آزاد کے تذکرہ نگاروں نے ان کی خطابت اور اس کے اثرات کا حال لکھا ہے، ملیح آبادی کے مطابق ان کا وعظ نہایت منظم اور مرتب ہوتا، وعظ کے حصوں کی تقسیم، مطالب کے ربط، معانی کی ترتیب، استنباط و استدلال، اجمال سے تفصیل اور تفصیل سے پھر اجمال پر اختتام، ان امور کا وہ اس قدر اہتمام کرتے تھے کہ اسے ایک جداگانہ فن بنا دیا تھا، ان کا اسلوب بڑا نرالا تھا مختصر اور جامع الفاظ کا چناؤ اور سامعین کے حسبِ حال بیان سادہ لیکن اس قدر مؤثر ہوتا کہ سامعین پر رقت طاری ہو جاتی۔

مولانا ابو الکلام آزاد اپنے والد کے خطبات اور ان کے اثرات کا تذکرہ کیا کرتے تھے اور مولانا خود بھی ان کے خطاب سے متاثر تھے اور انہیں دیکھ کر ہی ان کے اندر خطابت کا شوق پیدا ہوا تھا چنانچہ وہ بچپن میں صرف آٹھ سال کی عمر میں خطابت کی مشق کیا کرتے تھے

اور جو کوئی مل جاتا اس کے سامنے لمبی لمبی تقریریں شروع کر دیتے اور جب کوئی نہ ملتا تو والد کی پگڑی سر پر باندھ کر ایک باکس پر کھڑے ہو جاتے اور بہنوں کے سامنے ہی تقریر کرنے لگتے تھے اور ان سے نعرے لگانے کے لیے کہتے تھے۔

ان کے گھر میں مریدوں اور معتقدوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا خاص طور سے مغرب کے بعد پچاس سے ساٹھ آدمی دیوان خانے میں موجود ہوتے اور مولانا آزاد کو جب بھی موقع ملتا ان کے سامنے دو دو گھنٹوں تک تقریریں کرتے اور اس میں انہیں بڑا لطف آتا تھا، دس گیارہ برس کی عمر میں ہی مولانا آزاد کی ذکاوت و فطانت اور خطابت کے چرچے ہونے لگے تھے، اور مسلسل مشق سے مولانا نے اپنے اس شوق کی آبیاری کی اور جوانی کی عمر کو پہنچنے تک ملک کے صفِ اول کے خطبا میں اپنا ایک منفرد اور نمایاں مقام بنالیا۔

12.6.1 مولانا آزاد کی خطابت کے موضوعات اور اسلوبِ خطابت کی خصوصیات:

مولانا آزاد میدانِ خطابت کے شہسوار تھے اور اس فن کے بڑے رمز شناس تھے، وہ سامعین کی ذہنیت وخیالات اور مجمع کے رنگ ومزاج کو بھانپ جایا کرتے تھے، موقع کی نزاکت اور وقت کے رجحانات کو بڑی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اور ان سب کو پیشِ نظر رکھ کر ایسا اسلوبِ بیان اختیار کرتے جس میں خطابت کی ساری خوبیاں موجود ہوتیں۔ ان کے اندر ایک کامیاب خطیب کے سارے ضروری اوصاف جمع تھے، طلاقتِ لسان، قوتِ بیان اور حافظے کی قوت تو موروثی تھی اور مشق ومطالعہ کی کثرت نے ان کی خطابت کو چار چاند لگا دیا تھا۔ مجمع کے حساب سے اندازِ بیان جوشیلا لیکن سنجیدہ ہوتا، زبان صاف اور رواں، استدلال علمی و منطقی ہوتا۔

مولانا آزاد کے خطبات کے مجموعوں اور ان کی تقریروں کے موضوعات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ انہوں نے دین، معاشرہ، تعلیم، ادب اور سیاست کے سلگتے ہوئے موضوعات کو اپنے خطبات کا موضوع بنایا ہے اور ان خطبات کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے جس موضوع کو بھی اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔

یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ ہر موضوع ایک الگ اسلوب اور ہر مجمع ایک الگ لب ولہجہ اور منفرد طرزِ خطاب کا متقاضی ہوتا ہے اور ہر ایک کو یکساں طور پر برتنا اور اس سے اچھی طرح عہدہ برآ ہونا سب کے بس کی بات نہیں، لیکن مولانا آزاد مختلف کے قسم کے سامعین اور متعدد موضوعات کو کامیابی کے ساتھ یکساں طور پر برتتے اور بہت اچھی طرح نبھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مولانا آزاد کی خطابت کے موضوعات کے تنوع سے ان کے افکار کی گہرائی، علمی تبحر اور وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

مشہور خطیب شورش کاشمیری اپنی کتاب "فنِ خطابت" میں مولانا آزاد کی خطابت کے موضوعات کے تنوع اور ان موضوعات پر ان کی گرفت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "مولانا آزاد اردو خطابت کے لیے قدرت کا عطیہ تھے۔ ان کے لیے ہر موضوع ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی تھا۔ مذہب پر بولتے تو عبقریٔ عصر تھے۔ ادب پر خطاب کرتے تو ہر ادیب وشاعر کا شعلۂ گفتار کچلا جاتا۔ اور سیاست میں خطابت کے تمام اوصاف ان کے چوبدار تھے، ان سے بڑا اردو

زبان خطیب پیدا نہ کر سکی۔ وہ خطابت کے افق پر صبحِ خنداں کا اجالا تھے اور الفاظ و مطالب ان کے خانہ زاد تھے، ان کا معاملہ خطابت کی رعایت سے انہیں کے الفاظ میں یہ تھا کہ:

دعا دے مجھے اے زمینِ سخن کہ میں نے تجھے آسماں کر دیا"

مولانا آزاد اپنے خطبات میں ایک عظیم داعی اور بلند پایہ مفکر نظر آتے ہیں، انہیں اپنے موقف کی صداقت پر پورا یقین ہوتا ہے، ان کے الفاظ کا انتخاب بہت موزوں، انداز برجستہ اور لہجہ بہت متاثر کن ہوتا ہے۔ اپنی بات کو سامعین کے ذہن میں اتارنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں، وہ اپنی بات کو سامع کے دل و دماغ میں بٹھانے کے لیے کبھی کبھی ایک ہی بات کو مختلف پیرایۂ بیان سے بار بار دہراتے ہیں تاکہ سامع کو وہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں وہ کسی قسم کی جھجک یا ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے۔ ان کی تقریریں ایجاز واختصار کا مرقع ہیں، محاوروں اور برمحل اشعار کا برجستہ استعمال ان کے خطاب کے حسن میں اضافہ اور اثر کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ تمثیلات کے انوکھے پن، تشبیہات واستعارات کے اچھوتے پن، افکار وخیالات کی پختگی اور جملوں اور بندشوں کی چستی سے ایسی فضا تیار کر دیتے ہیں کہ مجمع دم بخود ہو کر ان کے خطاب کی روانی میں بہتا چلا جاتا ہے۔

مولانا آزاد کی تقریروں کے ایک مجموعے "خطباتِ آزاد" کے مرتب شورش کاشمیری اس کے مقدمے میں ان کے اسلوبِ خطابت اور اس کی سحر آفرینی کو اجاگر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "مولانا آزاد اسالیبِ بیان اور مطالب کی یکجہتی سے ایسا قالب تیار کرتے ہیں کہ ہر فقرے میں سمندروں کا سکون، پہاڑوں کی سنجیدگی، آبشاروں کا ترنم اور رنگ وبو کی غیر مرئی لہریں نظر آتی ہیں۔۔۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اسالیبِ بیان میں یہی تاثیر ہے کہ وہ الفاظ میں ایک مسیحا نفس کی طرح زندگی پیدا کر دیتے ہیں اور معانی کے دامن سے ایسی نزہتیں پھیلتی ہیں کہ غیر شعوری طور پر نگاہوں سے گوناگوں مناظر گزرتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوختہ عندلیب روٹھی ہوئی بہار کو منا رہی ہے اور کبھی اس تصور پر نگاہ ٹھہرتی ہے کہ آسمان کی نیلاہٹوں کے عقب میں آنے والے دور کا مورخ عصرِ حاضر کے خطوط سنوار رہا ہے۔"

12.6.2 آزاد کی خطابت کے بارے میں دانشوروں کے تاثرات:

مولانا آزاد کی تقریریں سننے والوں نے ان کی خطابت کو اردو زبان کی معراج اور بیان کا معجزہ قرار دیا ہے، وہ اپنے طرزِ استدلال، اپنے حافظے اور زبان دانی سے خطابت کے جوہر دکھاتے تھے، اپنے اندازِ بیان، الفاظ کی معنویت اور گہرائی وگیرائی اور جادو بیانی سے سامعین کو جکڑ لیتے تھے، ان کے الفاظ سماعت اور دل و دماغ پر جادو کی طرح اثر کرتے تھے۔ بقولِ رشید احمد صدیقی ان کے الفاظ الوہیت اور نبوت کا جامہ پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہیں سننے والے محسوس کرتے تھے کہ خطاب کی شکل میں گویا ان کی وہ گمشدہ متاعِ حیات مل رہی ہے جس کے وہ ایک مدت سے متلاشی تھے، لہذا کسی بھی قیمت پر وہ ان جواہر پاروں سے محروم ہونا نہیں چاہتے۔

مولانا آزاد نے ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی اور مولانا حالی جیسے زبان وادب کے نبض شناسوں سے کم سنی میں ہی اپنی خطیبانہ صلاحیتوں پر خراجِ تحسین حاصل کیا تھا، شبلی ان کے دماغ کو قدرت کا معجزہ کہتے تھے۔

مولانا آزاد کے تقریبا تمام تذکرہ نگاروں نے ان کی خطابت کے بارے کلماتِ تحسین لکھے ہیں، سننے والوں کے ذہن میں ان کی تقریریں بڑی مدت تک بسی رہتی تھیں چنانچہ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی اپنے ایک خط میں ندوہ میں کی گئی مولانا کی ایک تقریر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جلسۂ ندوہ میں آپ کی تقریر کا عالم یادِ شوق میں اب تک تازہ ہے آپ کے کھڑے ہونے کا انداز،
تقریر کا جوش، آواز کا لہجہ گویا دیکھ رہا ہوں سن رہا ہوں حالانکہ تیس برس گذر گئے۔"

مولوی نصر اللہ خاں عزیز نے خطباتِ آزاد کے مقدمے میں بیان کیا ہے کہ انہوں نے مولانا آزاد کی جتنی تقریریں سنی ہیں ہر ایک کا تاثر آج تک قائم ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ تازہ مضامین کا ایک سیلاب ہے جو اسٹیج کے ایک غیر معلوم چشمے سے ابل رہا ہے اور پورے مجمع پر ابرِ بہاری کی طرح چھایا ہوا ہے، سننے والے دم بخود دل ہی دل میں وجد کر رہے ہیں۔ فرمودات کی حساسیت، استدلال کی پختگی، زبان کی لطافت، الفاظ کی شوکت اور اندازِ بیان کی پاکیزگی ، دل ودماغ، عقل اور جذبات کی صفوں کو یکساں مسخر کرتی جارہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں عشاء کے وقت مولانا تقریر کر رہے تھے۔ اور انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا ان کی تقریر ایک نور کی چادر کی طرح تمام مجمع پر چھائی ہوئی ہے کہ یکا یک قریب کی ایک مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ خطیب تھوڑی دیر کے لئے رک گیا۔ تو انہوں نے اس طرح محسوس کیا گویا کسی نے چادر کو چاک کر کے مجمع کے سروں پر سے کھینچ لیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ہندوستان کے تمام مشہور ومعروف مقرروں کی تقریریں انہوں نے سنی ہیں۔ مگر یہ عجیب وغریب کیفیت کبھی کسی اور کے خطاب کے وقت محسوس نہیں کی۔

سید عطاء اللہ بخاری جو خود اپنی جادو بیانی اور سحر انگیز خطابات کے لیے بہت مشہور تھے وہ مولانا آزاد کی خطابت کے اسیر نظر آتے ہیں چنانچہ شورش نے "خطباتِ آزاد" کے مقدمے میں مولانا آزاد کی تقریروں کے بارے میں ان کا مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے:

"ابوالکلام آزاد پہلا صاحبِ طرز ادیب اور خطیب ہے جس نے خطابت میں طرحِ نو کی بنیاد رکھی
اور قصر ودربار کی گود میں کھیلی ہوئی زبان کے نسوانی لوچ کو ختم کیا۔"

ان کا اشارہ اس طرف ہے کہ اردو زبان جو عام طور سے اپنی لطافت ونزاکت اور شعر وشاعری اور غزل کے لیے جانی جاتی تھی مولانا آزاد نے اس میں ایک انقلابی روح پیدا کی اور اپنے زورِ بیان سے ثابت کیا کہ ادب کا مقصد صرف تفسیرِ حیات نہیں بلکہ تعمیرِ حیات اور تسخیرِ کائنات بھی ہے۔

مشہور دانشور اور مولانا آزاد کی کئی کتابوں کے مرتب ومحقق مالک رام کے مطابق مولانا آزاد کی بیشتر تقریروں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک لمبا عرصہ گزر جانے کے باوجود اور اپنی تحریری شکل میں بھی اتنی ہی مؤثر اور کامیاب ہیں جتنی وہ اس وقت تھیں جب وہ اپنے سامنے بیٹھے سامعین کو خطاب کر رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں کیونکہ عام طور سے تقریریں تحریری شکل میں

آنے کے بعد اپنا اثر کھو دیتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریر صرف افکار وخیالات اور الفاظ ومضامین کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی اثر انگیزی میں خطیب کی شخصیت، لب ولہجے کے اتار چڑھاؤ، آواز کے زیر وبم اور جسمانی حرکات وسکنات کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔

12.7 مولانا آزاد کی خطابت قولِ فیصل کے حوالے سے

قولِ فیصل میں مولانا آزاد کا بیان ایک بے نظیر ادبی نمونہ اور بے مثال خطیبانہ شاہکار ہے جس کا طرزِ بیان نہایت مؤثر اور دلکش ہے، جس میں اسلام کے تصورِ آزادی کی فاضلانہ ترجمانی اور ملک وقوم کے تئیں فرد اور سماج کی ذمہ داریوں اور فرائض پر بڑا پر مغز خطاب ہے، جو مولانا کے جذبۂ حریت، ان کی وسیع النظری، کشادہ قلبی، صداقت وحق بیانی اور ان کی قائدانہ طبیعت اور مفکرانہ عظمت اور بے مثال خطیبانہ صلاحیت کا زندہ وجاوید نمونہ ہے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خطابت کے بارے میں صحیح اور درست رائے اسے سن کر ہی قائم کی جاسکتی اس لیے کہ خطابت کا تعلق بولنے اور سننے سے ہے، اور جس چیز کا تعلق سماعت سے ہو اسے سن کر ہی صحیح تاثر اور درست رائے قائم کی جاسکتی ہے، کسی لکھے ہوئے خطبے کا تجزیہ اور تحلیل قاری کے ذہن میں اس خطبے کا ویسا تاثر اور تصور پیدا کرنے سے قاصر ہے، جو سامعین نے اسے سن کر محسوس کیا ہوگا، خطابت کو اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ قلم بند نہیں کیا جاسکتا، قلم کی دسترس میں صرف خطاب کا مضمون اور الفاظ ہی آسکتے ہیں، خطیب کا اندازِ بیان، اس کے لب ولہجے کے اتار چڑھاؤ، اس کی آواز کے زیر وبم، دورانِ خطاب اس کے جسمانی حرکات وسکنات اور اس کی شخصیت کے فسوں کو تحریری شکل دینے سے قلم عاجز ہے اور نہ ہی تاثیر وتاثر کی حقیقی کیفیتیں حوالۂ قلم ہوسکتی ہیں، خود مولانا آزاد نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ استغاثہ کے پاس ان کی تقریروں کے جو ٹکڑے ہیں وہ اس سے خالی ہیں جو انہوں نے کہا تھا اور اسی لیے انہوں نے تحریری بیان دینے کا فیصلہ کیا۔ تاہم تحلیل وتجزیے سے اس خطاب کی معنویت اور تاثیر کا ایک اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے۔

چونکہ اس اکائی کا تعلق قولِ فیصل کے حوالے سے مولانا آزاد کی خطابت سے ہے اس لیے ہماری کوشش ہوگی کہ ہم ان کے بیان کے صرف اس حصے سے مثالیں پیش کریں جو ان کی تقریروں کے اقتباسات پر مشتمل ہے، حالانکہ پورا بیان ہی خطیبانہ رنگ وآہنگ لیے ہوئے ہے اور ان کی شخصیت کے قائدانہ پہلو کی غمازی کرتا ہے۔ چند صفحات میں پچاس سے زیادہ صفحات پر محیط بیان کا جائزہ لینا تو مشکل ہے لیکن ہم کوشش کریں گے کہ اس علمی وادبی شاہکار کی کچھ جھلکیاں سامنے آسکیں۔

قولِ فیصل میں مولانا آزاد کے بیان کی ادبی خوبیوں میں سے ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر مطالب ومعانی کا ایک سمندر سمیٹے ہوئے ہے، اور سلاست وروانی کے ساتھ ساتھ بڑا پر جوش اور دلیرانہ بھی ہے، اس کا لہجہ دوٹوک اور غیر مصالحانہ، اندازِ بیان ٹھوس اور غیر متزلزل اور اسلوب سنجیدہ اور متین ہے، شروع سے لے کر آخر تک پورے بیان پر خطیبانہ اسلوب غالب ہے، ایسا لگتا ہے کہ مولانا خلافت اور نیشنلزم اور اسلامی حریت پر ایک پر مغز خطبہ دے رہے ہیں۔ ہم آئندہ صفحات میں اس بیان کے اقتباسات کی روشنی میں ان کے خطیبانہ اسلوب کی جھلکیاں ملاحظہ کریں گے۔

مولانا آزاد کی جن دو تقریروں کی بناپر ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا تھا، ان میں مولانا آزاد نے لوگوں کو نان کوآپریشن کی دعوت دی ہے اور تحریکِ خلافت اور سوراج کے مطالبات کو دہرایا ہے، پنجاب میں حکومت کے مظالم کو وحشیانہ قرار دیا ہے اور لوگوں کو یہ بتایا ہے کہ جو حکومت جلیانوالہ باغ امرتسر میں چند منٹوں کے اندر سینکڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دے اور اپنے اس عمل کو جائز قرار دے اس سے ناانصافی کی کوئی بھی بات بعید نہیں اور اس سے انصاف کی توقع دیوانے کا خواب ہے۔ اور لوگوں کو انگریز حکومت کے خلاف عملی جدوجہد پر اکساتے ہوئے کہتے ہیں:

"ایسی گورنمنٹ ظالم ہے، جو گورنمنٹ ناانصافی کے ساتھ قائم ہو۔ ایسی گورنمنٹ کو یا تو انصاف کے آگے جھکنا چاہیے یا دنیا سے مٹا دینا چاہیے۔

اگر فی الحقیقت تمہارے دلوں میں اپنے گرفتار بھائیوں کا درد ہے، تو تم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ آج سوچ لے۔ کیا وہ اس بات کے لیے راضی ہے کہ جس جابرانہ قوت نے انہیں گرفتار کیا ہے، وہ اس براعظم میں اسی طرح قائم رہے جس طرح ان کی گرفتاری کے وقت تھی۔"

وہ اپنے اس خطاب میں ایک مخلص داعی اور امن کے پیامبر نظر آتے ہیں چنانچہ وہ لوگوں کو آزادی کی جدجہد پر آمادہ کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ ان سے یہ مطالبہ بھی کرتے ہیں کہ ان کی جدوجہد پر امن ہو وہ کہتے ہیں کہ:

"اگر تم ملک کو آزاد کرانا چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے کہ جن چالاک دشمنوں کے پاس خون ریزی کا بے شمار سامان موجود ہے، انہیں رائی کے برابر بھی اس کے استعمال کا موقع نہ دو اور کامل امن و برداشت کے ساتھ کرو۔۔۔ تمہارے پاس وہ شیطانی ہتھیار نہیں ہیں، جن سے یہ گورنمنٹ مسلح ہے۔ تمہارے پاس صرف ایمان ہے، دل ہے، قربانی کی طاقت ہے۔ تم انہی ہتھیاروں سے کام لو۔ اگر تم چاہو کہ اسلحہ کے ذریعہ فتح کرو، تو تم نہیں کرسکتے۔ آج امن وسکون سے بڑھ کر تمہارے کوئی چیز نہیں۔"

ان تحریکوں اور مظاہروں کو کچلنے کے لیے انگریز حکومت نے جبر و تشدد کا سہارا لیا تو مولانا آزاد نے کہا کہ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آزادی کا راستہ جبر و تشدد اور قید و بند کی مشقتوں سے ہو کر گزرتا ہے، ان کے الفاظ میں:

"آزادی کا بیج کبھی بار آور نہیں ہو سکتا جب تک جبر و تشدد کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو۔"

اور وہ لوگوں کو حکومت کے ظلم واستبداد کا ڈٹ کر سامنا کرنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"مبلغینِ خلافت کی گرفتاریوں پر کیوں مغموم ہو؟ اگر تم فی الحقیقت انصاف اور آزادی کے طلبگار ہو، تو جیل جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ علی پور کا جیل اس طرح بھر جائے کہ اس کی کوٹھڑیوں میں چوروں کے لیے جگہ باقی نہ رہے۔"

اس بیان میں وہ ہمیں اسلام کے نظام جمہوریت، نظریۂ عدل و مساوات، آزادی کے تصور، مسلمانوں کی قومی ذمہ داری، شہادت اور کتمانِ شہادت، امر بالمعروف والنھی عن المنکر، اور اسلام کے تصورِ وحدانیت پر نہایت بصیرت افروز خطاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، وہ آزادی کی اہمیت اور مسلمانوں کو اس کے لیے جدوجہد کرنے کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے۔ یا آزاد رہنا چاہیے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں ہے۔"

اس بیان میں ہمیں ان کے منطقی استدلال اور علمی طریقۂ استنباط کے نمونے جابجا ملتے ہیں۔ چنانچہ وہ کبھی اپنے موقف کی تائید میں قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ کا سہارا لیتے نظر آتے ہیں تو کبھی تاریخ اسلام کے واقعات سے استشہاد کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اسلام کے تصورِ مساوات، آزادی اور جمہویت کو اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

" میں مسلمان ہوں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض یہی ہے۔ اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو، یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیورو کریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا ایک مکمل نظام ہے، جو نوعِ انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خود غرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے۔ لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں، بلکہ خود حق ہے۔ اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگانِ خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالادستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹا دیئے، اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجہ میں برابر ہیں اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قومیت، رنگ، معیارِ فضیلت نہیں ہے، بلکہ صرف عمل ہے۔ اور سب سے بڑا وہی ہے، جس کے کام سب اچھے ہوں: **يَا أَيُّهَا النَّاسُ اِنا خَلَقْنكُمْ مَنْ ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَكُمْ شُعُوباً وقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا – إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ**".(سورہ حجرات- آیت ۱۳)

وہ عدالت گاہوں کو ناانصافی کا قدیم ترین ذریعہ قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں:

" تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمران طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھائے ہیں، تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے اور وہ انصاف اور نا انصافی، دونوں کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے۔ منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں وہ عدل اور حق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں۔

تاریخِ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی

ہیں۔ دنیا کے مقدس بانیانِ مذہب سے لے کر سائنس کے محققین اور مکتشفین تک، کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔ بلاشبہ زمانے کے انقلاب سے عہدِ قدیم کی بہت سی برائیاں مٹ گئیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک رومی عدالتیں اور ازمنہ متوسط (مڈل ایجز) کی پر اسرار "انکویزیشن" وجود نہیں رکھتیں، لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے، ان سے بھی ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہے۔ وہ عمارتیں ضرور گرادی گئیں جن کے اندر خوفناک اسرار بند تھے، لیکن ان دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خود غرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں؟"

اسی طرح اس بیان کے بہت سے جملے اپنی لفظی و معنوی خوبصورتی اور صداقت کی وجہ سے براہِ راست قاری کے دل میں اتر جاتے ہیں، اس طرح کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

- "آزادئ تقریر اور آزادئ اجتماع انسان کے پیدائشی حقوق ہیں۔ ان کی پامالی مشہور فلاسفر "مل" کی زبان میں "انسانیت کے قتلِ عام سے کچھ ہی کم" کہی جاسکتی ہے۔"
- "طاقت ور آدمی کو شکست کے بعد زیادہ غصہ آتا ہے، لیکن کوئی شکست اس لیے فتح نہیں بن سکتی کہ ہم بہت زیادہ جھنجھلا سکتے ہیں۔"
- "یہ سچ ہے کہ نان کوآپریٹر کسی طرح کا ڈیفنس نہیں کرتے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے تمام کپڑے اتار ڈالے۔ اس لیے کہ شریف آنکھیں بند کرلیں گے۔ شریف آدمیوں نے تو سچ مچ آنکھیں بند کرلی ہیں، لیکن دنیا کی آنکھیں بند نہیں ہیں۔"
- "یقیناً میں نے کہا ہے "موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے" لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کہ کیوں مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصل نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔"
- "جو چیز بری ہے، اسے یا تو درست ہو جانا چاہیے، یا مٹ جانا چاہیے۔ تیسری بات کیا ہو سکتی ہے؟ جب کہ میں اس گورنمنٹ کی برائیوں پر یقین رکھتا ہوں، تو یقیناً یہ دعا نہیں مانگ سکتا کہ درست بھی نہ ہو اور اس کی عمر بھی دراز ہو۔"
- "ریفارم" کی نسبت میں روس کے عظیم الشان لیو ٹالسٹائی کے لفظوں میں کہوں گا "اگر قیدیوں کو اپنے ووٹ سے اپنا جیلر منتخب کرلینے کا اختیار مل جائے، تو اس سے وہ آزاد نہیں ہو جائیں گے۔"

یہ بیان اس طرح کے جملوں سے بھرا پڑا ہے جو اپنی معنویت اور خوبصورتی کی وجہ سے ہر زمانے پر صادق آئیں گے۔ ان کے بیان کا خاتمہ بھی بے حد مؤثر ہے جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس میں وہ مجسٹریٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے، جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے۔ تمہارے حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے، جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ! اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مؤرخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہو گا!"

اس اقتباس میں مولانا کا افسانوی طرزِ بیان نمایاں ہے قاری محسوس کر سکتا ہے کہ کتنے حسین پیرایہ میں انہوں نے اپنے بیان کا اختتام کیا ہے۔ جس میں ان کی مظلومیت کی داستان سمٹ آئی ہے اور انہیں اپنی کامیابی کا یقین بھی ہے کہ ان کی جد وجہد رائیگاں نہیں جائے گی اور سب سے بڑا منصف انہیں کے حق میں فیصلہ لکھے گا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ قولِ فیصل میں مولانا آزاد کا بیان اگرچہ تحریری ہے لیکن اپنے پیرایۂ بیان سے وہ ایک جامع اور پر مغز خطاب سے کم نہیں ہے، جس میں ان کا خطیبانہ اسلوب اپنے شباب پر نظر آتا ہے جس میں وہ وقت کی ایک ظالم وجابر اور طاقت ور حکومت کے سامنے اپنے دوٹوک اور باغیانہ تیوروں کے ساتھ ایک عظیم مجاہد نظر آتے ہیں۔ وہیں دوسری طرف عوام کے لیے وہ ایک اولوالعزم اور سچے و مخلص رہنما نظر آتے ہیں جو نہ صرف اس طاقت ور حکومت کے سامنے اپنے مضبوط عزائم کے ساتھ چٹان کی طرح کھڑا ہے بلکہ انہیں بھی عزم وثبات اور حوصلہ وضبط کا ایسا درس دے رہا ہے جو بلاشبہ تاریخِ آزادئ ہند کا ایسا روشن اور تابناک پہلو ہے جسے مستقبل کا کوئی مؤرخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

12.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ درج ذیل نکات سے واقف ہوئے:

- خطابت اس فن کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ انسان مختلف قسم کے سامعین سے مخاطب ہو کر ان کے سامنے زبانی طور پر اپنی باتیں رکھتا ہے اور انہیں نہ صرف اپنی باتوں پر قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اپنی منشا و مراد کو سامعین کے دل ودماغ میں اتار کر انہیں اپنا ہم خیال اور ہم نوا بنانے کی کوشش کرتا ہے، اور اپنے حسبِ منشا ان کے اندر کسی عمل کے کرنے یا نہ کرنے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔

- خطابت کا دائرہ بہت وسیع ہے اور دنیا کا کوئی موضوع خطابت کی دسترس سے باہر نہیں۔ خطابت ابلاغِ عامہ کا بہت مؤثر ذریعہ ہے، جو دنیا کے ہر گوشے اور ہر انسانی معاشرے میں نہ صرف رائج، بلکہ نہایت مقبول رہا ہے۔
- خطابت کا ارتقا انسان کے ارتقا کے ساتھ ہوا اور سب سے پہلا خطیب وہ شخص تھا جس نے اپنے ارد گرد کے لوگوں سے کسی موضوع پر خطاب کیا ہو گا۔
- فن کے طور پر اہلِ یونان پھر اہلِ روم اور ان کے بعد عربوں نے اسے فروغ دیا۔ ارسطو نے سب سے پہلے ایک فن کے طور پر خطابت پر قلم اٹھایا۔ اور اردو میں خطابت کا آغاز دینی مجالس میں وعظ و نصیحت سے ہوا، اردو خطبات کے اولین نمونے صوفیا کے مواعظ کی شکل میں دستیاب ہیں، جن میں عربی و فارسی کے اثرات نمایاں ہیں۔
- آزادی کی تحریکوں سے اردو خطابت کا انقلابی دور شروع ہوا اور اردو خطابت دینی مجلسوں سے نکل کر عوامی تحریکوں اور سیاسی ایوانوں تک پہنچی، اور اردو خطابت نے آزادی کی تحریکوں میں نئی جان ڈال دی اور ملک کے ہر گوشے میں پہنچا دیا۔
- اس دور کے مشہور خطبا میں مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ بخاری، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، نواب بہادر یار جنگ، مولانا سعید احمد دہلوی، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور شورش کاشمیری قابلِ ذکر ہیں۔
- مولانا ابوالکلام آزاد ایک صاحبِ طرز ادیب، متحرک و فعال صحافی اور منفرد لب و لہجے کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر خطیب اور شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ اور ان کا شمار برصغیر کے چوٹی کے خطیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کے خطبات نے ملک کی تحریکِ آزادی کو سرگرم کرنے اور اس تحریک کو عوامی تحریک بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔
- مولانا آزاد نے دین، معاشرہ، تعلیم، ادب اور سیاست کے سلگتے ہوئے موضوعات کو اپنے خطبات کا موضوع بنایا ہے اور مختلف کے قسم کے سامعین اور متعدد النوع موضوعات کو کامیابی کے ساتھ یکساں طور پر بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔ مولانا آزاد کی خطابت کے موضوعات کے تنوع سے ان کے افکار کی گہرائی، علمی تبحر اور وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔
- فنِ خطابت میں مولانا کی مہارت میں ان کے شوق، حافظے اور ان کی زبان دانی کا بڑا دخل تھا۔ مذہبی تعلیم، گھر کا ماحول، موسیقی سے فطری لگاؤ، عربی زبان و ادب پر گہری نظر اور قرآنی لب و لہجہ، ان تمام عناصر نے مل کر ان کے اندازِ بیان اور اسلوبِ خطابت کو ایک منفرد رنگ و آہنگ عطا کیا تھا۔
- قولِ فیصل مولانا آزاد کا وہ تحریری بیان ہے جو انہوں نے عدالت میں دیا تھا جو تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ ادبی نقطۂ نظر سے بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس پر خطیبانہ اسلوب غالب ہے۔
- مولانا نے خلافت اور نیشنلزم اور اسلامی حریت پر نہایت بصیرت افروز گفتگو کی ہے اور جو اپنے اندر مطالب و معانی کا ایک سمندر سمیٹے ہوئے ہے اور سلاست و روانی کے ساتھ ساتھ بڑا پر جوش اور جرأت سے بھرپور ہے۔

- اس کا لہجہ دوٹوک اور غیر مصالحانہ، اندازِ بیان ٹھوس اور غیر متزلزل اور اسلوب سنجیدہ و متین اور بہت متاثر کن ہے اور اس کے بعض جملے اپنی لفظی خوبصورتی اور معنویت کی وجہ سے ہمیشہ زندہ و جاوید رہیں گے۔

12.9 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
سامعین	:	سننے والے، توجہ دینے والے
حسب منشا	:	اپنے ارداے کے مطابق
استدلال	:	دلیل پیش کرنا، ثبوت
توضیح	:	واضح کرنا، روشن کرنا
عصبیت	:	جامب داری، گروہ بندی کی وجہ سے پیدا ہونے والی مضبوطی
مسابقت	:	مقابلے پر دوڑنا، فن کی جمع، بہت سے ہنر یا فن
فنون	:	فن کی جمع، بہت سے ہنر یا فن
متصرف	:	تصعرف کرنے والا
اثر انداز	:	متاثر کرنے والا، دباؤ رکھنے والا
منطق آمیز	:	استدلال پر مبنی، وہ منطق جس میں دلیل ہو
معجزہ	:	عاجز کرنے والا، وہ کام جو انسانی طاقت سے باہر ہو
الوہیت	:	خدائی یا خداوندی، خدائی کا تربہ
متزلزل	:	ڈگمگانے والا، کانپنے والا، لرزاں

12.10 نمونہ امتحانی سوالات

12.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. فنِ خطابت پر سب سے پہلے کس مشہور دانشور نے قلم اٹھایا؟
2. ابن رشد نے فنِ خطابت میں ارسطو کے رسالہ کی تلخیص کس عنوان سے کی؟
3. یونان کا سب سے بڑا خطیب کسے مانا جاتا ہے؟
4. اہلِ یونان کے بعد کس قوم نے خطابت کو فروغ دیا؟
5. اسلام سے قبل عربوں کے ایک مشہور خطیب کا نام لکھیے۔

6. فرانس کا مشہور خطیب کون ہے؟
7. اردو خطابت کی تاریخ کا اہم موڑ کس دور کو مانا جاتا ہے؟
8. شورش کاشمیری کے علاوہ اور کس نے "خطبات آزاد" کے نام سے مولانا آزاد کی تقریروں کا مجموعہ مرتب کیا؟
9. کس عالم نے مولانا آزاد کی جلسہ ندوۃ کی تقریر کو یاد کیا؟
10. قولِ فیصل میں مولانا آزاد کے بیان پر گاندھی جی کس اخبار میں تبصرہ کیا ؟

12.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. خطابت کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے اس کی اہمیت وافادیت پر تبادلۂ خیال کیجیے۔
2. خطابت کے عناصر پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔
3. خطابت کے اغراض ومقاصد کی وضاحت کیجیے۔
4. مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے خطیبانہ پہلو پر روشنی ڈالیے۔
5. قولِ فیصل پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

12.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. خطابت کے آغاز وارتقا پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. مولانا آزاد کے اسلوبِ خطابت پر روشنی ڈالتے ہوئے فنِ خطابت میں ان کی انفرادیت واضح کیجیے۔
3. مولانا آزاد کی خطابت کے بارے میں دانشوروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی خطابت کے متعلق اپنی رائے دیجیے!

12.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. قولِ فیصل	مولانا ابوالکلام آزاد
2. خطباتِ آزاد	مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ شورش کاشمیری
3. مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریریں	مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ انور عارف
4. مولانا ابوالکلام آزاد فکر وفن	ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد
5. فنِ خطابت	شورش کاشمیری
6. مولانا ابوالکلام آزاد فکر وفن	ملک زادہ منظور احمد

بلاک IV: مولانا آزاد کی سیاسی خدمات: آزادی سے پہلے اور بعد

اکائی 13: جدوجہد آزادی میں مولانا آزاد کا حصہ

اکائی کے اجزا

13.0		تمہید
13.1		مقاصد
13.2		ابتدائی سرگرمیاں
13.3		الہلال کا اجرا
13.4		کانگریس کی صدارت
13.5		تقسیم ہند اور مولانا آزاد کا موقف
13.6		اکتسابی نتائج
13.7		کلیدی الفاظ
13.8		نمونہ امتحانی سوالات
	13.8.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	13.8.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	13.8.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
13.9		تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

برطانوی اقتدار کی سامراجی صدی (1947-1858) میں برصغیر ہندوستان میں بڑے نامور قائدین ابھرے جنھوں نے اپنے فکر ذہنی، خلوص نیت اور دلیرانہ اور بے لوث قیادت سے ایک نئے معاشرے اور تہذیب کی بنیادیں استوار کیں، اور ایک جمہوری قومی تشخص کی داغ بیل ڈالی۔ گو سیاسی غلامی کا یہ عہد بڑا مردم خیز عہد رہا ہے، جس میں زندگی کے ہر شعبہ میں اور ملک کے ہر حصہ میں عظیم شخصیتیں ابھریں اور اپنا دیرپا اثر چھوڑ گئیں، مگر ان میں کچھ قائدین ایسے ہیں جن کا نام نامی زریں حروف میں لکھا جائے گا، انہیں میں مولانا

ابوالکلام آزاد شامل ہیں۔ اس اکائی میں ہم برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد آزادی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات کا مطالعہ کریں گے۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں مولانا آزاد کے کردار کو بیان کر سکیں۔
- الہلال کے ذریعہ مولانا نے جو خدمات انجام دی ہیں، ان سے واقف ہو جائیں۔
- کانگریس کی صدر کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد نے ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں جو اہم نکات پیش کیے ہیں، ان کے بارے میں جان سکیں۔
- تقسیم ہندوستان کے حوالے سے مولانا آزاد کا موقف کیا تھا، اس کو بیان کر سکیں۔

13.2 ابتدائی سرگرمیاں

مولانا آزاد ملک کے عظیم رہنما، مدبّر سیاست داں اور مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ جید عالمِ دین، مفسر قرآن، مفکر، بے باک صحافی، صاحبِ طرز ادیب، صفِ اوّل کے قائد، بے مثال مقرر، جنگِ آزادی کے میر کارواں، جدید ہندوستان کے معمار اوّلین کی حیثیت سے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے جنگ آزادی میں تقریباً دس برس سات ماہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ سیاسی میدان میں جن باتوں کو انھوں نے اپنایا اس پر تادمِ زیست قائم ودائم رہے۔ ان میں ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے بنیادی اصول شامل ہیں۔

مولانا آزاد اپنے جن امتیازات، کمالات اور خصوصیات کی بدولت پورے ملک میں چھائے ہوئے تھے وہ ان کی غیر معمولی قابلیت تھی جن میں نمایاں وصف ان کی صحافت اور جنگِ آزادی میں ان کی عملی شرکت ہے۔ علمی کاموں میں سردست صحافت ہی ہے جس سے ان کا تشخص قائم رہا۔ ان کی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا۔ صحافت سے مولانا کا مقصد ملک وقوم کی خدمت اور رہبری تھی۔ ان کی نگاہ میں سیم وزر کی کوئی وقعت نہ تھی اور نہ انھوں نے تجارت کے لیے صحافت کو اپنایا بلکہ وہ اس کو اپنے اعلیٰ اور برتر مقصد اور مشن کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کے پیشِ نظر قوم کی بیداری اور اصلاحِ امت تھی وہ صحافت کو خواب غفلت میں محو ملک وقوم میں انقلاب کی روح پھونکنے کا ایک اہم اور مؤثر ذریعہ خیال کرتے۔تھے۔

مولانا نے گیارہ برس کی عمر میں صحافت کے میدان میں قدم رکھّا اور کم وبیش اٹھائیس 28 برس تک وہ اس سے وابستہ رہے، سیاسی زندگی کے ہنگاموں اور شدید مصائب میں بھی انھوں نے اس کا دامن تھامے رکھا اور اپنے افکار وخیالات اور علمی وادبی مقاصد بروئے کار لاتے رہے۔ نیز ملکی رسم ورواج بالخصوص مسلمانوں کی معاشرتی وسماجی اصلاح کی کوشش کرتے رہے جو آگے چل کر سرسید تحریک کے بعض

منفی اثرات کی مدلّل مخالفت، ہندوستانی متحدہ قومیت کی پرزور وکالت اور غیر ملکی حکمرانوں کو ملک سے بے دخل کرنے کی منظم تحریک پر منتج ہوتی ہے۔

1905ء میں جب مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا، جو قومی زندگی میں مسلمانوں کی جداگانہ شناخت کی علم بردار بن کر سامنے آئی، تو مولانا نے اس دو قومی نظریے کی پرزور مخالفت کی۔ وہ قومی زندگی میں مسلمانوں کی سرگرم شرکت کے زبردست مبلغ تھے وہ یہ احساس بھی رکھتے تھے کہ اس ملّت کے کچھ مخصوص مسائل بھی ہیں لیکن ان کا اندازِ فکر مسلم لیگ سے یکسر مختلف رہا۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان دیگر برادران وطن کے دوش بدوش چل کر ان مراحل سے عہدہ برآ ہوں جن سے وہی نہیں بلکہ پورا ملک دوچار ہو رہا ہے اگر کچھ مسائل مسلمانوں کے مخصوص ہیں تو ان کا حل علاحدگی اختیار کرنے میں نہیں اشتراکِ عمل میں نظر آیا۔

ہندوستان سے باہر کی دنیا خصوصاً مسلم ممالک اس وقت جن مشکلات و مسائل سے دوچار تھے مولانا اس کا پورا ادراک رکھتے تھے جیسے جنگِ بلقان و طرابلس اور اندرون ملک سانحہ کان پور۔ ان حالات سے ہندوستانی مسلمانوں کی دلچسپی کو نہ صرف قدرتی بلکہ ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن یہاں بھی ان کے نقطہ نظر کی اساس جذباتیت پر نہیں عقلی استدلال پر تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہندوستانی مسلمان بیرونی مسلم ممالک کے ساتھ کسی موثر مدد کے خواہاں ہیں تو یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے وہ اپنی اندرونی صفوں کو منظم کریں اور اس کے ساتھ ان کاوشوں و کوششوں میں اپنے ہم وطنوں کو بھی اعتبار و اختیار کے ساتھ شرکت کی دعوت دیں اور ایسا اس لیے بھی تھا کہ مولانا محض عقیدے کے اختلاف کی بنیاد پر ہم وطنوں میں سیاسی تفریق کے قائل نہیں تھے۔

آزادی کی جدوجہد میں مولانا آزاد کی ملاقات شیام سندر چکرورتی سے ہوئی جو آزادئ وطن کے لئے انقلابی اقدامات کے حامی تھے اور ان کا خیال تھا کہ مسلمان انگریز دوست ہیں اور وہ مسلم رہنماؤں کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مولانا سے ملاقات کے بعد انھوں نے اپنے رویّہ میں تبدیلی کی، مولانا اور ان کے ساتھیوں نے انھیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ جو سمجھ رہے ہیں وہ پوری سچائی نہیں ہے اور غیر ملکی تسلّط سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ، کچھ مراعات یافتہ خواص یا سرکاری ملازمتوں میں شامل چند لوگوں کو چھوڑ کر، عام مسلمانوں میں اتنا ہی قوی ہے جتنا دوسرے ابنائے وطن میں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سے رابطہ قائم کیا جائے اور انھیں قریب لانے کی کوشش کی جائے۔ مولانا ان لوگوں سے اپنے رابطے کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم میں لکھتے ہیں:

> "ان دنوں جماعتیں اپنے کارکن صرف متوسط طبقے کے ہندوؤں سے چنا کرتی تھیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام انقلابی جماعتیں مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم تھیں۔ وہ دیکھتی تھیں کہ برطانوی حکومت نے ہندوستانی تحریک آزادی کی مخالفت میں مسلمانوں کو آلہ کار بنا رکھا ہے اور مسلمان اس کے اشارے پر چلتے ہیں، یہ بات انقلابی محسوس کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور مجھے ان کا اعتماد حاصل ہو گیا، میں نے انھیں بحث کر کے یہ یقین دلایا کہ ان کا خیال غلط ہے کہ مسلمان بہ حیثیت ایک جماعت کے ان سے دشمنی رکھتے ہیں اور یہ مناسب نہیں ہے کہ

بنگال کے چند سرکاری ملازموں کے رویّے سے انھیں جو تجربہ ہوا ہے، اسے وہ ایک عام حقیقت سمجھ بیٹھیں۔ مصر، ایران اور ترکی میں جمہوریت اور آزادی کے متوالے انقلابی کارروائیوں میں سرگرمی دکھا رہے ہیں، ہندوستان کے مسلمان بھی جدوجہد آزادی میں شریک ہو جائیں گے اگر ہم ان میں کام کریں اور انھیں اپنا دوست اور ساتھی بنائیں۔ میں نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ اگر مسلمان مخالفت میں سرگرم اور سیاستی تحریک سے بے تعلق رہے تو آزادی حاصل کرنے کی مہم بہت دشوار ہو جائے گی، اس لئے ہمیں ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ اس جماعت کی تائید اور دوستی حاصل کریں"۔

(اردو ترجمہ پروفیسر محمد مجیب، مطبوعہ اورینٹ لانگ مین، ص196)

مولانا آزاد کی یہ کوششیں رائیگاں نہ گئیں ان کی کوششوں کی بدولت ہندو انقلابیوں کے ساتھ مسلمان انقلابی آملے اور یہ سلسلہ شمالی ہندوستان تک جا پہنچا، ان کی خفیہ ملاقاتیں ہونے لگیں اور خفیہ پروگرام ترتیب پانے لگے اور وہ بدگمانیاں دور ہونے لگیں جو ملک کے ان دو فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے سے روکتی تھیں اور بڑی حد تک غیر ملکی حکمرانوں کی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھیں۔

13.3 الہلال کا اجرا

1908ء کے اوائل میں مولانا آزاد نے ترکی، شام اور مصر اور فرانس کا دورہ کیا، وہاں کے جمہوریت پسند اور آزادی کے متوالوں سے متعارف ہوئے اور تعلق پیدا کیا اور انہیں ہندوستان کی صورت حال سے باخبر کیا۔ اور وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد کئی سالوں تک ان سے خط و کتابت رہی اس تعلق نے ان کے فکری اور عملی موقف کو مزید تقویت دی۔ مولانا آزاد اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بیداری اور شعور سے ہم کنار کرنے کی غرض سے ایک معیاری اخبار جاری کرنا ضروری ہے۔

مولانا آزاد ابتدا ہی سے جنگ آزادی کے حصول میں ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار رہے، یہی احساس تھا جس کو ہر آدمی تک پہونچانا ان کا مقصود تھا۔ اس سیاسی شعور کی بیداری اس وقت ہوئی جب انھوں نے 1912ء میں کلکتہ سے اپنا اخبار الہلال نکالا۔ انھوں نے قومی جذبات اور سیاسی شعور کو پختہ کرنے کی اپنی کوششوں کو تیز گام کر دیا۔ اس اخبار کو اردو داں طبقے بالخصوص پڑھے لکھے مسلمانوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور بہت ہی قلیل مدّت میں ہزاروں دلوں میں جذبۂ آزادی کی دبی چنگاریاں شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں۔ الہلال کی دعوت عام تھی لیکن اس کے اوّلین مخاطب مسلمان ہی تھے، اس کی آواز پر علماء و مشائخ کا وہ گروہ جو مدرسوں، خانقاہوں کی چہار دیواریوں میں قید رہتا اور اپنا قدم باہر رکھنا خلافِ شان سمجھتا تھا، ملک و ملّت پر غیر ملکی تسلّط کے خلاف جدوجہدِ آزادی میں شرکت کے لئے میدانِ عمل میں نکل آیا۔ اس کے نعرۂ انقلاب سے ہندوستان کے بام و در ہل اٹھے اس کی گونج سے حریت و آزادی کی لہر دوڑ گئی اور انگریزوں کے خلاف نفرت و اشتعال کا جذبہ موجزن ہو گیا۔ اس نے پورے ملک میں آگ لگا کر مُردہ دلوں میں نئی جان ڈال دی، مظلوموں اور مغلوبوں کو زنجیرِ غلامی توڑ دینے اور محکوموں کو اپنی گردنوں سے طوقِ غلامی اتار دینے پر آمادہ کیا اور لوگوں کو آزادی کا شیدائی بنا دیا۔

الہلال نے قومی یکجہتی کے فروغ میں، انگریزوں کے ظلم واستبداد کے خلاف سارے ہندوستانیوں کو متحد کر دیا تا کہ وہ اپنی صلاحیتیں حصولِ آزادی کی جدوجہد میں صرف کر سکیں۔

قومی جذبات کی بیداری اور آزادی کی جہدِ مسلسل میں الہلال کی خدمات کا اعتراف مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے عدالتی بیان میں کچھ یوں کیا ہے:

"الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی ہے۔ وہ پہلے اپنے ہندو بھائیوں کی سیاسی سرگرمیوں سے نہ صرف لاتعلق تھے بلکہ اس کی مخالفت کے لئے بیروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا ہے کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے ہندوستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو حکومت قائم ہو جائے گی مگر الہلال نے مسلمانوں کی تعداد کی جگہ ایمان پر اعتقاد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں سے مل جانے کی دعوت دی اسی سے تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریک خلافت وسوراج ہے۔ بیروکریسی ایک ایسی تحریک کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی تھی اس لیے پہلے الہلال کی ضمانت ضبط کی گئی پھر جب البلاغ کے نام سے دوبارہ اخبار جاری کیا تو 1912 میں گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھے نظر بند کر دیا۔ میں بتلانا چاہتا ہوں کہ الہلال تمام تر آزادی یا موت کی دعوت تھی۔"

(قول فیصل، ص104 تا105، نیز، ابوالکلام آزاد کی نادر تحریریں، ص40 تا60)

اسی عدالتی بیان میں مولانا اپنا بیان کچھ یوں درج کراتے ہیں جو آج بھی مشعلِ راہ ہے اور جنگِ آزادی میں مولانا کی حصّہ داری کو نمایاں کرتا ہے۔

"میں نے آج سے بارہ سال پہلے الہلال کے ذریعے مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ آزادی کی راہ میں قربانی وجان فروشی ان کا قدیم اسلامی ورثہ ہے، ان کا اسلامی فرض یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں اپنے پیچھے چھوڑیں، میری صدائیں بیکار نہ گئیں مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں گے۔" (الہلال، 18 ستمبر 1919ء)

مولانا آزادی اور اتحاد کی جس راہ پر گامزن تھے اسے حق وصداقت کا راستہ سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ حق ضرور کامیاب ہو گا اور باطل چاہے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اس کی چمک عارضی ہے اور وہ ایک دن معدوم ہو جائے گا اور حق کے غالب ہوتے ہی باطل کو فرار کا

راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ قرآن مجید آسمانی صحف اور اقوام عالم کی تاریخ کے مطالعہ سے ان پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی کہ آزادی کا سورج ایک دن ضرور طلوع ہو گا اور ہندوستانی عوام اپنی بے سروسامانی کے باوجود کامیابی سے ہم کنار ہونگے۔

مولانا کی ضربِ مسلسل نے الہلال اور البلاغ کے ذریعہ امّتِ مسلمہ کو یہ باور کرایا کہ آزادی کی جدّوجہد ان کا دینی وملّی فریضہ ہے چنانچہ انگریزوں کے اشاروں پر مذہبی حلقوں اور دینی رہنماؤں کی طرف سے جب آزادی واتحاد کی تحریک کو دین ومذہب کے خلاف قرار دیا تو مولانا نے اس کا پردہ فاش کیا اور یہ بتایا کہ آزادی انسان کا فطری حق ہے کوئی مذہب اپنے پیروکار کو اس کے حق سے محروم نہیں کر سکتا اور مسلمانوں کے لئے آزادی کی کوشش ایک دینی فریضہ ہے۔ ہندوؤں کے لئے ملک کی آزادی کے لئے کوشش کرنا حبُّ الوطنی میں داخل ہے مگر مسلمانوں کے لئے یہ ایک دینی فریضہ ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔ اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق وصداقت، عدل ومساوات، ظلم واستبداد کی غلامی کو توڑنے کے لئے بنائی جائے۔

مولانا آزاد اپنے سیاسی فکر وعمل میں جن اشخاص سے متاثر ہوئے ان میں مولانا شبلی، جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کے نام شامل ہیں۔ ان کی حریت پسندی، روشن خیالی، راست گفتاری اور دور اندیشی کی صفات مولانا آزاد کی شخصیت میں یقینی طور پر دیکھی جاسکتی ہیں، ان کے دونوں اخبار الہلال والبلاغ ااس کا بیّن ثبوت ہیں۔ مولانا آزاد غالباً پہلے عظیم مسلم رہنما ہیں جنھوں نے پوری قوّت کے ساتھ متحدہ قومیت کا تصوّر پیش کیا اور اسے عوام الناس میں ترویج واشاعت کے لئے اپنی تمام تر دینی وعلمی اور استدلالی صلاحیتیں صرف کر دیں۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے عالمگیر انسانی اخوّت ومساوات پر بھی زور دیا۔ انھوں نے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ خدا کے نزدیک کسی ایک انسان یا گروہ کی کسی دوسرے پر کوئی برتری اور کوئی فوقیت نہیں ہے ہاں اگر اس کا کردار اور عملِ صالح ہے تو وہ اس کی بنیاد پر محترم ومکرّم ہے۔

13.4 کانگریس کی صدارت

پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کو جرمنی پر فتح حاصل ہوئی لہٰذا ترکی کو بھی شکست کا منھ دیکھنا پڑا کیوں کہ اس نے اس جنگ میں جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ اتحادی طاقتوں نے ترکی کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا تو ہندوستانی مسلمانوں کے دل کانپ گئے کیونکہ ترکی خلافت اسلامیہ کا مرکز تھا۔ اور وہاں کا سلطان عالمی اسلامی برادری کا خلیفہ تھا۔ اس لیے ترکی کے خلاف برطانیہ کے اقدامات کو خلیفہ کے خلاف اقدامات سے تعبیر کیا گیا۔

ان تمام مسائل پر تبادلہ خیال کے دوران مولانا کی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی جو جلیان والہ باغ کے قتل عام اور ترکی کے سلسلے میں انگریزی سامراج کے خلاف ایک موثر تحریک چلانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ یہ دو عظیم رہنماؤں کی پہلی ملاقات تھی اگرچہ وہ دونوں غائبانہ طور سے ایک دوسرے سے متعارف تھے۔ دو بدو ملاقات کا پہلا موقع تھا۔ پہلی ہی ملاقات بڑی تاریخ ساز ثابت ہوئی کیونکہ جب گاندھی جی نے ترک موالات کی تحریک کا خاکہ پیش کیا تو خود مولانا کے الفاظ میں " میں نے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر کہا کہ میں ان کے پروگرام کو پوری طرح منظور کرتا ہوں۔ اگر لوگ واقعتاً ترکی کی امداد کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے گاندھی جی کے سمجھائے ہوئے پروگرام

کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا" اور اس طرح عدم تعاون کا آغاز ہو گیا۔ پروفیسر سرن مکرجی نے لکھا ہے کہ اس تحریک کے بانی کی حیثیت سے جس قدر حصہ گاندھی جی کا تھا اسی قدر مولانا آزاد کا بھی تھا۔

مولانا آزاد نے آگرہ میں منعقد خلافت کانفرنس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے لیے انگریز حکومت کی فوج میں بھرتی ہونا اور فوج کی ملازمت کرنا حرام ہے۔ حکومت نے مولانا آزاد کی اس صدارتی تقریر کو ایک کھلا ہوا چیلنج سمجھا اور بالآخر دسمبر 1921 میں انہیں گرفتار کر لیا گیا اور دیش بندھو چترنجن داس کے ساتھ پریزیڈنسی جیل علی پور میں قید کر دیا۔ مولانا نے اپنے خلاف مقدمہ کی کاروائی میں ستیہ گرہی کی حیثیت سے کوئی حصہ نہیں لیا تاہم انہوں نے عدالت میں ایک تحریری بیان ضرور داخل کیا جو بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور "قول فیصل" کے نام سے مشہور ہے۔

فروری 1922 میں مولانا کو ایک سال کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ فیصلہ سننے کے بعد مولانا نے مسکراتے ہوئے مجسٹریٹ سے کہا کہ "یہ سزا تو بہت کم ہے اور میری توقع کے خلاف بھی۔" یہ مولانا کی دوسری اسارت تھی۔ پہلی نظر بندی الہلال کی بے باک تحریروں کے نتیجہ میں عمل میں آئی تھی۔ اب دوسری قید کی سزا بھی مسلمانوں کو فوج میں بھرتی نہ ہونے اور برطانوی حکومت کی حمایت میں جنگ نہ کرنے کے فتوے کے خلاف سنائی گئی تھی۔

اسی دوران گاندھی جی نے ترک موالات کی تحریک واپس لے لی اور کانگریس کے رہنما اختلافات کا شکار ہو کر "پروچنجرز" اور "نوچنجرز" میں بٹ گئے۔ "پروچنجرز" انتخابات میں حصہ لے کر کونسلوں کی کارکردگی کو معطل کرنے کے حق میں تھے جبکہ "نوچنجرز" اسے ترک موالات کے پروگرام کی اسپرٹ کے منافی تصور کرتے تھے اور اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کے مخالف تھے۔ اس مسئلے کو سلجھانے کی اہم ذمہ داری بھی جیل سے رہائی کے بعد مولانا آزاد کے کاندھوں پر آ گئی۔ انہوں نے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں، کئی جلسے منعقد کیے اور رہنماؤں کے دونوں گروہوں میں مصالحت کی کامیاب کوششیں کیں۔

"نوچنجرز" اور "پروچنجرز" کے اختلافات کو رفع کرنے اور ان دونوں کے درمیان مصالحت کرانے کے لیے مولانا نے ایک نسخہ تجویز کرتے ہوئے کہا کہ:

> "میری ناچیز رائے میں ہمارا آئندہ طرز عمل یہ ہونا چاہیئے کہ ایک طرف ہماری ایک جماعت کونسلوں میں چلی جائے، دوسری طرف کونسلوں کے باہر بھی سرگرمیاں جاری رہیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں جگہ کی نگرانی کرے اور ایک نظام کے تحت دونوں جگہ کام ہو۔"

مولانا آزاد نے اس اختلافی مسئلہ کو بحسن وخوبی حل کر کے کانگریس کو منقسم ہونے سے بچا لیا اور دونوں گروہوں کو مطمئن کر دیا۔

1925ء میں مولانا نے آل پارٹیز کانفرنس میں شرکت، جمیعۃ علما کے اجلاس کی صدارت کی اور بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کرنے اور ہاتھ سے کاتے گئے سوت سے کپڑا بن کے پہننے کی تلقین کی۔ اس پورے عرصہ میں ان کا پیغام یہی تھا کہ "محض باہمی میل ملاپ اور بھائی چارہ ہی کے ذریعہ ہندوستان آزاد ہو کر پنپ سکتا ہے۔"

ان تمام کوششوں کے باوجود ملک فرقہ وارانہ منافرت کا شکار رہا لیکن مولانا نے ہمت نہ ہاری۔ دراصل وہ انسانیت میں یقین رکھتے تھے، انہوں نے مسلم ہندو اتحاد کی جہت میں ایک اور کوشش کی اور جولائی 1926ء میں پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ مل کر ایک غیر سیاسی انجمن بنائی جس کا نام انڈین نیشنل یونین رکھا گیا۔ اس انجمن کا مقصد ایسے روشن خیال اشخاص کو منظم کرنا تھا جن کے نزدیک فرقہ واریت قوم پروری دشمن تھی اور جو فرقہ وارانہ تنازعات کو سیاسی، اقتصادی اور سماجی تباہ کاری کا سبب خیال کرتے تھے۔ اس یونین کے ذریعہ مولانا آزاد اور موتی لال نہرو نے ملے جلے بورڈ بنائے تاکہ مختلف فرقوں کے درمیان باہمی اختلاف رفع ہو سکیں۔

12 مارچ 1930ء کو مہاتما گاندھی کا تاریخی ڈانڈی مارچ شروع ہو کر 6 اپریل کو ختم ہوا۔ انہوں نے نمک کا قانون توڑ کر ملک بھر کو قانون شکنی کے لیے تیار کیا۔ اس کے رد عمل کے طور پر حکومت نے ہندوستان کے رہنماؤں کو جیلوں میں بھرنا شروع کر دیا۔ مولانا ستیہ گرہی کی حیثیت سے میرٹھ میں گرفتار کر لیے گئے۔ اس وقت ان کی نامزدگی کانگریس کے صدر کی حیثیت سے عمل میں آئی تھی کیونکہ ہر کانگریسی رہنما اپنی گرفتاری سے پہلے اپنے جانشین کو نامزد کر جاتا تھا، اسی لیے مولانا آزاد نے بھی اپنی گرفتاری پر ڈاکٹر انصاری کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

ان کی رہائی 1931ء میں عمل میں آئی جو گاندھی ارون پیکٹ کا نتیجہ تھی۔ رہائی کے فوراً بعد مولانا نے کراچی میں جمیعۃ العلما کے اجلاس کی صدارت کی جو کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ہی منعقد کیا گیا تھا۔

1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد کانگریس نے پہلی مرتبہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے الیکشن میں حصہ لینا منظور کیا۔ اس کے پس پشت بھی مولانا ہی کا ہاتھ تھا کیونکہ ان کے نزدیک کانگریس کو اپنی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ الیکشن کے سلسلہ میں مولانا نے خاصی تگ و دو کی اور 1937ء میں جب الیکشن کے نتائج بر آمد ہوئے تو کانگریس کو سات صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی اور صوبہ سرحد میں کانگریس سب سے بڑی اکثریتی جماعت کی حیثیت سے کامیاب رہی۔

اس سلسلے میں کانگریس نے ایک سہ رکنی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کی جس میں ڈاکٹر راجندر پرساد اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کے علاوہ مولانا آزاد بھی شامل تھے۔ بورڈ کی ذمہ داری یہ تھی کی وہ کانگریسی حکومتوں پر نظر رکھے اور اسے ضروری مشورے دے۔ اس طرح مولانا پورے ستائیس مہینے تک کانگریسی حکومتوں کی نگرانی میں مصروف رہے۔ اس پوری مدت میں کانگریس نے شاندار کام انجام دیے اور عوام کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا۔ اس کے اہم کارناموں میں زمینداری کا خاتمہ اور زراعتی قرضہ جات کی معافی شامل ہیں۔ مولانا نے صوبجاتی انتظامیہ کی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی لی اور ان کے ہر مسئلہ کو سلجھانے میں کامیاب رہے۔ دراصل ان کی کامیابی کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے آپ کو کانگریس کے کسی مخصوص گروہ سے وابستہ نہیں کیا بلکہ ہر معاملہ میں غیر جانبداری کا ثبوت دیا اور ہر موقعہ پر صحیح مشوروں سے نوازا۔ کانگریسی حکومتیں بڑی کامیابی کے ساتھ سرگرم کار تھیں کہ دوسری جنگ عظیم میں برطانوی حکومت کی ہندوستان کو جنگ کے شعلوں میں ڈھکیل دینے کی پالیسی کے خلاف انہیں احتجاجاً مستعفی ہونا پڑا۔

مارچ 1940ء میں کانگریس نے صدارت کا بار دوبارہ مولانا آزاد کے کاندھوں پر رکھ دیا۔ پہلی مرتبہ 1923ء میں خصوصی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی تھی مگر اب دوسری جنگ عظیم کے دوران جب ملک سیاسی اور اقتصادی بحران کا شکار تھا قوم نے پھر

مولانا کو اپنی امیدوں کا مرکز بنانے ہی میں عافیت کا احساس کیا۔ اگرچہ پچھلے برسوں میں بھی مولانا سے اس ذمہ داری کو قبول کرنے کی درخواست کی جاچکی تھی مگر مولانا تیار نہ ہوئے۔ اب حالات کی نوعیت مختلف تھی اور اس منصب کو قبول کرنا کسی چیلنج سے کم نہ تھا، اس لیے مولانا رضامند ہوگئے۔ 20 مارچ کو بہار میں واقع رام گڑھ نامی مقام پر کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ مولانا آزاد نے اپنے خطبہ صدارت میں مسلمانوں کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا وہ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اور آج بھی بڑی معنویت رکھتے ہیں انہوں نے کہا:

> " میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں۔ اسلام کے تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے مذہبی اور کلچر دائرے میں اپنی خاص ہستی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی۔ وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہوسکتا۔"

برطانوی حکومت نے مارچ 1942 میں اپنے نمائندہ سر اسٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیجا۔ سر کرپس پہلے بھی ہندوستان کے رہنماؤں سے تبادلہ خیال کر چکے تھے جن میں مولانا بھی شامل تھے۔ اس مرتبہ بھی سر کرپس نے مولانا سے 29 مارچ سے 9 اپریل تک ملاقاتیں کیں۔ کیونکہ کانگریس نے مولانا کو سر کرپس کے ساتھ مذاکرات کے لیے اپنا واحد نمائندہ نامزد کیا تھا۔ مولانا کی سفارش پر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کرپس کی پیشکش کو مسترد کر دیا۔

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد کانگریس نے 8 اگست 1942 کو بمبئی میں مولانا آزاد کی صدارت میں ہندوستان چھوڑو تحریک کی قرارداد پاس کی۔ اس کے نتیجے میں تمام رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مہاتما گاندھی کو پونا کے آغا خان پیلس میں قید کر دیا گیا اور مولانا آزاد اپنے دوسرے رفقا کے ساتھ احمد نگر کے تاریخی قلعہ میں مقید کر دیے گئے۔ جہاں تقریباً تین برس سے کچھ کم عرصہ تک ان کا قیام رہا۔ یہیں انہوں نے وہ تاریخی خطوط قلم بند کیے جو بعد ازاں " غبار خاطر " کے عنوان سے شائع ہوئے۔

اپریل 1945 میں مولانا کو احمد نگر سے بانکورہ منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت ان کی صحت گر چکی تھی وزن چالیس پاؤنڈ گھٹ گیا تھا اور بھوک غائب ہو چکی تھی۔ بالآخر دو سال نو مہینے اسیر رہنے کے بعد انہیں 15 جون 1945 کو رہا کر دیا گیا تاکہ وہ شملہ کانفرنس میں حصہ لے سکیں جو ہندوستان کے آئینی مسئلہ کو حل کرنے کی غرض سے منعقد کی جارہی تھی۔ کانگریس نے مولانا کو اپنے واحد نمائندہ اور ترجمان کی

حیثیت سے شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے نامزد کیا۔ مذاکرات کے دوران جو تجاویز برطانوی حکومت کی جانب سے پیش ہوئیں وہ کرپس کی پیشکش سے مماثل تھیں تاہم بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر جب کہ جنگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آرہا تھا مولانا نے انہیں منظور کر لیا۔

وائس رائے نے الیکشن کا اعلان کر دیا تھا مولانا نے کانگریس کو انتخابات میں حصہ لینے پر رضامند کر لیا۔ مولانا کی دوراندیشی کام آئی اور تین صوبوں کے علاوہ تمام صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہوئی۔ بنگال میں مسلم لیگ نے نصف نشستیں حاصل کیں اول مجلس قانون ساز میں وہ سب سے بڑی جماعت ٹھہرائی گئی۔ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ برابر کی حصہ دار رہیں۔ سندھ میں اگرچہ مسلم لیگ کو بیشتر نشستیں ملیں تاہم وہ اکثریت سے محروم رہی۔ انتخابات کے بعد مولانا کا بیشتر وقت مختلف صوبوں میں حکومت سازی کے اہتمام میں گزرا۔ انہوں نے بہار میں کانگریسی رہنماؤں کے اختلافات ختم کرائے اور ان میں اتحاد قائم کر کے وہاں بحسن وخوبی وزارت تشکیل کرائی۔ اسی طرح پنجاب میں کانگریس اور یونینسٹ پارٹی کی مخلوط حکومت بنوائی۔ کانگریس پنجاب میں پہلی بار وزارت میں حصہ دار بنی۔ اسی زمانہ میں مولانا نے بحری فوج کے افسروں کی بغاوت کو فرو کرنے کے سلسلہ میں نمایاں کردار ادا کیا اور سیاسی قیدیوں کو رہا کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ ساتھ ہی آزاد ہند فوج کے افسروں پر مقدمہ کے دوران ان کی رہائی کے لیے انہوں نے کوششیں کیں اور ان کے قانونی دفاع کا انتظام کیا۔ انجام کار سبھی افسر رہا کر دیے گئے۔

وزیر اعظم اٹیلی نے برطانوی کابینہ کے تین ممبروں پر مشتمل ایک وفد ہندوستان بھیجا تو مولانا نے کانگریس کے نمائندہ کی حیثیت سے اس سے ملاقات کی۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کے سلسلے میں مولانا نے مشن کے ممبروں کو مشورہ دیا کہ ہندوستان کا آئین وفاقی ہونا چاہیے جس میں صوبوں کو حتیٰ الامکان خود مختاری حاصل ہو مگر مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم واضح ہو۔ مرکز کو کم سے کم اختیارات حاصل ہوں اور ایک ایسی اختیاری فہرست مرتب کی جائے جس کے موضوعات پر دونوں کو قانون سازی کا حق حاصل ہو۔ اگرچہ مولانا نے اس سلسلے میں اپنے رفقا سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا تاہم مشن کو اپنی تجویز سے آگاہ کر دیا تھا۔ تجویز سنتے ہی وزیر ہند پیتھک لارنس نے مولانا سے کہا "درحقیقت آپ تو فرقہ وارانہ مسئلہ کا ایک بالکل نیا حل تجویز کر رہے ہیں" بعد ازاں کانگریس کے دوسرے رہنما اور مہاتما گاندھی نے بھی مولانا کے خیالات سے اتفاق کیا۔ 16 مئی کو مشن نے اپنی تجاویز کا اعلان کر دیا ہوں جو بڑی حد تک مولانا کے فارمولے کا احاطہ کرتی تھیں۔ مولانا نے کانگریس سے اسے منظور کر لینے پر اصرار کیا۔ پہلے ورکنگ کمیٹی نے اسے منظور کیا اور پھر آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے۔ اگرچہ بائیں بازو کے رہنماؤں نے پلان پر خاصی تنقید کی مگر مولانا نے پلان کی ممتاز خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اسے کانگریس کی سب سے بڑی فتح سے تعبیر کیا کیونکہ اس پر عمل پیرا ہو کر ہندوستان اپنے آپ کو بغیر کسی خون خرابہ کے آزادی کی دہلیز پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ مولا کے نزدیک پلان کانگریس کے مطالبات پر مبنی تھا۔ انجام کار کانگریس نے پلان کو منظور کر لیا۔ یہ مولانا آزاد کی قیادت کا آخری زمانہ تھا کیونکہ اس کے بعد انہوں نے سات سال تک صدارت اور قیادت کے فرائض انجام دینے کے بعد خود کو اس سے سبک دوش کرا لیا اور جواہر لال نہرو ان کے جانشین منتخب ہوئے۔

مولانا آزاد 1940 سے 1946 تک کانگریس کی مسند صدارت پر متمکن رہے یہ اعزاز ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں صرف مولاناہی کو حاصل ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس پورے عرصے کو مولاناہی کی قیادت کے دور سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ ان کے عہدِ صدارت میں انفرادی "ستیہ گرہ اور ہندوستان چھوڑو" نامی دو تحریکیں چلائی گئیں۔ کانگریس کے رہنماؤں نے قربانیاں دی اور قید و بند کی صعوبتیں سہیں، کرپس اور کابینہ مشن کے ممبروں سے مذاکرات ہوئے، شملہ کانفرنس منعقد ہوئی اور مشن کا پلان منظور ہوا۔ اس پورے دور پر مولاناہی کا اثر غالب رہا۔ بعد ازاں مولانا کو راجندر بابو اور سردار پٹیل کے ساتھ ایک پارلمانی سب کمیٹی کا ممبر بنایا گیا جس نے عبوری حکومت کی تشکیل میں پنڈت نہرو کی مدد کی۔ اگرچہ پنڈت جی مولانا کو اپنی عبوری حکومت کا رکن بنانا چاہتے تھے مگر انہوں نے حکومت سے باہر رہ کر ہی ملک و قوم کی خدمت کو فوقیت دی وہ آئین ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوگئے ہیں تاہم وہ زیادہ عرصہ تک باہر نہیں رہ سکیں اور 1947 میں تعلیم کے ممبر کی حیثیت سے انہیں حلف لینا پڑا۔ اور حصولِ آزادی کے بعد بھی اپنی وفات تک وزیر تعلیم رہے۔

13.5 تقسیم ہند اور مولانا آزاد کا موقف

مولانا آزاد تقسیم ہند کے شدید مخالف تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد و اتفاق اور قومی یکجہتی کے علمبردار تھے۔ ان کا ایقان تھا کہ ہندو اور مسلمان مذہبی اعتبار سے الگ الگ ہونے کے باوجود ایک قوم ہیں۔ وہ ملک کی تقسیم کو خصوصا مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا:

> "اعتراف کرنا چاہیے کہ مجھے تو پاکستان کی اصطلاح ہی متضاد معلوم ہوتی ہے۔ یہ ظاہر کرتی ہے کہ دنیا کے کچھ حصے پاک ہیں اور دوسرے ناپاک۔ پاک اور ناپاک کی یہ ارضی تقسیم نہ صرف غیر اسلامی ہے بلکہ اسلام کی روح کے منافی بھی۔ اسلام کسی ایسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ خود پیغمبر اسلام نے فرمایا ہے کہ، خدا نے پوری دنیا کو میرے لیے مسجد بنایا ہے۔۔۔ مزید برآں پاکستان کی تجویز شکست خوردگی کی علامت نظر آتی ہے اور ایک قومی وطن کے قیام کے متعلق یہودیوں کے مطالبہ سے مماثلت رکھتی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے کہ ہندوستانی مسلمان پورے ہندوستان پر اپنا حق نہ سمجھ کر محض اس کے ایک گوشہ میں خود کو محدود کر کے مطمئن ہو جانا چاہتے ہیں۔ کسی شخص کو ایک قومی وطن کے قیام کے سلسلے میں یہودیوں کی امنگوں سے ہمدردی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ دنیا بھر میں بکھرے ہوئے ہیں اور کسی بھی علاقے کے انتظامیہ میں کوئی موثر آواز نہیں رکھتے ہیں مگر ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت اس کے برعکس ہے۔ تعداد اور معیار دونوں ہی کے اعتبار سے نو کروڑ کی تعداد میں وہ ہندوستانی زندگی کا کافی اہم عنصر ہیں جو انتظامی امور اور پالیسی کے معاملات میں فیصلہ کن طریقے سے اثر انداز ہوئے ہیں۔ کچھ علاقوں میں مرکوز کر کے قدرت نے ان کی مزید امداد کی ہے۔۔۔ اس سیاق و سباق میں پاکستان

کے مطالبہ کی قوت ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں ایک لمحے کے لیے بھی پورے ہندوستان پر سے اپنی ملکیت اور سیاسی اور اقتصادی زندگی میں اس کی تشکیل کے حق سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یقینی طور پر میرے لیے یہ بزدلی کی علامت ہے کہ میں اس سے دست کش ہو جاؤں جو میرا اجدی ترکہ ہے اور محض اس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے سے خود کو مطمئن کرلوں۔"

اس طرح مولانا نے حقیقت کی روشنی میں صورتِ حال کا تجربہ کرتے ہوئے ہیں پاکستان کے قیام کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ بتایا۔ وہ مسٹر جناح کے دو قومی نظریے کے مخالف تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے مطالبہ کو ہر نقطہ نظر سے پرکھا اور کہا:

"اگر یہ بتایا جاسکتا کہ پاکستان کا منصوبہ کسی بھی طرح مسلمانوں کے مفاد میں ہے تو میں خود اسے تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاؤں گا اور دوسروں سے بھی اسے قبول کرنے کے لیے کہوں گا لیکن صداقت تو یہ ہے کہ جب میں خود مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مفادات کے نقطہ نظر سے بھی اس کا جائزہ لیتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے مجبور ہوں کی یہ نہ تو کسی طرح ان کے لیے سود مند ہے اور نہ ہی ان کے خوف کو رفع کر سکتا ہے۔"

مولانا نے لوگوں کو مسلم لیگ کے نتائج سے باخبر کرتے ہوئے کہا:

"ہمیں غیر جذباتی ہو کر ان اثرات پر غور کرنا چاہیے جو پاکستان کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے پر ظاہر ہوں گے۔ ہندوستان کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ ان میں سے ایک ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی تو دوسری میں ہندوؤں کی۔ ہندوستان کی ریاست میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان رہ جائیں گے جو چھوٹی اقلیتوں کی شکل میں سارے ملک میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یوپی میں 17 فیصد، بہار میں 12 فیصد اور مدراس میں 9 فیصد ہو کر وہ ہندو اکثریتی صوبوں میں آج کی نسبت وہ مزید کمزور ہو جائیں گے جو تقریباً ایک ہزار سال سے ان علاقوں میں مقیم ہیں اور وہاں انہوں نے مسلم ثقافت اور تہذیب کے مرکز قائم کیے ہیں۔۔۔ رات بھر کی نیند سے بیدار ہونے وہ پائیں گے کہ وہ اجنبی اور غیر ملکی بن گئے ہیں۔ صنعتی، تعلیمی اور اقتصادی طور پر پسماندگی کا نشانہ بن کر وہ محض اس کے رحم و کرم پر ہوں گے جو اس وقت خالصتاً ہندو راج بن چکا ہو گا۔ دوسری طرف ان کی حیثیت پاکستانی ریاست میں بھی کمزور ہو گی ہندوستانی ریاست کی ہندو اکثریت سے پاکستان میں کہیں بھی ان کی اکثریت سے مقابلہ نہیں کیا جائے گا۔ درحقیقت ان کی اکثریت اتنی کم ہو گی کہ ان علاقوں میں غیر مسلموں کی اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی قیادت کے تلے دب جائے

گی۔ اگر ایسا نہ ہوا اور پاکستان مکمل طور پر مسلم آبادی پر مشتمل رہا تب بھی وہ مسلمانوں کے
مسائل کو سلجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔۔۔"

صورتِ حال کا یہ تجزیہ صداقت اور حقیقت پر مبنی تھا۔ دراصل تقسیم ہند کے بعد وہی تمام واقعات ملک میں رونما ہوئے جن کا اندیشہ مولانا کو حصول آزادی سے قبل تھا۔ ان کی دوررس نظریں مستقبل کے نقشہ کو دیکھ رہی تھیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے وائسرائے بننے کے بعد جب ملک کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو مولانا کو شدید صدمہ پہنچا۔ 14 جون 1947 کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے تقسیم کی تجویز پر غور کیا۔ مولانا نے اپنی معرکہ آرا تقریر میں تقسیم کو ملک کی بدنصیبی سے تعبیر کیا۔ انہوں نے کہا" ہندوستان کی تقسیم ایک المیہ تھی۔۔۔ ہم نے تقسیم کو ٹالنے کی بے پناہ کوشش کی مگر ہم ناکام رہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قوم ایک ہے اور اس کی ثقافتی زندگی بھی ایک ہے اور ہمیشہ ایک رہے گی۔ ہم سیاسی طور پر ناکام ہوئے ہیں اور اسی لیے تقسیم کو منظور کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس تیقن کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہماری ثقافت تقسیم نہ ہو۔ اگر ہم پانی میں ایک چھڑی ڈالیں تو ایسا معلوم ہو گا کہ پانی تقسیم ہو گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ پانی ایک ہی رہتا ہے اور جب چھڑی نکال لی جائے تو پانی کی تقسیم تک غائب ہو جاتی ہے۔" بہت سے ممبروں نے تجویز کی مخالفت کی۔ ای۔ ڈبلیو۔ آر۔ لمبی کے الفاظ میں تقسیم ہند کی تجویز کی مخالفت خصوصی طور سے قوم پرور مسلمانوں کی جانب سے ہوئی جنہیں یہ احساس تھا کہ کانگریس نے انہیں نیچا دکھایا ہے" اور یہ تمام قوم پرور مسلمان یا تو مولانا آزاد کے پیرو تھے یا ان کے زیر اثر تھے۔ جب ووٹ لیے گئے ہیں تو 157 ممبر اس کی موافقت میں، 29 نے اس کی مخالفت میں ووٹ دیے اور 32 ممبروں نے ووٹ نہیں دیے وہ غیر جانبدار رہے۔

اس طرح مولانا آزاد کی زندگی کا وہ سفر جو انہوں نے موجودہ صدی کے دوسری دہائی کے آغاز میں صحافت سے شروع کیا تھا، تقسیم وطن اور طلوع آزادی پر ختم ہو گیا اور تقریباً پینتیس برسوں پر محیط ان کے جدوجہد تاریخ کا ایک حصہ بن کر آنے والی نسلوں کے لیے وراثت بن گئی۔

13.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مولانا آزاد کا شمار ملک کے عظیم رہنما، مدبّر سیاست داں اور مختلف الجہات شخصیت میں ہوتا ہے۔ وہ عالمِ دین، مفسر قرآن، مفکر، بے باک صحافی، صاحبِ طرز ادیب، صفِ اوّل کے قائد، بے مثال مقرر، جنگِ آزادی کے میر کارواں، جدید ہندوستان کے معمار اوّلین کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔
- مولانا ابوالکلام آزاد نے جنگ آزادی میں تقریباً دس برس سات ماہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ سیاسی میدان میں جن باتوں کو انھوں نے اپنایا اس پر تادمِ زیست قائم ودائم رہے۔ ان میں ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے بنیادی اصول شامل ہیں۔

- 1905ء میں جب مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو مولانا آزاد نے اس دو قومی نظریے کی پرزور مخالفت کی۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان دیگر برادران وطن کے دوش بدوش چل کر ان مراحل سے عہدہ برآ ہوں جن سے وہی نہیں بلکہ پورا ملک دوچار ہو رہا ہے۔
- آزادی کی جدوجہد میں مولانا آزاد کی ملاقات شیام سندر چکرورتی سے ہوئی جو آزادئ وطن کے لیے انقلابی اقدامات کے حامی تھے اور ان کا خیال تھا کہ مسلمان انگریز دوست ہیں اور وہ مسلم رہنماؤں کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مولانا سے ملاقات کے بعد شیام سندر چکرورتی نے اپنے رویّہ میں تبدیلی کی۔
- مولانا آزاد کی ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں رائیگاں نہ گئیں ان کی کوششوں کی بدولت ہندو انقلابیوں کے ساتھ مسلمان انقلابی آ ملے اور وہ بدگمانیاں دور ہونے لگیں جو ملک کے ان دو فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے سے روکتی تھیں اور بڑی حد تک غیر ملکی حکمرانوں کی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھیں۔
- مولانا آزاد نے 1908ء کی ابتدا میں ترکی، شام اور مصر کا دورہ کیا اور وہاں کے جمہوریت پسند اور آزادی کے متوالوں سے متعارف ہوئے اور تعلق پیدا کیا۔
- مولانا آزاد ابتدا ہی سے جنگ آزادی کے حصول میں ہندو مسلم اتحاد کے علم بردار رہے، یہی احساس تھا جس کو ہر آدمی تک پہونچانا ان کا مقصود تھا۔
- مولانا نے 1912ء میں کلکتہ سے اپنا اخبار الہلال نکالا۔ اس اخبار کو اردو داں طبقے بالخصوص پڑھے لکھے مسلمانوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور بہت ہی قلیل مدّت میں ہزاروں دلوں میں جذبۂ آزادی کی دبی چنگاریاں شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں۔
- مولانا کی ضربِ مسلسل نے الہلال اور البلاغ کے ذریعہ امّتِ مسلمہ کو یہ باور کرایا کہ آزادی کی جدّوجہد ان کا دینی وملّی فریضہ ہے۔ ہندوؤں کے لئے ملک کی آزادی کے لئے کوشش کرنا حبُّ الوطنی میں داخل ہے مگر مسلمانوں کے لئے یہ ایک دینی فریضہ ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔
- مولانا آزاد غالباً پہلے عظیم مسلم رہنما ہیں جنھوں نے پوری قوّت کے ساتھ متحدہ قومیت کا تصوّر پیش کیا اور اسے عوام الناس میں ترویج واشاعت کے لئے اپنی تمام تر دینی وعلمی اور استدلالی صلاحیتیں صرف کر دیں۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے عالمگیر انسانی اخوّت ومساوات پر بھی زور دیا۔
- ترک موالات کے سلسلے میں مولانا آزاد کی صدارتی تقریر کو حکومت نے ایک کھلا ہوا چیلنج سمجھا اور دسمبر 1921 میں مولانا کو گرفتار کر لیا گیا اور دیش بندھو چترنجن داس کے ساتھ پریزیڈنسی جیل علی پور میں قید کر دیا۔
- فروری 1922 میں مولانا کو ایک سال کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ فیصلہ سننے کے بعد مولانا نے مسکراتے ہوئے مجسٹریٹ سے کہا کہ "یہ سزا تو بہت کم ہے اور میری توقع کے خلاف بھی۔" یہ مولانا کی دوسری اسارت تھی۔
- جولائی 1926ء میں پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ مل کر ایک غیر سیاسی انجمن بنائی جس کا نام انڈین نیشنل یونین رکھا گیا۔ اس

انجمن کا مقصد ایسے روشن خیال اشخاص کو منظم کرنا تھا جن کے نزدیک فرقہ واریت قوم پروری ی دشمن تھی اور جو فرقہ وارانہ تنازعات کو سیاسی، اقتصادی اور سماجی تباہ کاری کا سبب خیال کرتے تھے۔

- اس یونین کے ذریعہ مولانا آزاد اور موتی لال نہرو نے ملے جلے بورڈ بنائے تاکہ مختلف فرقوں کے درمیان باہمی اختلاف رفع ہو سکیں۔
- 12 مارچ 1930ء کو مہاتما گاندھی کا تاریخی ڈانڈی مارچ شروع ہو کر 6 اپریل کو ختم ہوا۔ انہوں نے نمک کا قانون توڑ کر ملک بھر کو قانون شکنی کے لیے تیار کیا۔ اس کے رد عمل کے طور پر حکومت نے ہندوستان کے رہنماؤں کو جیلوں میں بھرنا شروع کر دیا۔ مولانا آزاد ستیہ گرہی کی حیثیت سے میرٹھ میں گرفتار کر لیے گئے۔
- مولانا آزاد کی رہائی 1931ء میں عمل میں آئی جو گاندھی ارون پیکٹ کا نتیجہ تھی۔ رہائی کے فوراً بعد مولانا نے کراچی میں جمیعۃ العلما کے اجلاس کی صدارت کی جو کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ہی منعقد کیا گیا تھا۔
- مولانا ہی کی کوششوں کے نتیجے میں 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد کانگریس نے پہلی مرتبہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے لیے الیکشن میں حصہ لینا منظور کیا۔
- مولانا آزاد مارچ 1940ء میں دوبارہ کانگریس کے صدر بنائے گئے۔ پہلی مرتبہ 1923ء میں خصوصی اجلاس کی صدارت کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی تھی۔ 20 مارچ کو بہار میں واقع رام گڑھ نامی مقام پر کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔
- مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے خطبہ صدارت میں مسلمانوں کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا وہ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں اور آج بھی بڑی معنویت رکھتے ہیں۔
- ہندوستانی رہنماؤں سے ملکی مسائل پر تبادلہ خیال کے لیے برطانوی حکومت نے مارچ 1942 میں اپنے نمائندہ سر اسٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیجا۔ سر کرپس نے مولانا سے 29 مارچ سے 9 اپریل تک ملاقاتیں کیں۔ کیونکہ کانگریس نے مولانا کو سر کرپس کے ساتھ مذاکرات کے لیے اپنا واحد نمائندہ نامزد کیا تھا۔ مولانا کی سفارش پر کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کرپس پیشکش کو مسترد کر دیا۔
- کانگریس نے 8 اگست 1942 کو بمبئی میں مولانا آزاد کی صدارت میں ہندوستان چھوڑو تحریک کی قرارداد پاس کی۔
- اس کے نتیجے میں تمام رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مہاتما گاندھی کو پونا کے آغا خان پیلس میں قید کر دیا گیا اور مولانا آزاد اپنے دوسرے رفقا کے ساتھ احمد نگر کے تاریخی قلعہ میں مقید کر دیے گئے۔ جہاں تقریباً تین برس سے کچھ کم عرصہ تک ان کا قیام رہا۔ یہیں انہوں نے وہ تاریخی خطوط قلم بند کیے جو بعد ازاں "غبار خاطر" کے عنوان سے شائع ہوئے۔
- اپریل 1945 میں مولانا کو احمد نگر سے بانکورہ منتقل کر دیا گیا۔ بالآخر دو سال نو مہینے اسیر رہنے کے بعد انہیں 15 جون 1945 کو رہا کر دیا گیا تاکہ وہ شملہ کانفرنس میں حصہ لے سکیں جو ہندوستان کے آئینی مسئلہ کو حل کرنے کی غرض سے منعقد کی جا رہی تھی۔
- مولانا آزاد 1940 سے 1946 تک کانگریس کے صدر کی حیثیت سے ذمہ داری نبھائی۔ ان کے عہدِ صدارت میں انفرادی "ستیہ

گرہ اور ہندوستان چھوڑو" نامی دو تحریکیں چلائی گئیں۔ کانگریس کے رہنماؤں نے قربانیاں دی اور قید و بند کی صعوبتیں سہیں۔

- مولانا آزاد کی زندگی کا وہ سفر جو انہوں نے موجودہ صدی کے دوسری دہائی کے آغاز میں صحافت سے شروع کیا تھا، تقسیم وطن اور طلوع آزادی پر ختم ہو گیا اور تقریبا پینتیس برسوں پر محیط ان کے جدوجہد تاریخ کا ایک حصہ بن کر آنے والی نسلوں کے لیے وراثت بن گئی۔
- لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے وائسرائے بننے کے بعد جب ملک کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو مولانا کو شدید صدمہ پہنچا۔ 14 جون 1947 کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے تقسیم کی تجویز پر غور کیا۔ مولانا نے اپنی معرکہ آرا تقریر میں تقسیم کو ملک کی بدنصیبی سے تعبیر کیا۔

13.7 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
مختلف الجہات	:	کئی اطراف رکھنے والے، مختلف سمتوں والے
میر کارواں	:	قافلہ کا لیڈر، قائد
تادم زیست	:	زندگی بھر، پوری زندگی
مشترکہ تہذیب	:	ایک سی بود و باش، یکساں رکھ رکھاؤ
متحدہ قومیت	:	قومیت کا اجتماعی تصور
تشخص	:	انفرادیت، امتیاز، خود شناسی
سیم وزر	:	سونا چاندی
مصائب	:	آفتیں، تکلیفیں
منظم	:	دھاگے لڑی میں مسلسل پرویا ہوا، یکجا کیا ہوا
عہدہ برآ ہونا	:	ذمہ داری پوری کرنا۔ وعدہ پورا کرنا
ادراک	:	عقل کے ذریعہ جاننا یا دریافت کرنا۔ شعور
عقلی استدلال	:	کسی چیز کی معرفت اور اثبات کے لئے عقل استعمال کرنا
تیز گام	:	تیز رفتار، جلد جلد قدم اٹھانے والا
تفرقہ	:	نااتفاقی۔ پھوٹ ڈالنا۔ نفاق

گامزن	:	تیزی کے ساتھ چلنے والا۔ تیز رو
حبّ الوطنی	:	وطن سے محبت، وطن دوستی، وطنی پرستی
بیّن ثبوت	:	وہ گواہی جس سے کسی بات کا درست ہونا واضح ہو جائے۔
انسانی اخوت	:	انسانی بھلائی، بھائی چارہ
زیاں	:	نقصان

13.8 نمونہ امتحانی سوالات

13.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کی جائے پیدائش بتایئے؟
2. مسلم لیگ کا قیام کس سن میں عمل میں آیا؟
3. مولانا آزاد نے کس عمر میں صحافت میں قدم رکھا؟
4. الہلال کب جاری کیا؟
5. مولانا آزاد کو البلاغ کو جاری کے جرم میں کس سن میں نظر بند کیا گیا؟
6. ترک موالات کے سلسلے میں مولانا آزاد نے کس حیثیت سے تقریر کی؟
7. دیش بندھو چترنجن داس کے ساتھ مولانا کو کس جیل میں رکھا گیا؟
8. مولانا آزاد کانگریس کے پہلی مرتبہ صدر کب بنائے گئے؟
9. گاندھی جی نے ڈانڈی مارچ تحریک کب شروع کی؟
10. مولانا آزاد نے "غبار خاطر" کہاں لکھی؟

13.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. صحافت سے مولانا آزاد کا مقصد ملک و قوم کی خدمت اور رہبری تھی وضاحت کیجیے۔
2. مولانا نے الہلال کب نکالا، اور اس کا مقصد کیا تھا؟ بیان کیجیے۔
3. مولانا نے البلاغ کب اور کیوں نکالا وضاحت کیجئے۔
4. مولانا آزاد نے مسلم لیگ کی مخالفت کیوں کی، مختصر نوٹ لکھیے۔

5. مولانا آزاد نے ترکی، مصر اور شام کا دور کیا وہاں کے جمہوریت پسند اور آزادی کے متوالوں سے متاثر ہوئے ان کے بارے میں مختصراً لکھیے۔

13.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. بحیثیت کانگریس کے صدر مولانا آزاد کی خدمات کو بیان کیجیے۔
2. جدوجہد آزادی میں مولانا آزاد کے کردار پر روشنی ڈالیے۔
3. مولانا آزاد ہندوستان کی تقسیم کی کیوں مخالفت کرتے تھے، بیان کیجیے۔

13.9 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. مولانا ابوالکلام آزاد، شخصیت، سیاست اور پیغام	رشید الدین خاں
2. ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت	رشید الدین خاں
3. مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے	خلیق انجم
4. کچھ ابوالکلام کے بارے میں	مالک رام
5. مولانا آزاد کے مراسلات کا کیلنڈر	پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین

اکائی14: مولانا آزاد اور متحدہ قومیت

اکائی کے اجزا

14.0		تمہید
14.1		مقاصد
14.2		قوم، قومیت اور قوم پرستی
14.3		متحدہ قومیت کا مفہوم
14.4		مولانا آزاد اور متحدہ قومیت
14.5		اکتسابی نتائج
14.6		کلیدی الفاظ
14.7		نمونہ امتحانی سوالات
	17.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	14.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	14.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
14.8		تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

مولاناابوالاکلام آزاد (1958-1888) ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے ۔ ان کی ذات گو ناگوں کمالات اور مختلف النوع خصوصیات سے عبارت تھی۔ ان کی تحریریں ان کی تقریروں کی طرح بہت متاثر کن ہوتی تھیں۔ کانگریس کے جلسوں اور دیگر عوامی اجلاس میں ان کی تقریریں عوام کو مسحور کر دیتی تھیں۔ مسئلہ خلافت کے بارے میں مولانانے جو تقریریں کیں ان کا مرکزی نقطۂ نظر قومی یکجہتی اور متحدہ قومیت تھا۔ 1921ء کے جلسہ منعقدہ آگرہ کے خطبۂ صدارت میں فرماتے ہیں۔

"ہندوستان کے لیے، ہندوستان کی آزادی کے لیے صداقت و حق پرستی کے بہترین فرائض ادا کرنے کے لیے ہندوستان کے ہندو مسلمان کا اتفاق اور ان کی یکجہتی ضروری ہے۔"

ایک جید عالم ہونے کے باوجود سیکولرزم میں آزاد کا یقین پختہ تھا۔ ان کو مکمل اعتماد اور یقین تھا کہ مسلمان اور ہندو، دونوں ایک آزاد اور سیکولر ملک، ہندوستان میں محبت اور بھائی چارے کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ مولانا آزاد کی فکر میں انقلاب جوانی کے ایام میں ہی آیا۔ پان اسلامزم کی جگہ ہندوستانی قومیت کی اہمیت کا ان کو جلد ہی اندازہ ہو گیا۔ مولانا آزاد نے عدم تعاون تحریک کے دوران نہایت اہم کردار ادا کیا اور جلد ہی انڈین نیشنل کانگریس کے سیشن کی قیادت و صدارت کی۔ مولانا آزاد آزادی و اتحاد کی تحریک کے پر جوش اور سرگرم داعی تھے۔ وہ برابر آزادی و حریت کی آواز بلند کرنے اور ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دینے میں لگے رہے اور انگریزوں کے جبر و تشدد اور ان کی چیرہ دستیاں بھی ان کو اس راہ سے برگشتہ نہ کر سکیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد بلا شبہہ جدید ہندوستان کی ایک ممتاز، تاریخ ساز اور قابل قدر ہستی تھے۔ انہوں نے ہندوستانیوں کے لیے سیکولرزم اور متحدہ قومیت کا جو راستہ متعین کیا تھا وہ اس پر اولوالعزمی کے ساتھ گامزن رہے۔ مولانا آزاد جمہوری نظام میں مسلمانوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کے لیے پوری طرح فکر مند تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندو مسلم اتحاد، متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے بھی علمبردار تھے۔ انہوں نے ایک ایسی راہ کی نشان دہی کی تھی جو بلا تفریق تمام ہندوستانیوں کے لیے امن و آشتی کی راہ تھی مگر بدقسمتی سے بعض مسلمانوں نے انہیں کانگریس کا شوبوائے قرار دیکر اپنی تنگ نظری کا ثبوت دیا اور کانگریس نے ان کے قیمتی مشوروں کو نظر انداز کر کے ان کے متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔

مولانا آزاد ہندو مسلم اتحاد کو ہر مقصد سے بالاتر رکھتے تھے یہاں تک کہ سوراج کو اس پر ترجیح دیتے تھے اکتوبر 1924ء میں انہوں نے فسادات کے خلاف مہاتما گاندھی کے برت کے دوران منعقدہ اتحاد کانفرنس میں حصہ لے کر مہاتما جی کو ہندو مسلم اتحاد کے لیے جان و دل سے کام کرنے کا یقین دلایا اس یقین دہانی کے بعد ہی مہاتما جی نے اپنا برت ختم کیا۔ 1925ء میں انہوں نے آل انڈیا پارٹیز کانفرنس میں شرکت کی اور جمیعۃ العلماء کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے بدیسی کپڑے کا بائیکاٹ کرنے اور اور ہاتھ سے کاتے گئے سوت کا کپڑا بن کر پہننے کی تلقین کی۔ اس پورے عرصے میں ان کا پیغام یہی رہا کہ "صرف باہمی میل ملاپ اور بھائی چارے ہی کے ذریعے ہندوستان آزاد ہو کر پنپ سکتا ہے"۔ مولانا آزاد نے ہندوستان کو ایک قوم سمجھا جس کے اتحاد کے لیے انہوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی پیداوار برٹش ڈپلومیسی کا ایک کرشمہ ہے اس لیے وہ برطانوی سامراج کے خلاف تھے۔

اس اکائی میں ہم مولانا آزاد کے متحدہ قومیت کے تصور کا ذکر کریں گے اور ہندوستانی قومیت کے استحکام، فرقہ وارانہ ہم آہنگی و اتحاد کے لیے کی گئی ان کی کوششوں کا جائزہ لیں گے۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- جنگ آزادی کے عظیم مجاہد اور جدید ہندوستان کے اہم معمار مولانا ابوالکلام آزاد کے تصور قومیت پر روشنی ڈال سکیں۔

- آزاد ہندوستان میں قومی یکجہتی کے مسئلے کے حل کے بارے میں تجاویز پیش کر سکیں۔
- متحدہ قومیت، قوم اور قوم پرستی کے بارے میں اظہار خیال کر سکیں۔

14.2 قوم، قومیت اور قوم پرستی

لفظ قوم انگریزی کے لفظ نیشن (Nation) کے معنی کا مترادف ہے انگریزی زبان میں نیشن اس جماعت یا گروہ کے ہیں جو ایک مذہب رکھتے ہوں، ایک زبان بولتے ہوں، ایک خطۂ زمین پر بستے ہوں جن کے رسم و رواج ایک ہوں۔ آپس میں شادی بیاہ کرتے ہوں اور جن کا ایک کلچر اور ایک تہذیب ہو۔ لفظ قوم کی دوسری تعریف درج ذیل جملوں میں اس طرح بھی کی جاسکتی ہے:

"مشترک اغراض اور مصالح کے لیے متعدد افراد آپس میں مل کر تعاون اور اشتراک عمل کرتے ہیں اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس اجتماعی وحدت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ اسی مجموعۂ افراد کا نام "قوم" ہے۔"

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان دو فرقے ہیں اور انہی کو ملا کر ہندوستانی قوم کی تشکیل ہوئی ہے۔ ہندو یا مسلمان ہونا انسان کا ذاتی فعل ہے اور اس کا یہ فعل متحدہ قومیت کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتا۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب انسان کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے الگ نہیں کرتا اور مذہب ذات برادری تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے۔ مذہب کی بناء پر قومیت کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مذہب ان چیزوں سے بلند ہے۔

قومیت دراصل Nationality کا مترادف ہے جو ایک خالص انتظامی اصطلاح ہے۔ مولانا آزاد نے لفظ قومیت کا استعمال قومی احساس کے معنی میں کیا ہے جس کا مقصود تھا وطن دوستی، یعنی اہل وطن کے اجتماعی مفاد اور ان کی مجموعی و عمومی صلاح و فلاح کا احساس و شعور۔ مولانا نے قوم پرستی کے بجائے قومیت لفظ کا استعمال کیا ہے۔ جنگ آزادی کے زمانہ میں وطنیت اور قومیت کے الفاظ بعض اوقات ایک ہی معنی میں استعمال کیے گئے ہیں۔

قومیت انسان کی اجتماعی زندگی کے احساس و اعتقاد کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ یہ انسانوں کے کسی ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے ممتاز کرتی ہے اور اس کے ذریعے اس کی ایک بڑی جمعیت باہم مربوط ہو کر زندگی بسر کرتی نیز یہ اجتماعی زندگی کی کشاکش سے عہدہ برا ہوتی ہے۔

قومیت اور وطنیت انسان کے اجتماعی رشتہ کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ لیکن یہ کوئی مستقل حالت نہیں ہے۔ ایک سلسلۂ دراز کی مختلف کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے۔

نیشن یا وطن بحیثیت سیاسی تصور کے زمین کے علاوہ حسب ذیل عناصر پر مشتمل ہے۔

1۔ نسل 2۔ زبان 3۔ عقیدہ 4۔ تہذیب

نیشن یا قوم کا لفظ دو معنوں میں لیا جاسکتا ہے ایک نظریاتی، دوسرے انتظامی معنی میں ایک ملک کے تمام باشندگان ایک حکومت

کے افراد بن جاتے ہیں یہ گویا ایک جغرافیائی صورت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے "قوم" کا لفظ بالکل غیر سیاسی معنوں میں استعمال کیا ہے جو لسان الصدق مئی 1904ء کے شمارے میں "انجمن حمایت الاسلام" پر ایک تبصرے سے واضح ہے۔ مولانا انجمن کے کارکنوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کے دلوں کو "قومی ہمدردی اور حب الوطنی کے گراں بہا خزانے سے مالا مال بتاتے ہیں" اور کہتے ہیں کہ "قوم کو ایسے ہی گمنام، غریب، معمولی مگر قومی محبت کے نشے سے چور حب الوطنی کے جذبات میں سرشار لوگوں کی ضرورت ہے۔ مولانا آزاد کے یہاں قومی تصور کا مطلب تھا کہ قومی کہلانے کی مستحق وہی چیز ہو گی جس میں تمام فرقوں کی شمولیت ہو۔

> "قومیت کی ابتدا ایک معصوم جذبہ سے ہوتی ہے یعنی اس کا اولین مقصد ہوتا ہے کہ ایک خاص گروہ کے لوگ اپنے مشترک مفاد و مصالح کے لیے عمل کریں اور اجتماعی ضروریات کے لیے ایک "قوم" بن کر رہیں۔ لیکن جب ان میں قومیت پیدا ہو جاتی ہے تو لازمی طور پر "عصبیت" کا رنگ اس میں آجاتا ہے اور جیسے جیسے "قومیت" شدید ہوتی جاتی ہے اسی قدر "عصبیت" میں بھی شدت بڑھتی جاتی ہے۔"

قومیت کا قیام وحدت و اشتراک کی کسی ایک جہت سے ہوتا ہے خواہ وہ کوئی جہت ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ اس میں ایسی زبردست قوت رابطہ و ضابطہ ہونی چاہیے کہ اجسام کے تعدد اور نفوس کے تکثر کے باوجود وہ لوگوں کو ایک کلمہ، ایک خیال، ایک مقصد اور ایک عمل پر جمع کر دے اور قوم کے مختلف کثیر التعداد اجزاء کو قومیت کے تعلق سے اس طرح بستہ و پیوستہ کر دے کہ وہ سب ایک ٹھوس چٹان بن جائیں اور افراد قوم کے دل و دماغ پر اتنا تسلط اور غلبہ حاصل کر لے کہ قومی مفاد کے معاملہ میں وہ سب متحد ہوں۔

بقول مولانا آزاد "قومیت اور وطنیت انسان کے اجتماعی رشتہ کی ایک خاص حالت کا نام ہے لیکن یہ کوئی مستقل حالت نہیں ہے۔ ایک سلسلۂ دراز کی مختلف کڑیوں میں سے ایک کڑی ہے"۔

قومیت کی تشریح اخلاق و ادیان کی دائرۃ المعارف "Encyclopaedia of Religion and Ethics" میں درج ذیل الفاظ میں کی گئی ہے۔

> "قومیت وہ وصف عام یا متعدد اوصاف کا ایک ایسا مرکب ہے جو ایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو اور ان کو جوڑ کر ایک قوم بنا دے۔ ہر ایسی جماعت ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو نسل، مشترک روایات، مشترک مفاد، مشترک عادات و رسوم اور مشترک زبان کے رابطوں سے باہم مربوط ہوتے ہیں اور ان سب سے اہم رابطہ ان کے درمیان یہ ہوتا ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ بلا ارادہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں اور ان کے درمیان مختلف حیثیت سے الفت و موانست ہوتی ہے۔ غیر قوم کا آدمی ان کو غیر اور اجنبی محسوس ہوتا ہے۔ اس کی دلچسپیاں اور اس کی عادت انہیں نرالی معلوم ہوتی ہیں اور ان کے لیے اس کے انداز طبیعت اور اس کے خیالات اور جذبات

کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قدیم زمانہ کے لوگ غیر قوم والوں کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور اسی وجہ سے آج کا مہذب آدمی بھی غیر قوم والے کی عادات اور طرز زندگی کو اپنے مذاق کے خلاف پاکر ناک بھوں چڑھاتا ہے"۔

مولانا آزاد کا تصور قومیت بیک وقت وطن دوستی اور انسان دوستی سے مرکب ہے۔ مولانا آزاد اپنے اسلامی نظریہ حیات کے تحت تمام مخلوقات کو اللہ کا کنبہ تصور کرتے تھے اور عملی طور پر ہندوستان میں یہاں کے تمام فرقوں اور طبقوں کو متحد کر کے حریت، مساوات اور اخوت کی بنیادوں پر ان کی سیاسی، معاشی، تعلیمی اور اخلاقی و سماجی بہبود کے کے لیے کوشاں تھے۔

14.3 متحدہ قومیت کا مفہوم

متحدہ قومیت ایک ایسا تصور ہے، جو یہ استدلال کرتا ہے کہ ہندوستانی قوم مختلف ثقافتوں، ذاتوں، برادریوں اور مسلک کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ نظریہ سکھاتا ہے کہ ہندوستان میں مذہب کے ذریعہ قوم پرستی کی تعریف نہیں کی جاسکتی ہے۔ ہندوستانی شہری اپنی مخصوص مذہبی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے وہ ایک متحدہ ہندوستانی قوم کے رکن ہیں۔ متحدہ قومیت کا تصور ہے کہ برصغیر میں انگریزوں کی آمد سے پہلے مختلف مذہبی عقائد کے لوگوں کے درمیان کوئی دشمنی موجود نہیں تھی۔

متحدہ قومیت (Nationalism) ایک سیاسی اصطلاح ہے جو بالخصوص ہندوستان میں فرقہ واریت (Communalism) کے مقابلہ میں رائج کی گئی ہے۔ کانگریس نے اپنے پہلے اجلاس منعقدہ 1885ء میں اپنا پہلا اور ضروری مقصد حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا تھا۔

"ہندوستان کی آبادی جن مختلف اور متصادم عناصر سے مرکب ہے ان سب کو متحد و متفق کر کے ایک قوم بنانا"۔

پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں۔

"ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا ہو"۔

مہاتما گاندھی لکھتے ہیں۔

" آج مسلمانوں کی الگ تہذیب ہے اور ہندوؤں کی الگ ان دونوں تہذیبوں کے امتزاج سے متحدہ قومیت کی تہذیب مرتب ہوگی"۔

مذکورہ قول سے یہ واضح ہوا کہ متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوگا ایسی تہذیب جو نہ مسلمانوں کی ہو، نہ ہندوؤں کی۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب پیدا ہو۔ اس طرح متحدہ قومیت کے معنی و مفہوم یہ ہوئے کہ ایک ملک میں بسنے والی مختلف قوموں کو وطنیت کی بنیاد پر اس طرح آپس میں ملایا جائے کہ ان کی جداگانہ تہذیب، تمدن، نام، زبان اور مذہب کا وجود برقرار رہے اور وہ سب مل کر ایک ایسے دستور العمل کے ماتحت زندگی بسر کریں جسے اس متحدہ قومیت کی جمہوری حکومت چلائے۔

مولانا آزاد کے متحدہ قومیت کے عناصر و عوامل یکساں اور مساوی طور پر ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ اس سلسلے میں اسلام پر قائم رہتے ہوئے جہاں تک مسلمانوں کی وطن دوستی اور قوم پروری کا تعلق ہے، مولانا آزاد کے بقول "اسلام کی روح" خود اس راہ میں ان کی رہنمائی کرتی ہے اور ملک کی فلاح و ترقی کی جد وجہد میں "اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب سد راہ نہیں ہوتی بلکہ مدد و معاون ہوتی ہے۔ اس لیے ملک میں اس تعلیم، اس تاریخ، ان علوم و فنون اور اس تہذیب کا فروغ بھی اسی وقت ممکن ہے جب ملت اسلامیہ کے افراد اہل ملک کے ساتھ مل کر اپنے قدرتی وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں ہوں۔

متحدہ قومیت کے خلاف جو ہندو اور مسلمان تھے ان کو آگاہ کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا کہ اگر وہ اپنی ایک ہزار برس پرانی تہذیب کو پھر لانا چاہتے ہیں تو یہ ایک خواب سے زیادہ اور کچھ نہیں جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا کیونکہ ہندوستانی ایک قوم بن چکے ہیں جن کے علاحدہ ہونے کا اب کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ مولانا آزاد نے کہا کہ اسلام اور نیشنلزم اور وطنیت ایک ہی چیز ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اسلام اپنے وطن کی آزادی کے لیے قربانی دینے کو منع نہیں کرتا انہوں نے بارہا کہا کہ

"مسلمان ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان کی خدمت ان کا فرض ہے۔"

انہوں نے ہمیشہ یہ نصیحت کی کہ "مسلمان ہندوؤں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں اور اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے معاف کر دیں" انہوں نے اپنے خطبہ میں ہندو اور مسلم فرقہ پرستی کی طاقتوں کو للکارا ہے اور ہندوستان کی متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کی تصدیق کی ہے۔ ان کے نزدیک متحدہ قومیت ہندوستان کا مشترکہ ورثہ تھی جو ناقابل تقسیم تھی۔

14.4 مولانا آزاد اور متحدہ قومیت

مولانا ابوالکلام آزاد ان چند سیاسی شخصیتوں میں سے ایک ہیں جو محض ایک انقلابی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مفکر کی حیثیت سے سیاسی افق پر ابھرے اور ملک گیر پیمانے پر عوام اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے نظریہ سازی کرتے رہے تاکہ مسلمان ایک ایسا موقف متعین کر سکیں جو آزادی وطن کی جنگ میں انہیں پیش پیش رکھے۔ انہوں نے سولہ سال کی عمر میں ایک رسالہ لسان الصدق جاری کیا تھا۔ مولانا آزاد نے 1908ء میں عراق، مصر، شام اور ترکی کا سفر کیا اور وہاں کے روشن خیال مفکروں سے تبادلۂ خیال کیا۔ وہ محمد عبدہ، رشید رضا، جمال الدین افغانی، شاہ ولی اللہ اور عبدالرحیم کی فکر و خیالات سے بے حد متاثر تھے۔ وہ اکبر کی وسعت نظری کے دلدادہ تھے اور دارشکوہ کو بھی اسی وجہ سے پسند کرتے تھے۔

مولانا آزاد سرسید کے سیاسی خیالات سے متفق نہیں تھے۔ اس لیے سیاست میں انہوں نے سرسید سے ہٹ کر اپنی الگ راہ اختیار کی۔ وہ پان اسلامزم میں یقین رکھتے تھے اور مسلمانوں کی تنظیم کے حق میں تھے۔ 1906ء میں وہ مسلم لیگ میں بھی شامل ہوئے لیکن بہت جلد اس سے الگ ہو گئے۔ ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لیے وہ انقلابی تحریکوں اور ان کے بہت سے معروف لیڈروں کے رابطے میں بھی آئے۔ وہ شیام سندر چکرورتی سے بھی متاثر ہوئے جو آربندو گھوش کے ساتھی تھے۔ مولانا آزاد کے انقلابی تحریکوں سے رابطہ کی وجہ سے

مسلمان بھی انقلابی تحریکوں میں شامل ہونے لگے تھے لیکن انقلابیوں کی رجعت پسندی سے مولانا آزاد بد دل ہو گئے اور ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

1912ء سے مولانا آزاد نے الہلال نکالنا شروع کیا جس کا مقصد مسلمانوں کو متحد کرنا سامراجیت اور بیرونی حکمراں کے خلاف جدوجہد اور تحریک چلانا تھا۔ الہلال کے جاری کرنے کے پیچھے سیاسی مقصد کے ساتھ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد بھی تھا۔ 1915ء میں حکومت نے الہلال پر پابندی لگا دی۔ پانچ ماہ کے بعد آزاد نے البلاغ جاری کیا جس کے وہی مقاصد تھے جو الہلال کے تھے۔ 1916ء میں وہ رانچی میں نظر بند کیے گئے۔ 1920ء میں یہاں سے رہائی ہوئی تو مولانا دہلی آئے اور یہیں مہاتما گاندھی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مہاتما گاندھی خلافت تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے۔ مہاتما گاندھی کے کہنے پر مولانا آزاد نے خلافت تحریک چلانے کے لیے عدم تعاون اور عدم تشدد کی ایک تجویز کا مسودہ تیار کیا اور علماء سے اس حق میں ایک فتویٰ جاری کرایا اسی وقت سے مولانا آزاد نے سیکولرزم کی بنیاد پر نیشنلزم کے تصور کو اپنایا اور مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ ملک کی آزادی کے لیے کانگریس میں شمولیت اختیار کریں۔

1921ء میں آگرہ میں مجلس خلافت میں خطبہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا: "الہلال کے پہلے نمبر میں جس بڑے نمایاں مقصد کا اعلان کیا گیا تھا وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتفاق تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرض شرعی ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد و محبت کا پیمان باندھیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن بنائیں"۔

1922ء میں ہندوستان میں بڑے پیمانے پر بلوہ اور فساد ہوا شدھی سنگٹھن اور تبلیغ و تنظیم کی تحریکیں دونوں طرف سے شروع ہوئیں اور ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو گیا تو اس وقت مولانا آزاد بہت مایوس ہوئے۔ 1923ء میں کانگریس کا خصوصی اجلاس ہوا جس کی صدارت مولانا آزاد نے کی جس میں انہوں نے سنگٹھن اور تنظیم تحریکوں پر سخت نکتہ چینی کی اور کہا کہ ملک کو صرف ایک سنگھٹن کی ضرورت ہے اور وہ انڈین نیشنل کانگریس ہے۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ ذرا ذرا سے مقامی مسئلوں کو ہوا نہ دیں۔ انگریزوں سے لڑنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد ضروری تھا اور مولانا اس کی خاطر سب کچھ نثار کرنے کو تیار تھے۔ 1923ء کے صدارتی خطبہ میں مولانا نے کہا:

> "آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کرے کہ سوراج 24 گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا۔ کیوں کہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہو گا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو عالم انسانیت کا نقصان ہو گا"۔

مولانا آزاد ہندو اور مسلمان دونوں کو آپس میں ہمیشہ کے لیے ملا کر انگریزوں کے خلاف اپنے سیاسی ایجنڈہ کو آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ ان کی اسی کوشش میں ہمیں ان کے متحدہ قومیت کا تصور ملتا ہے۔ مولانا آزاد نے ایک موقع پر فرمایا:

"ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرض شرعی ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد

> و محبت کا پیمان باندھیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہو جائیں۔ یعنی ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان، ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ایک قوم اور ایک نیشن بن جائیں۔ اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمد صلعم کی آواز تھی۔ اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا بجنسہ اس کے الفاظ ہیں "انہا امۃ واحدۃ" ہم ان تمام قبیلوں سے جو مدینے کے اطراف میں بستے ہیں، صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر امت واحدہ بننا چاہتے ہیں۔ امۃ کے معنیٰ ہیں قوم اور نیشن، اور واحدہ کے معنیٰ ہیں ایک"۔

مولانا آزاد کی یہ کوشش تھی کہ ہندو اور مسلمان آپس میں ایک سیاسی سماج کی تشکیل کریں جسے صحیح معنوں میں نیشن کہا جاتا ہے۔ ان کی یہ کوشش اچھوتی تھی۔ اس تحریک سے پہلے بھی ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر سیاسی میدان میں قدم رکھا تھا۔ مگر آج تک کسی نے نہیں سوچا تھا کہ مذہب کی رو سے اور تاریخ اسلام کی نظیر کی بنیاد پر ہندوستان کے مختلف مذہبی گروہوں کو سیاسی نظریے کے تحت ایک دوسرے میں ضم ہونے کی دعوت دی جاسکتی ہے۔ یہ کام مولانا آزاد نے کیا۔

1935ء کی دہائی کے نصف آخر تک آتے آتے مولانا آزاد مسلمانوں کی تہذیبی شناخت کو لے کر کافی فکر مند ہوتے ہیں۔ انہیں مسلمانوں کی کلچرل شخصیت کے دھندلا ہو جانے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کھل کر بحث کرتے ہیں کہ ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ قومیت کی بنیاد پر آزادی کی جنگ لڑنا تو ٹھیک ہے مگر اس کوشش میں مسلمانوں کی تہذیبی پہچان کو برقرار رکھنا بھی اہم ہے۔

1940ء کی دہائی شروع ہونے تک مولانا آزاد فکر میں تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی کی بناء پر سیاسی ایکشن کے لیے تیار کیا جائے۔

نیشنلزم، سیکولرزم، متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب سے متعلق مولانا آزاد کا جو تصور تھا وہ ان کے "قول فیصل" سے روز روشن کی طرح واضح ہے جسے انہوں نے علی پور جیل میں 11 جنوری 1922ء کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا۔

> "میں مسلمان ہوں اور مسلم کی حیثیت سے میرے کچھ مذہبی فرائض ہیں۔ اسلام نہ تو تاناشاہی کا قائل ہے اور نہ ہی بیوروکریسی کا۔ اسلام ایک مکمل تنظیم ہے جس میں انفرادی آزادی اور دستوری حد بندی ہے جو بادشاہوں اور بیرونی حکومتوں سے آزادی حاصل کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ بادشاہت میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول چلتا ہے۔ لیکن اسلام اس میں یقین نہیں رکھتا۔ خدا کے علاوہ انسان کسی کا غلام نہیں۔"

یہاں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی نظر میں دنیا کے تمام انسان برابر ہیں۔ پیغمبر اسلام کے مطابق مسلمانوں کو غیر مسلم کا خون بہانا ممنوع ہے کیونکہ غیر مسلم کا خون بھی اتنا ہی قیمتی ہے جتنا مسلم کا، انہوں نے یہ واضح کیا کہ ہندوستان مسلمانوں کو بھی اتنا

ہی پیارا ہے جتنا دیگر مذہب کے ماننے والوں کو۔

مولانا آزاد نیشنلزم کا تصور اسلام کے عصبیت کے تصور سے حاصل کرتے ہیں جس کے تحت انسان کو اپنے عزیز رشتہ دار اور وطن والوں کی حفاظت کرنے کی تلقین ہے، مشکل میں مدد کرنے کی اور جنگ میں حصہ لینے کی تلقین پائی جاتی ہے۔

مسلمانوں کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا:

"غفلت اور سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہو چکیں، اب خدا کے لیے بستر مدہوشی سے سر اٹھا کر دیکھیے کہ آفتاب کہاں تک نکل آیا ہے؟ آپ کے ہم سفر کہاں تک پہنچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں؟ یہ نہ بھولیے کہ آپ اور کوئی نہیں بلکہ مسلم ہیں اور اسلام کی آواز آپ سے آج بہت سے مطالبات رکھتی ہے .....یاد رکھئے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جد وجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر آپ کے لیے فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ"۔

غرض کہ مولانا آزاد نے ہر طرح مسلمانوں کو آزادی کی تحریک میں شامل ہونے اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر ملک کی ترقی میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ مولانا آزاد کہا کرتے تھے کہ ہمیں سب سے پہلے ہندو مسلم اتحاد کی جانب توجہ دینی چاہیے۔ اس نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے ان کے الفاظ ہماری تاریخ کے سنہری حروف بن کر آج بھی چمک رہے ہیں۔

"ہندو مسلم اتحاد ہماری تعمیرات کی وہ پہلی بنیاد ہے جس کے بغیر نہ صرف ہندوستان کی آزادی کی وہ تمام باتیں جو کسی ملک کے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے ہو سکتی ہیں محض خواب و خیال ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ اس کے بغیر ہمیں آزادی نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتے"۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کو عزیز رکھا اور استحکام بخشنے میں پیش پیش رہے۔ وہ اتحاد کو ہر مقصد سے بالاتر رکھتے تھے یہاں تک کہ سوراج پر اسے ترجیح دیتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ اعتقادات کے آپسی نفاق کو عارضی طور پر ملتوی کیا جا سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے گریز نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف عقائد کے ماننے والے بستے ہیں۔ اس لیے آزادی کا حصول تو کچھ عرصے کے لیے ملتوی رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ہندو مسلم میں آپسی نفاق ایک لمحے کے لیے برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ 1920ء میں فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر انہوں نے کہا کہ میں آپ لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے اگر جان دینا بھی ضروری ہو تو جائز ہے۔

مولانا آزاد نے انسانی مساوات کو بڑھاوا دیا اور دنیا کے تمام انسانوں کو امت واحدہ سمجھا اور اسے قرآن مجید اور پیغمبر اسلام کی روایات سے ثابت بھی کیا۔ ملکی پیمانے پر مختلف قوموں میں اتحاد اور عالمی پیمانے پر دنیا کے تمام لوگوں میں باہمی اتفاق مولانا آزاد کی ترجیحات میں سے تھے۔ ان کی سیاسی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی مزاج کے مطابق مذہب کو سیاست کی اساس سمجھا اور متحدہ قومیت

اور سیکولرزم کے تصورات کو فلسفۂ حیات بنانے کی تلقین کی۔ فرماتے ہیں:

"ہم کو ہندوستان میں ایک ممتاز عنصر بن کر تو ضرور رہنا چاہیے لیکن ایک مخالف اور جنگجو عنصر نہ بننا چاہیے بلکہ ہندوستان کی ملی جلی مشترک زندگی میں ایک ممتاز مگر ہم آہنگ جزء کی طرح رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ گویا قومیت کے نظریے کو اس حد تک تسلیم کرنا چاہیے۔ جہاں تک ہمارے ملی خصائص کو محفوظ رکھ کر اسے تسلیم کیا جاسکتا ہے"۔

متحدہ قومیت سے متعلق ابوالکلام آزاد کا درج ذیل قول ملاحظہ کریں۔

"اس ملک میں جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کی حامی کون سی طاقتیں ہیں۔ ان طاقتوں کے ساتھ وہ اس میدان کارزار میں ہمت کے ساتھ کود پڑیں۔ جہاں جمہوریت اور سیکولرزم کے لیے جنگ لڑی جا رہی ہے۔ اس سے متحدہ قومیت کے تصور کو تقویت ملے گی اور ملک کی بھلائی کے ساتھ خود ان کی بھلائی ہوگی علاحدگی پسندی کا رجحان انہیں چھوڑنا ہوگا"۔

مولانا آزاد اپنے سیاسی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے عبدالرزاق ملیح آبادی کو لکھتے ہیں:

"ایک اور بات جس کی طرف مجھے اشارہ کر دینا چاہیے کہ اگر ہم ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو مذہبی جماعتوں کے اتحاد کے ساتھ مختلف صوبوں اور حصوں کی یگانگت کا مسئلہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے، میں سمجھتا ہوں کہ روز بروز ایک نئی تفریق صوبائیت (پراونشیلزم) کی بڑھتی جارہی ہے "مائی انڈیا" کی جگہ "مائی بنگال" کی صدائیں ہمیشہ سنتا رہا ہوں۔ آپ یقین کیجیے کہ یہ چیز آگے چل کر انڈین نیشنلٹی کے لیے مضر ہوگی"۔

مولانا آزاد کے رام گڑھ کے خطبہ کا اقتباس ملاحظہ ہو جس سے متحدہ قومیت کے متعلق مولانا کا نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے۔

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم وفنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے، اسلام کی روح مجھے ان سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ

قومیت کا عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (فیکٹر) ہوں۔ میں اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا"۔

مولانا کے مذکورہ الفاظ میں جس عقیدے کا اظہار ہے اسے ہر ہندوستانی مسلمان کے عقیدے اور اس کی حیثیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس میں اس کی قومیت مضمر ہے اور اس کے اسلامی وجود کی مرکزیت کا احساس بھی اس اقتباس پر غور کریں تو یہ واضح ہے کہ ہندوستانی قوم کا تصور مسلمان کے وجود کے بغیر ممکن نہیں۔

مولانا آزاد ہندوستانی مسلمان تھے، انہوں نے بہت کچھ سوچا، بہت لکھا۔ مکتوب کی شکل میں ان کی جو تحریریں اور تقریریں موجود ہیں ان میں ہم کو فکری مواد ملتا ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتاے کہ وہ افکار و خیالات جن کا تعلق پوری ہندوستانی قوم سے ہے، ہمارا پورا معاشرہ جس میں مختلف مذاہب، زبان و ادب، تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج کے لوگ رہتے بستے ہیں ان سب کے میل جول سے ایک مشترک تہذیب تدریجی طور پر پیدا ہوئی اور سب لوگ ایک متحدہ قومیت کے معنوی رشتہ میں منسلک ہو کر ہندوستانی قوم بن گئے۔

خطبات آزاد میں مولانا آزاد نے متحدہ قومیت کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے اس کے مطالعہ سے متحدہ قومیت سے متعلق ان کا نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔

"ہماری ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قسمت کی اس پر مہر لگ چکی ہے۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علاحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔"۔

یہی قومیت ملک کے تمام باشندوں کے درمیان مشترک ہے، خواہ ان کے عقائد و اطوار کتنے ہی مختلف ہوں اور اسی متحدہ قومیت کی ضرورت تقسیم ہند سے قبل تحریک آزادی کی قومی سیاست کو تھی جس کی علم بردار اس وقت مولانا آزاد کے زیر صدارت آل انڈیا کانگریس کمیٹی تھی۔

مولانا نے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی تسبیح میں پرویا بلکہ ہندوستانی عیسائیوں کو بھی اس میں شامل کر کے اس کا دائرہ وسیع کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ:

"تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا کہ دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس کے باشندوں کا

مذہب رہا ہے تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب رہا ہے۔ جس طرح ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے اور ہندو مذہب کا پیرو ہے ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہب اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اٹھا کر کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں اور باشندگان ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔"

مولانا آزاد وسیع المشربی اور انسانی اقدار پر زور دیا کرتے تھے کیونکہ متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے لیے رواداری، وسیع المشربی اور انسانی اقدار کا پاس لازم ہے۔ سیکولرزم کی اصطلاح بھی اسی کا اٹوٹ حصہ ہے۔ مشترکہ ہندوستانی تہذیب اور متحدہ قومیت کا تصور مولانا آزاد کی اس تقریر سے بھی روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے جو انہوں نے 1940ء میں بحیثیت صدر رام گڑھ کانگریس کے تاریخی اجلاس میں کی تھی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں واضح طور پر کہا کہ:

" تمام احساسات کے ساتھ مجھ میں ایک زبردست احساس یہ بھی موجود ہے جو میری زندگی کے تجربوں نے پیدا کیا ہے اور جس میں اسلام مانع نہیں آسکتا اور جس پر مجھے ناز ہے اور وہ یہ ہے کہ میں ہندوستان میں ہوں ایک ایسی قومیت سے تعلق رکھتا ہوں جس کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا ہے اور جو مشترکہ ہندوستانی تہذیب پر مبنی ہے۔"

انہوں نے مزید کہا کہ ہندو اور مسلم کلچر کے آپسی ربط ضبط سے یہ کلچر پیدا ہوا ہے گیارہ سو سال تک باہمی ربط وضبط اور مشترکہ تاریخ نے ہندوستان کے کلچر کو مشترکہ سرمائے سے مالامال کیا ہے۔ باہمی کارنامے، باہمی زبان، باہمی ادب، کلچر اور فن، ہمارا پہناوا، ہمارے رہن سہن کے طریقے، ہماری رسمیں اور روزآنہ زندگی کی ناقابل فراموش یادیں، ہر چیز پر ہماری آپسی کوششوں کی مہر نظر آتی ہے۔ یہ باہمی دولت ہماری باہمی میراث اور مشترکہ قومیت کی میراث ہے"۔

اسی طرح مسلمانوں کی وطنیت کو پرکھنے کے لیے جو ایک عام سوال کیا جاتا ہے کہ پہلے وہ مسلم ہیں یا ہندوستانی؟ مولانا آزاد اس سوال کو ایک لغو اور بے معنی سوال بتاتے ہیں۔ وہ اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں: "مجھے اپنے ہندوستانی ہونے پر ناز ہے اور میں اپنی اس انوکھی میراث کے لیے لازمی ہوں اور میرے بغیر یہ شاندار ڈھانچہ نامکمل ہے"۔

مولانا آزاد کی سیاسی زندگی میں بڑے ہی طوفان آئے لیکن ان کے پائے استقامت میں جنبش نہ ہوئی اور وہ مسلسل اپنے متحدہ قومیت کے نظریہ کو پروان چڑھاتے رہے۔ انہوں نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان یکجا رہ سکتے ہیں۔ مل جل کر سوچ سکتے ہیں اور متحد ہو کر آزادی کی برکات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ اپنی عمر کا بیشتر حصہ انہوں نے قومی اتحاد کی تشکیل و تعمیر میں صرف کیا۔ اپنے ہم وطن ہندوؤں اور دوسرے طبقوں کے ساتھ مل کر آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے مولانا آزاد نے جن باتوں کو اہم سمجھا ان میں مشترکہ تہذیب اور متحدہ قومیت کے بنیادی اصولوں کو اولیت دی اور متحدہ قومیت کی دولت کو بچائے رکھنے کے لیے انہوں نے تمام صعوبتوں

کو برداشت کیا اور اپنے اس موقف پر ہمیشہ قائم رہے کہ ہندوستان کے تحفظ و ترقی کے لیے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کا اتحاد ضروری ہے۔ ان کے لیے ہندوستانی مشترکہ تہذیب، ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی ایک عقیدے کی حیثیت رکھتے تھے اور کسی قیمت پر اس عقیدے سے دستبردار ہو کر زندگی گزارنا انہیں قابل قبول نہیں تھا۔

14.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- متحدہ قومیت ایک ایسا تصور ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی قوم مختلف ثقافتوں، ذاتوں، مذاہب، برادریوں اور مسلکوں پر مشتمل ہے یعنی ایسی تہذیب جو نہ مسلمانوں کی ہے نہ ہندوؤں کی بلکہ دونوں کے امتزاج سے بنی ایک نئی تہذیب ہے۔
- مولانا آزاد کے دل و دماغ پر متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ و تصور ایسا چھایا ہوا تھا کہ وہ اس کے مقابلے میں ملک کی آزادی کو بھی بے سود اور بے حقیقت بتاتے تھے۔ 1923ء کے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں انہوں نے یہی حقیقت واضح کی تھی کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر آزادی بھی نہیں مل سکتی۔
- الہلال کے اجرا کے وقت ہی سے وہ دلوں پر یہ نقش بٹھائے رہے کہ ملک میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے، جب تک کہ وہ احکام اسلامیہ کے تحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کر لیں۔
- مولانا آزاد کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد، مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی ایک عقیدے کی حیثیت رکھتے تھے اور وہ کسی بھی قیمت پر اس سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھے۔
- مولانا آزاد نے سیکولرزم اور ہندوستانی قومیت کے استحکام، ہندو مسلم اتحاد، ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے فروغ کو اپنی زندگی کا خاص مشن بنایا تھا، ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ انہوں نے 1911ء ہی سے بلند کرنا شروع کر دیا تھا اور 1912ء میں الہلال نکالا تو وہ آزادی و اتحاد کی تحریک کا نقیب بن گیا۔
- مولانا کو ہندو مسلم اتحاد عزیز تھا۔ انہوں نے دو قومی نظریہ کی شدید مذمت کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اخوت و محبت اور اتحاد و اتفاق کے رشتہ میں منسلک رہنے کی ہمیشہ تلقین فرمائی۔
- مولانا آزاد کے دماغ پر متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ ایسا چھایا ہوا تھا کہ وہ اس کے مقابلے میں ہندوستان کی آزادی کو بے سود سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے لیے جہاں اسلام مایۂ فخر ہے وہاں ہندوستانی قومیت کا عنصر ہونا بھی ان کے لیے مایۂ ناز ہے۔ وہ اپنے ہندوستانی ہونے اور اس کی متحدہ قومیت کا جزو لاینفک ہونے پر ناز کرتے تھے۔
- مولانا آزاد کے خیال میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں خواہ کلچر اور مذہب کے لحاظ سے کتنا ہی فرق اور اختلاف کیوں نہ ہو اور وہ اپنے اپنے روایتی ورثے پر الگ الگ جتنا بھی فخر کریں لیکن دونوں بہر حال ایک ہی قومیت کا جزء ہیں۔

- وہ ہندوستان میں سیکولرزم، قومی یکجہتی اور جمہوریت کا فروغ چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد اتنا ہی ضروری ہے جتنا ملک کی آزادی و سالمیت۔ وہ آزادی سے دستبردار ہو سکتے تھے مگر ہندو مسلم اتحاد اور ملک کی وحدت و سالمیت سے کسی قسمت پر دستبردار نہیں ہو سکتے تھے۔

14.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
تعدد	:	تعداد میں ایک سے زیادہ ہونا، متعدد
تکثر	:	افراط، کثرت، زیادہ ہونا
موانست	:	محبت، پیار، دوستی، اتحاد
ناک بھوں چڑھانا	:	ناراضگی اور ناخوشی کا اظہار کرنا، بیزاری ظاہر کرنا
حریت	:	آزادی، کسی کا غلام نہ ہونا
متصادم	:	ایک دوسرے سے ٹکرانے والا، باہم جھگڑنا، جنگ و جدل
ممد و معاون	:	مدد کرنے اور ساتھ دینے والا، اعانت کرنے والا
رجعت پسندی	:	قدیم نظریات اور قدیم رسم و رواج کو ترجیح دینے کا رجحان

14.7 نمونہ امتحانی سوالات

14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. الہلال کب سے نکلنا شروع ہوا؟
2. مولانا آزاد نے ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ کب سے بلند کرنا شروع کیا؟
3. مولانا آزاد رانچی میں کب نظر بند کئے گئے؟
4. الہلال کب بند ہوا؟
5. مولانا آزاد نے آل انڈیا پارٹیز کانفرنس میں کب شرکت کی؟
6. کانگریس کا پہلا اجلاس کب ہوا؟
7. مسلمان ہندوستان میں رہتے ہیں۔ ہندوستان کی خدمت ان کا فرض ہے یہ کس کا قول ہے؟
8. مولانا آزاد نے قول فیصل کب پیش کیا؟
9. "مسلمان ہندوؤں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں اور اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے معاف کر دیں۔"

یہ کس نے کہا؟

10. مولانا آزاد نے عراق، مصر، شام اور ترکی کا سفر کب کیا؟

14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. لفظ قوم کے معنیٰ کی وضاحت کیجیے۔
2. قومیت کیا ہے؟ واضح کیجیے۔
3. ہندوستانی قوم کی تشکیل کیسے ہوئی؟ لکھیے۔
4. مولانا آزاد کے تصور قومیت پر اجمالاً روشنی ڈالیے۔
5. مولانا آزاد کے متحدہ قومیت کے عناصر پر اظہار خیال کیجیے۔

14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. قومیت کے معنیٰ و مفہوم کو تفصیل سے بیان کیجیے۔
2. آزاد کے متحدہ قومیت کے تصور پر اظہار خیال کیجیے۔
3. اکائی میں شامل خطبات آزاد و دیگر اقتباسات کی روشنی میں متحدہ قومیت کا جائزہ لیجیے۔

14.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. مولانا ابوالکلام آزاد، مذہبی افکار، صحافت اور قومی جدوجہد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی
2. خطبات آزاد	مرتبہ: مالک رام
3. مولانا ابوالکلام آزاد: فکر و فن کی چند جہتیں	ضیاء الحسن فاروقی
4. ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت	رشید الدین خان
5. تلاش آزاد: حیات، شخصیات، خدمات: چند جھلکیاں	عبدالقوی دسنوی
6. مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ	ڈاکٹر بشریٰ رحمان

اکائی 15: مولانا ابوالکلام آزاد بہ حیثیت وزیر تعلیم

اکائی کے اجزا

15.0		تمہید
15.1		مقاصد
15.2		بہ حیثیت وزیر تعلیم مولانا آزاد کی شخصیت
15.3		مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات
15.4		بہ حیثیت وزیر تعلیم مولانا آزاد کی خدمات
15.5		اکتسابی نتائج
15.6		کلیدی الفاظ
15.7		نمونہ امتحانی سوالات
	15.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	15.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	15.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
15.8		تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

مولانا ابوالکلام آزاد 20ویں صدی کی اُن عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے برّصغیر پر نہایت گہرے نقوش چھوڑے۔ ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں۔ ایک عظیم مجاہدِ آزادی، عظیم فلسفی اور دانشور، بلند پایہ ادیب، مشہور زمانہ صحافی، ایک جید عالم، مفسر قرآن، ماہرِ تعلیم اور ایک ویژنری لیڈر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ ان کی ہمہ گیر و ہمہ جہت صلاحیت کا جس شعبے میں سب سے عمدہ مظاہرہ ہوا وہ تعلیم کا میدان ہے۔ مولانا ابوالکلام نے تعلیم کی ترقی کی راہ میں حائل دشواریوں کو نہ صرف قریب سے سمجھا، بلکہ انہیں دور کرنے کے لیے بھی عملی اقدامات کی داغ بیل ڈالی۔ بہ حیثیت مرکزی وزیر تعلیم وہ تعلیم کے فروغ پر زور دیتے رہے۔ انہوں نے اپنی وزارت کے دور میں کئی اہم تعلیمی اور ثقافتی پالیسیوں کی تشکیل کے لیے حکومتی سطح سے لے کر عوامی سطح تک بھرپور

کوششیں کیں۔ ان کی قیادت میں ملک نے تعلیم، ٹیکنالوجی اور ثقافت و تہذیب کے عظیم قومی ورثے کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اس کی ترقی کے لیے ایک نئی سمت میں مستحکم اور مضبوط پیش رفت کی۔ اس اکائی میں ہم بہ حیثیت وزیر تعلیم مولانا آزاد کی خدمات کا مطالعہ کریں گے۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- وزیر تعلیم کی حیثت سے مولانا آزاد کی شخصیت کے اہم نکات بیان کر سکیں۔
- مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات بیان کر سکیں۔
- وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد کے ذریعے کیے گئے کاموں کو سمجھ کر بیان کر سکیں۔

15.2 بہ حیثیت وزیر تعلیم مولانا آزاد کی شخصیت

مولانا آزاد کا شمار ان نامور شخصیات میں ہوتا ہے، جنہوں نے قوم کی ترقی کے لیے اپنی پوری زندگی صرف کر دی۔ آپ ایک عالم دین، مفسر قرآن اور ایک روشن دماغ مفکر ہونے کے ساتھ، ایک ماہر تعلیم بھی تھے۔ ماہر تعلیم کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول ایسے افراد جن کو قدرت نے ایک اخلاقی فکر دی ہے، جو تعلیم کے تمام شعبوں کے ساتھ ساتھ تعلیم کے حصول کی کوششوں اور ان کو بروئے کار لانے پر نہ صرف گہری نظر رکھتے ہیں، بلکہ گہرا شغف بھی رکھتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ جو تعلیم کے اصولوں اور نظریوں کا عمیق مطالعہ کرتے ہیں اور درس گاہوں، اسکولوں اور کالجوں میں اس کا عملی تجربہ کرتے ہیں۔ مولانا آزاد پہلی صف میں نظر آتے ہیں جن کی انگلیاں نہ صرف نبض انسانی پر تھیں، بلکہ اس کے لیے بہتر امکانات کو تلاش کرنے کے لیے اپنے مشاہدات کو بھی بروئے کار لاتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ قوم نئی قدروں سے روشناس ہو اور نئی سمتوں کی جانب سرگرم سفر ہو۔ اس کے لیے بلاشبہ تعلیم کا حصول ضروری ہے، جس سے نہ صرف زندگی حسین بنائی جاسکتی ہے بلکہ اس کے حصول کے بعد قوم و ملک کے حصے میں وہ سعادتیں اور کامیابیاں آتی ہیں، جن کی ایک زمانہ تلاش میں رہتا ہے۔ مولانا آزاد اپنے عہد اور مابعد عہد کے ان افراد میں سے تھے، جنہوں نے علم کے میدان میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے، جن کا ان کے عہد میں ہی اعتراف کیا جانے لگا تھا۔

مولانا آزاد نے ایک خطبے میں تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے ہر حال میں مقدم کام عوام کی تعلیم ہے۔ یہی کام سب سے زیادہ ضروری ہے اور اسی کی طرف سے ہمیشہ اغماض کیا گیا ہے۔ قوم کو اس کی موجودہ حالت میں بلند کرنے کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ نسل کی دماغی حالت اور عملی استعداد درست کی جائے۔ وقت کی تمام مشکلات کا یہی علاج ہے۔

مولانا آزاد چاہتے تھے کہ تعلیم اخلاقی اور روحانی قدروں کو فروغ دے اور دنیا کے تمام مذاہب کی آگہی و احترام سکھائے۔ لیکن مولانا آزاد کے تعلیمی فلسفہ کے عناصر جو بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے، ان کے انتقال کے بعد ماند پڑنے شروع ہو گئے۔ نظام تعلیم کو

مستحکم بنانے کے لیے ملک کی تعلیمی پالیسی کو 1968 میں از سر نو مرتب کیا گیا، لیکن اس کے لیے نہ خاطر خواہ وسائل مہیا ہوئے اور نہ اس کی عملی تشکیل کے لیے جس انہماک اور شدومد کی ضرورت تھی، اس کے لیے قابل ذکر اقدامات ہی کیے گئے۔ اس کا نتیجہ اس شکل میں سامنے آیا کہ وہ نظام تعلیم اس سے وابستہ توقعات کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔ جنوری 1986 میں ایک نئی تعلیمی پالیسی کی تشکیل سامنے آئی، جس میں تقریباً 40 برس کی تعلیمی پیش رفت کا دیانت دارانہ جائزہ پیش کرنے کی سعی کی گئی اور آزاد ہندوستان میں تعلیم کی کیفیت اور رفتار ترقی کو ظاہر کرتے ہوئے ان کوتاہیوں پر روشنی ڈالی گئی جو تعلیمی ترقیات میں رخنہ کا سبب بنیں۔ لیکن ملک کی قیادت کی بالغ نظری کا اعتراف کرنا بھی ناگزیر ہے کہ انہوں نے اس سمت پیش رفت کی۔ کیوں کہ اس سے قبل ملک قومی تعلیم کے اس تخیل سے غافل ہو گیا تھا جو آزاد ہندوستان کے اولین وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام نے ملک کو دیا تھا۔

15.3 مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات

مولانا آزاد قومی سیاست کا ایک عظیم ستون تھے۔ آزادی سے قبل ان کی سیاسی، تہذیبی اور تصنیفی خدمات سے ایک دنیا واقف ہے۔ آپ کے تعلیمی تصورات اگرچہ پہلے بھی سامنے آتے رہے تھے، لیکن آزادی کے بعد آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کی تحریریں اور تقریریں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ وہ قوم کی تعلیمی پس ماندگی سے پورے طور پر واقف تھے اور اسے دور کرنے کے لیے اصلاحی کوششیں عملی طور پر شروع کر دی تھیں۔ انہوں نے قوم و ملک کے لیے جس طریق تعلیم کی بنیاد ڈالی، وہ آج بھی اتنا ہی مفید اور کارآمد ہے، جتنا اپنے آغاز کے دور میں تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات کی بنیاد چار امور پر استوار ہے۔ ایک ذہنی بیداری، دوسرا اتحاد و ترقی، تیسرا مذہبی رواداری اور چوتھا عالمی اخوت۔ مولانا آزاد کے خیال میں آزاد ہندوستان میں تعلیم کا سب سے اہم مقصد نئی نسل کی ذہنی بیداری ہونا چاہیے، کیونکہ انگریزوں کے طریقۂ تعلیم نے نوجوان نسل کے لیے دو زہریلے نظریات پیدا کر دیئے تھے ایک غلامی دوسرے علیحدگی پسندی یا سماج سے لاتعلقی۔ انگریزوں کے تعلیمی نظام کا مقصد حکومت کے لیے ایسے کارندے پیدا کرنا تھا جو ان کے کام آئیں۔ اسی مقصد سے انہوں نے علیحدگی پسند نظریات کا بیج بویا اور طریقۂ تعلیم کو اس کے لیے سب سے مؤثر وسیلہ بنایا۔ لہٰذا سب سے پہلے اس زہر کو نئی نسل کے ذہنوں سے نکالنا چاہیے اس کے بعد آزاد ہندوستان کے تعلیمی مقاصد میں غلامی کی جگہ آزادی اور تعصب کی جگہ مذہبی رواداری کو ملنا چاہئے جس کے نتیجہ میں ہم مغربیت کے بجائے اپنے شاندار ماضی پر فخر کر سکیں گے۔ مولانا آزاد تعلیم کو صرف ملازمتوں کے حصول کا ذریعہ بنانا نہیں چاہتے تھے بلکہ اس کے وسیلہ سے ذہنوں میں بیداری لانے اور نوجوانوں کو آئندہ زندگی میں خود کفیل بنانے پر زور دیتے تھے۔ تقریباً دو صدیوں تک مغربی اور انگریزی طرزِ تعلیم نے نئی نسل کو غلامانہ ذہنیت اور تنگ نظری کا شکار بنا دیا تھا، لوگ انگلستان جا کر تعلیم حاصل کرنا باعثِ فخر سمجھتے اور ملک کے علمی سرمایہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس صورتِ حال میں تبدیلی لانا ضروری تھا. پٹنہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیمِ اسناد میں اسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا آزاد نے کہا تھا کہ سوال یہ ہے کہ اب تک تعلیم پر ہمارا کوئی کنٹرول نہیں تھا اس پر غیر ملکی حکومت کا قبضہ تھا.

جو کچھ انہوں نے پڑھایا، ممکن ہے صحیح ہو۔ جس طرح پڑھایا اس نے ہمارے ذہنوں کو بجائے کھولنے کے بند کر دیا۔

مولانا آزاد نے ہر موقع اور ہر فکر و عمل میں درمیان کی راہ اپنانے کی تلقین کی۔ ان کا خیال تھا کہ آزاد ہندوستان کے لیے مغربی طرزِ تعلیم اور مشرقی طرزِ تعلیم کے درمیان کی راہ ہی مفید ہو گی اس لیے آئندہ ہمارا طریقۂ تعلیم ایسا ہو کہ دل و دماغ اور عقلیت و روحانیت میں توازن قائم رہے. نصاب اور طریقۂ تعلیم کے بارے میں بھی ان کی رائے بڑی معتدل اور معقول تھی. وہ نصاب و درس کے تعلق سے جدیدیت کے اور طریقۂ تعلیم کے لحاظ سے قدیم طرز کے قائل تھے۔ مولانا کے تعلیمی فلسفہ کی بنیاد مشرقی افکار اور مغربی نظریات میں ہم آہنگی و توازن پر مشتمل تھی تاکہ نئی نسل میں جہاں سائنس کا صحیح استعمال آجائے، وہیں اس کے ذریعہ ان مقاصد کا حصول بھی ممکن ہو جو انسانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہیں۔ ایک عالم دین اور مشرقی اقدار کے علمبر دار ہونے کے باوجود مولانا نے سائنس اور مغربی ٹیکنالوجی کی تعلیم کو ملک کی ترقی کے لیے ناگزیر سمجھا۔ ان کے خیال میں جو اچھا ہے، جہاں سے ملے لے لو اور جو خراب ہے، جہاں بھی ہو اسے چھوڑ دو. یہی مولانا آزاد کا لائحہ عمل تھا اور زندگی بھر وہ اس پر کاربند رہے۔

مولانا آزاد کے تعلیمی نظریے کا ایک اور پہلو "سیکولرازم اور قومی اتحاد" تھا، جس کی آزادی کے بعد اور آج بھی ہندوستان کو شدید ضرورت ہے۔ انگریزوں نے اس کو زبردست نقصان پہنچایا، ان کی حکمت عملی قوم کو تقسیم کر کے حکومت کرنے کی رہی۔ اس لیے انہوں نے مذہبی شدت پسندی کی ہمت افزائی کر کے قومی اتحاد اور ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچایا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انگریزوں نے جدید تعلیم کے نام سے جس نظامِ تعلیم کی داغ بیل ڈالی وہ فرقہ واریت پر مبنی تھا، جس کو انگریزوں نے عربی و فارسی اسکول اور سنسکرت اسکولوں کا نام دیا۔ جس طرح ہندو پانی، مسلم پانی، ہندو تہوار، مسلم تہوار کو انہوں نے فروغ دیا، اسی طرح علیحدہ علیحدہ تعلیمی ادارے بھی قائم کیے تاکہ قوم ہندو تعلیم اور مسلم تعلیم کے خانوں میں تقسیم ہو جائے۔ آزادی کے بعد مولانا آزاد کے پیش نظر اس اندازِ فکر اور طریقۂ عمل کو ختم کر کے ماڈرن تعلیم کا نظام رائج کرنا تھا، جس کے مقاصد میں متحدہ قومیت کا فروغ، سیکولرازم اور قومی ترقی شامل تھے۔ انہوں نے مذکورہ تینوں مقاصد کو پورا کرنے کیلئے نہ صرف لائحہ عمل طے کیا بلکہ متعدد کمیشن قائم کئے اور کانفرنس و سیمینار منعقد کر کے یہ بتایا کہ ہم اپنی مادی دولت اور سازوسامان کو جغرافیائی یا طبقاتی حد بندیوں میں قید کر سکتے ہیں لیکن علم اور تہذیب کی دولت پر مہر نہیں لگا سکتے۔ وہ تمام انسانوں کی میراث ہے اور اس میں تنگ نظری سے بڑھ کر دوسرا کوئی جرم نہیں ہو سکتا، یہی قوموں کی ترقی میں رکاوٹ بھی بنتا ہے۔

مولانا آزاد کی 1947 سے 1952 تک کی ان تقاریر کا جو انہوں نے تعلیمی پروگراموں میں کی تھیں، اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مولانا کے ذہن میں تعلیم کا نہایت وسیع اور گہرا مفہوم تھا۔ انہوں نے انفرادی تعلیم کے بجائے قومی تعلیم کا تصور پیش کیا۔ ان کے نقطۂ نظر سے مذہبی تعلیم تو ہر ہندوستانی بچے کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ اخلاقی و روحانی صفات سے آراستہ ہو سکے، لیکن تعلیمی نظام کو فرقہ واریت سے پاک رکھ کر تعلیم کی بنیاد قومی مصالحت اور اتحاد پر استوار ہونی چاہیے۔ مولانا آزاد نے انگریزی فرقہ وارانہ نظام تعلیم رد کر دیا اور ایک نیا نظام تعلیم قائم کیا اور سیکولرازم اور قومی اتحاد کے مقصد کو آگے بڑھایا۔ انھوں نے انفرادی تعلیم کے بجائے قومی تعلیم کا تصور پیش کیا۔

1950 میں مولانا آزاد نے سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے اجلاس میں تقریر کے دوران کہا کہ ٹیکنیکل تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے ان کا پروگرام یہ ہے کہ موجودہ درسگاہوں کی ترقی و توسیع ہو۔ تعلیمی اداروں کی عمارتوں کی مرمت اور توسیع ہو۔ نئی مشینیں منگوائی جائیں۔ جدید تعلیم سے آراستہ استادوں کا تقرر ہو۔ مولانا ابوالکلام آزاد صرف کہتے نہیں تھے بلکہ اپنے قول کو عملی جامہ بھی پہنا دیتے تھے۔ انھوں نے کلکتہ کے قریب ہگلی میں حکومت بنگال سے ایک ہزار ایکڑ زمین لے کر ایسٹرن ہائر ٹیکنولاجی انسٹیٹیوٹ کا افتتاح کیا۔ اگست 1951 میں وہاں فرسٹ ائیر کی پہلی کلاس شروع ہوئی۔ 18 / اگست کو کھڑگ پور انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہمیں ٹکنیکل تعلیم کے ذرائع اپنے ملک میں اتنے مضبوط کرنے ہیں کہ اس کے حصول کے لیے ہمیں غیر ملک نہ جانا پڑے۔ 1951 میں ہی شانتی نکیتن کو سینٹرل یونیورسٹی کا درجہ دلوایا۔ ان کے مطابق تعلیمی نظام کوئی بھی ہو لیکن اساتذہ کی بہبود کے بغیر کسی قسم کی تعلیمی بہتری ممکن نہیں۔ ان کے نزدیک سکنڈری سطح تک تعلیم کو مفت ہونا چاہیے تھا۔ وہ تعلیم بالغان اور تعلیمِ نسواں کے بھی زبردست حامی تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ اس سے ہمارے آدھے سے زیادہ مسائل حل ہو جائیں گے۔ وہ سیکنڈری سطح کی تعلیم کو مفت رکھنا چاہتے تھے، جس پر آزادی کے پچاس برس بعد عمل شروع ہوا۔ ان کا ماننا تھا کہ تعلیم صرف کتابی علم کا نام نہیں۔ ہندوستانیوں کو اپنی تہذیب و ثقافت سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی پروفیشنل تعلیم، فنون لطیفہ اور صنعت اور حرفت سے واقفیت کو بھی اہل وطن کے لیے ضروری سمجھا۔ اپنے اس نظریے کو عملی شکل دینے کے لیے سب سے پہلے انھوں نے ملکی اور ریاستی سطح پر تعلیمی سرگرمیوں کو مربوط کرنے کی کوشش کی۔ ان کی زیر نگرانی انگنت اسکولوں و کالجوں اور یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ اسی دوران تحقیق کے مختلف مراکز بھی وجود میں آئے۔

مولانا آزاد کے نزدیک ہر فرد کو ایسی تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے، جو اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے اور مکمل زندگی گزارنے کا اہل بنائے، ایسی تعلیم کو انھوں نے ہر شہری کا حق بتایا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ اس دنیا میں ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔ نوجوانوں کو چاہیے کہ ایسی تعلیم حاصل کریں جس سے ان کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں اور ان سے معاشرہ کو فائدہ پہنچے۔ مولانا کے فلسفہ تعلیم سے ہندوستان کا تعلیمی نظام بہتر ہوا۔ بہتر تعلیمی نظام سچی دینداری، عقائد کی درستگی، انسانی اخوت و ہمدردی، عدل و انصاف اور انسانی اقدار کی طرف خصوصی توجہ مبذول کراتا ہے۔ تعلیم کے لیے اس میں ایک بڑا رہنما اصول پوشیدہ ہے، خودداری اور عزت نفس کا اصول یہ اصول انفرادی اور اجتماعی آزادی دونوں کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے، تعلیم میں اس کی پیروی اس طرح ہونی چاہیے کہ طالب علم کی شخصیت کا احترام کیا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے اظہار ذات کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ اس کی مخفی صلاحیتیں اجاگر ہوں اسے ہمت دلائی جائے۔

وزارتِ تعلیم سنبھالنے کے بعد ایک پریس کانفرنس میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تعلیم کے تعلق سے اپنے بنیادی نظریہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ صحیح طور پر آزادانہ اور انسانی قدروں سے بھرپور تعلیم ہی لوگوں میں زبردست تبدیلی کا باعث ہو سکتی ہے اور انہیں ترقی کی طرف لے جا سکتی ہے۔ مولانا آزاد چاہتے تھے کہ مشرقی و مغربی علوم میں ہم آہنگی پیدا ہو۔ یہ ترقی پذیر ہندوستان کے لیے ان کا ایک

پر خلوص جذبہ و کوشش تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ تعلیم کا واحد مقصد روزی اور روٹی کمانا نہیں ہونا چاہیے بلکہ تعلیم سے شخصیت سازی کا کام بھی لیا جائے اور یہی تعلیم کا سب سے مفید پہلو ہے اور اسی سے معاشی و تمدنی نظام بھی بہتر ہو سکے گا۔

الغرض مولانا ابو الکلام آزاد اس سچائی پر یقین رکھتے تھے کہ تعلیم کے بغیر ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا۔ تعلیم کے ذریعے ہی اس ملک کو ترقی یافتہ اور مہذب ملکوں کی فہرست میں لایا جا سکتا ہے۔ ان کی نگاہ میں قومی نظام تعلیم ملک کے نظام کا ناگزیر حصہ ہے۔ انھوں نے وزیر تعلیم کے عہدے پر فائز رہتے ہوئے تعلیم کے فروغ میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے، وہ ناقابل فراموش ہیں اور یہ سب ان کے تعلیمی نظریات کی ہی دین ہیں۔

15.4 بہ حیثیت وزیر تعلیم مولانا آزاد کی خدمات

مولانا ابو الکلام آزاد نے 15 / اگست 1947 کو وزیر تعلیم کا عہدہ سنبھالا اور 2 / فروری 1958 تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ مولانا آزاد ملک کے حالات سے بخوبی واقف تھے جس کے پیش نظر وہ نوجوانوں کی اصلاح اور اقدار سازی کے خواہاں تھے۔ انھوں نے تقریباً گیارہ برس تک ملک کے لیے تعلیمی خدمات انجام دیں۔ وزیر تعلیم کا عہدہ سنبھالتے ہی انھوں نے یہ عزم کیا کہ ہندوستان میں وہ ایک ایسے تعلیمی نظام کی بنیاد ڈالیں جو اس قدر مضبوط ہو گا کہ آنے والی نسلیں اس پر عالی شان محل تعمیر کر سکیں۔

مولانا آزاد پہلے وزیر تعلیم اور سائنسی تحقیق(Minister of Education & Scientific Research) تھے اور انھوں نے ہی ہندوستان کے تعلیمی نظام کو مضبوط بنیاد فراہم کی اور معیاری اعلیٰ تعلیم کے لیے کئی اہم قدم اٹھائے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ وزارتِ تعلیم کی ذمہ داری سنبھالتے ہی میں نے پہلا فیصلہ جو لیا وہ یہ تھا کہ ملک میں اعلیٰ تعلیم اور فنی تعلیم کے حصول کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں تا کہ ہم اپنی ضرورتیں خود پوری کریں۔ میں اس دن کا منتظر ہوں جب ہندوستان میں باہر سے لوگ آکر سائنس اور فنی تعلیم میں تربیت حاصل کریں گے۔

مولانا آزاد کی کوشش رہی ہے کہ مشرق و مغرب کے تعلیمی فلسفوں کو ایک وسیع تر تصور میں جمع کر کے متوازن اور مکمل نظام تعلیم کی بنیاد ڈالی جائے۔ ان کے مطابق تعلیم کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ایک صالح اور مربوط معاشرہ کے لیے ایسے افراد کی تربیت کرے جن کی شخصیت ہم آہنگ اور مربوط ہو۔ انھوں نے تعلیم کے ہر پہلو پر کام کیا۔ ان کے چند کارنامے درج ذیل ہیں:

(i) ذریعہ تعلیم:

تعلیم کے لیے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ زبان ہے۔ حصول تعلیم میں زبان کا مسئلہ اہم مسئلہ ہے اس مسئلہ کا حل پیش کرتے ہوئے مولانا آزاد کا ماننا تھا کہ اگر کسی صوبہ نے یا کسی یونیورسٹی نے اس وقت انگریزی کو ہٹا کر ہندی لانے کا فیصلہ کر لیا تو اس نے یہ

صحیح نہیں کیا، انگریزی ڈیڑھ سو برس سے ہمارا ذریعہ تعلیم ہے، اس لیے جہاں تک یونیورسٹی کی تعلیم کا تعلق ہے اس میں تبدیلی کرنے کے لیے بڑے غور وخوض کی ضرورت ہے تاکہ تعلیمی معیار کو نقصان نہ پہنچے۔

مولانا آزاد مشرق اور مغرب کے نظریوں میں میل پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے ہندی زبان میں سائنس کی اصطلاحیں بڑھانے پر زور دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ اپنی زبان میں علوم وفنون سیکھنا زیادہ سود مند ہے۔ اس سے ہمارے ملک کی ترقی و توسیع ہوگی جب کہ غیروں کی زبان میں سیکھا گیا علم اکثر و بیشتر غیر ملکوں کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ غیر ملکی زبان میں علم وفن حاصل کر لینے کے بعد ہمارے نوجوان با آسانی دوسرے ملکوں میں زندگی گذار لیتے ہیں اور خود ان کا ملک ان کی خدمات سے محروم رہ جاتا ہے۔

(ii) اساتذہ:

زبان کے بعد تعلیم کے فروغ کے لیے نیک اور مخلص اساتذہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ طلبا کی تعلیم وتربیت میں استاد اہم کردار نبھاتا ہے۔ اس وجہ سے استاد کو محترم شخصیت سمجھا جاتا ہے۔ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ تعلیم کی باگ ڈور ایسے اشخاص کے ہاتھوں میں رہی ہے جو مطلق کسی اہلیت و صلاحیت کے مالک نہیں ہیں، ہم ان کو موردِ الزام قرار نہیں دے سکتے۔ اس لیے کہ ملک کی قدیم روایات کے برعکس اساتذہ کو قدر و منزلت کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا، ماضی میں ایک استاد کا مقام بہت بلند تھا، اگر مالی حیثیت سے کوئی استاد خوشحال نہ بھی ہوتا تو اس کا ملال نہ تھا اور وہ اس لیے کہ سماج میں اسے مرتبہ اور وقار حاصل ہوتا ہے۔ اس دور میں شومئ قسمت ہے زمانہ کا نقشہ ہی بدل گیا۔ آج خصوصیت کے ساتھ ابتدائی درجات کے اساتذہ کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ مولنا آزاد کا خیال ہے نظامِ تعلیم کی تجدید واحیا کی مہم شروع کرتے وقت ہمارا اولین فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہم اساتذہ کا معاشرتی معیار بلند کریں۔

(iii) نصاب:

زبان اور معلم کے بعد ایک ملک و قوم کی ترقی کے لیے یہ بات بے حد ضروری ہے کہ تعلیمی نظام درست ہو اور اس نظام میں وہ تمام سہولیات مہیا کرائی جائیں جن کا تقاضہ حالات کرتے ہیں، اس کے علاوہ ایک عمدہ نصاب کا ہونا بھی ضروریات میں سے ہے تاکہ طالب علم اپنے محدود وقت میں ان تمام موضوعات کو بحسن وخوبی سیکھ سکے جن کی ضرورت ہے اور غیر ضروری موضوعات میں وقت ضائع نہ ہو۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا آزاد کہتے ہیں کہ ہمارے قومی بجٹ میں تعلیم کو اعلیٰ ترین ترجیح حاصل ہونی چاہیے اور اس کا درجہ خوراک اور پوشاک کے فوراً بعد آنا چاہیے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے سچ تو یہ ہے ایک مناسب تعلیمی نظام کا ہونا ضروری ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر ہم کامل عزم وارادہ کے ساتھ مل کر کوشش کریں تو ہم اپنی خامیاں دور سکیں گے اور ہندوستان میں تعلیم کو دنیا کے مہذب ملکوں کے تعلیمی معیار پر لا کھڑا کریں گے۔

مولانا آزاد کے تعلیمی فلسفہ کی اساس مشرقی افکار اور مغربی نظریات میں ہم آہنگی و توازن پر ٹکی تھی۔ وہ نصاب و درس کے اعتبار سے جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے اور طریقۂ تعلیم کے لحاظ سے قدیم طرز کے قائل تھے۔ ایک عالم دین اور مشرقی اقدار کے علمبر دار ہونے کے باوجود وہ سائنس اور مغربی ٹکنالوجی کی تعلیم کو ملک کی ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسانی قدروں سے بھرپور تعلیم ہی لوگوں میں زبردست تبدیلی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سب سے پہلے انھوں نے فروری 1948 لکھنؤ میں دارالعلوم کے سربراہوں اور مدارس و مکاتب کے ذمہ داروں کے ساتھ ایک کانفرنس کی اور ان سے جدید ٹکنالوجی کو اپنے نصاب میں شامل کرنے کی بات کہی۔ مدارس کے نصاب میں سائنس کو شامل کیے جانے کی بات کئی زاویوں سے فائدہ مند ثابت ہوتی۔ اول تو یہ کہ تعلیم گاہ کی تعمیر از سر نو نہیں کی جانی تھی۔ موجود وسائل میں صرف سائنس سے متعلق ذرائع کا اضافہ کر کے ملک کی ضرورت کے اعتبار سے مدارس سے ہی انجینئر اور ڈاکٹر اور دیگر ماہرین پیدا ہو جاتے۔ آئی آئی ٹی اور دیگر ادارے بعد میں قائم ہوتے رہتے۔ اس سے آزاد ہندوستان میں ماہرین علوم فنون بہت کم مدت میں اس خلا کو پر کر دیتے جو انگریزوں کے ہندوستان چھوڑنے پر پیدا ہو گیا تھا۔ بنیادی طور پر مولانا تعلیم میں روحانیت اور مادیت کا امتزاج دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ جدید سائنس کو اس طور پر عام کرنا چاہتے تھے کہ اخلاق دین و فلسفہ، ایک ساتھ رہیں۔ اس کے ذریعے قومیت کی جگہ بین الاقوامیت اور تعصب کی جگہ انسانیت کو فروغ ہو۔ وہ تعلیم کو ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور اسے تمدن کے تابع دیکھنا چاہتے تھے۔

(iv) تعلیم بالغان:

مولانا آزاد نے تعلیم بالغان کا تصور پیش کیا تو کہا کہ ہم اتنا انتظار نہیں کر سکتے کہ ہمارے بچے ابتدائی تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ سطح تک پہنچیں۔ کیوں کہ تب تک ایک دہائی گذر چکے گی۔ اگر ہم اپنے ہنر مند لوگوں کو خواندہ بنا دیں تو اس کے مثبت نتائج فوراً بر آمد ہوں گے۔ اس کے لیے بڑی عمر کے لوگوں کو ہمیں اپنا مقصد سمجھانا ہو گا اور اس کے بعد کاغذ قلم ان کے ہاتھ میں تھما کر مشق کروانی ہو گی۔ چوں کہ وہ سمجھدار لوگ ہیں اس لیے ان کی تعلیم سے ملکی مفاد فوراً فروغ پائے گا۔

(v) عورتوں کی تعلیم:

عورتوں کی تعلیم پر مولانا آزاد نے اس لیے زور دیا کہ انھیں محسوس ہوا کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی صاحب عقل و ہوش ہیں۔ گھریلو ذمہ داریوں کو انجام دینے کے بعد جو وقت بچتا ہے اس کا مصرف علم کے حصول کے لیے ہو تا کہ خواتین بچوں کی پرورش بہتر طریقے سے کر سکیں۔ اس سے ایک طرف اگلی نسل کی آبیاری ہو گی حالانکہ وہ عورتوں کی اعلی تعلیم کے حامی نہیں تھے۔ کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ اگر عورتیں اعلی تعلیم حاصل کر کے باہر کام کرنے کے لیے نکلیں گی تو بچوں کی پرورش متاثر ہو گی۔

مولانا آزاد کے زمانہ وزارت میں وزارتِ تعلیم نے مختلف شعبوں میں رہنمائی کی اور بتایا کہ تعلیم صرف کتابی علم کا نام نہیں ہے۔ مولانا آزاد نے تعلیم کے لیے مخصوص بجٹ کے ایک فیصد کو بڑھا کر دس فیصد کرنے کی تجویز رکھی اور تعلیم کے بارے میں پانچ پروگرام پیش

کیے؛ان کے تعلیم سے متعلق پانچ پروگرام اس طرح تھے۔

1. لازمی مفت تحتانوی تعلیم۔
2. ناخواندہ بالغوں کو سماجی تعلیم دی جائے۔
3. سیکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کا معیار بلند ہو۔
4. قومی ضرورت کے لیے فنون اور سائنس کی تعلیم ہو۔
5. فنون لطیفہ کو فروغ دیا جائے۔

اس زمانہ میں سائنٹیفک اور ٹیکنیکل ایجوکیشن، ٹیچر ٹریننگ، زبان کو پڑھانے کی ٹریننگ، شیڈیول کاسٹ اور شیڈیول ٹرائب کے لیے اسکالرشپ کا آغاز ہوا۔ ملک کے پسماندہ طبقات کی ترقی کی اسکیمیں شروع ہوئیں۔ فروغِ انسانی وسائل کے اصطلاح کا اگرچہ استعمال نہیں ہوا لیکن وزارتِ تعلیم کی اس طرح تنظیم کی گئی کہ تعلیم کو انسانی وسائل کے فروغ کا ذریعہ بنانے کی سمت توجہ مبذول ہوئی۔ ملک کی تعلیمی و سائنسی ترقی کے لیے مولانا آزاد کی قیادت میں اس وزارت نے گرانقدر کام کیا، جس میں فنی تعلیم کی کُل ہند مجلس کی تنظیمِ جدید، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام، کونسل فار سائنٹفک اینڈ ریسرچ اور اس کے ماتحت سائنسی تحقیقات کے قومی اداروں کا قیام جیسے ہمہ جہت کام انجام پائے۔ خاص طور پر یو جی سی (UGC) کی تشکیل سے ملک میں اعلیٰ تعلیم کا جال سا بچھ گیا اور تعلیمی اداروں کو فراخ دلی کے ساتھ مالی امداد فراہم ہونے لگی۔ ان کی رفتارِ ترقی سے سمت و معیار کو سمجھنے میں مدد ملی۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہندوستان میں تعلیم کی جو دھوم نظر آتی ہے، دوسو کے قریب یونیورسٹیاں، آئی آئی ٹی، سائنسی انسٹیٹیوٹ، فنونِ لطیفہ کی اکادمیاں قائم ہیں وہ روشن دماغ اور وسیع النظر وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی ہی دین ہے۔

مولانا آزاد کہتے تھے کہ اگر انسان محض ایک ترقی یافتہ حیوان ہے تو وہ سائنس کے ذریعہ صرف انہیں مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جن کی بنیاد اس کے حیوانی جذبات اور جبلتوں پر قائم ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ذات الٰہی کا ایک پرتو ہے تو سائنس کو بھی مشیت الٰہی کی تکمیل کا وسیلہ بنائے گا۔ اس لیے مولانا آزاد کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ مشرق اور مغرب کے تعلیمی فلسفوں کو ایک وسیع تر تصور میں جمع کرکے ایک ایسے متوازن اور مکمل تعلیمی نظام کی بنیاد ڈالی جائے جو افراد اور سماج کے مطالبات میں ہم آہنگی پیدا کرسکے۔ اس لیے کہ تعلیم کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ایک صالح اور مربوط معاشرے کی تشکیل کے لیے ایسے افراد کی تربیت کرے، جن کی شخصیت تعلیمی فلسفہ سے ہم آہنگ ہو اور اس میں ارتباط باہمی بھی پایا جاتا ہو۔ مولانا آزاد ایسے ہی تعلیمی نظام کا نفاذ چاہتے تھے۔ تعلیم کے اس ہمہ گیر تصور کے لیے انہوں نے ادارے قائم کیے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس سے یونیورسٹیوں کی آزادی کو تحفظ حاصل ہوا۔ ملک میں اعلیٰ تعلیم کی سرگرمیوں کو تیز کرنے کے لیے 1953 میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن وجود میں آیا۔ اس کا کام اعلیٰ تعلیمی اداروں کو سہولیات فراہم کرنا تھا۔ بہ حیثیت وزیر تعلیم مولانا آزاد نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو 1956 میں زیادہ وسائل عطا کیے۔ مولانا آزاد نے ہندوستان میں ماڈرن ایجوکیشن کے کئی ادارے قائم کیے جنھوں نے ہندوستان کے جدید تعلیم نظام کو

بلندی عطا کی جیسے:

1. یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام: 28/دسمبر 1953 کو یو جی سی کا پہلا اجلاس ہوا گو کہ اس کا قیام 1945 میں عمل میں آچکا تھا۔
2. انڈین کونسل آف ایگریکلچرل اینڈ سائنٹیفک ریسرچ کا قیام۔
3. انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ کا قیام۔
4. انڈین کونسل فار سائنٹیفک ریسرچ کا قیام۔
5. کھڑک پور انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹیکنالوجیکا قیام۔
6. انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنس یعنی آئی سی سی آر کا قیام 1950 میں ہوا۔
7. 19/مارچ 1954 کو نیشنل اکیڈمی آف لٹرز تشکیل دی گئی، جس کو بعد میں ساہتیہ اکیڈمی کا نام دیا گیا۔
8. CSIR یعنی کونسل فار سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ
9. انڈین کونسل فار سوشیل سائنس ریسرچ (آئی۔ سی۔ سی۔ آر) کا قیام: عالمی سطح پر ہندوستان کے کلچر اور ثقافت کی نمائندگی کرنے والی انڈین کونسل آف کلچر ریلیشنز کی بنیاد مولانا آزاد نے ہی ڈالی تھی۔ آج پوری دنیا میں اس کے شاخیں وزارتِ خارجہ کے تحت قائم ہیں۔
10. جو آج جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ Institute of International Studies 11۔
11. سنگیت اور للت کلا اکیڈمی وغیرہ
12. آئی۔ آئی۔ ٹی۔ (IIT) کے اصل بانی اس ملک میں مولانا آزاد ہیں اور IIM کے قیام میں پنڈت نہرو کے ساتھ مولانا آزاد کا بھی ویژن شامل ہے۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد نے بہت سے اداروں کو وسعت دی اور ان میں اصلاحات (Reforms) کر کے ان کو مستحکم کیا اور جدید ہندوستان کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ملک میں جتنے بھی کمیشن اور کمیٹیاں قائم ہوئیں ان پر اگر ہم گہری نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ یہ سب مولانا آزاد کے مشن اور ویژن کا ایکسٹینشن ہیں خواہ وہ کوٹھاری کمیشن ہو، پروگرام آف ایکشن ہو یا پھر NEP-2020۔ ایک طرح سے وہ جدید ہندوستانی تعلیمی نظام کے معمار اور بانی ہیں۔ غرض تعلیم کا مقصد ہے کہ طالب علم کے لیے تمام ممکن وسائل مہیا کریں، تعلیم کا بہتر بندوبست کریں اور بچوں کے لیے ٹیکنیکل ایجوکیشن کا نظم قائم کریں۔

مولانا آزاد قوم وملت کی خدمات کرتے ہوئے 22 / فروری 1958ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے لیکن اپنے پیچھے قومی خدمات اور علم وادب کا اتنا سرمایہ چھوڑ گئے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ مولانا آزاد کو ان کی خدمات کے صلے میں ان کی وفات کے بعد 1992 میں ہندوستان کے سب سے بڑے شہری اعزاز **بھارت رتن** سے نوازا گیا۔ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد کی تعلیمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند نے ان کے یوم پیدائش یعنی 11 / نومبر کو یوم تعلیم کے طور پر منانے کا

اعلان کیا جو 2008 سے ملک کے تعلیمی و رفاہی سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں یوم تعلیم کے نام سے منایا جارہا ہے۔

مولانا کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے مولانا کے نام سے ملک میں بے شمار ادارے قائم ہوئے۔ مولانا آزاد کی تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ذیل کے ادارے ان سے منسوب کیے گئے:

1. مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
2. مولانا آزاد نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ٹکنالاجی، بھوپال
3. مولانا آزاد میڈیکل کالج، نئی دہلی
4. مولانا آزاد انسٹیٹیوٹ آف ڈنٹل سائنسز، نئی دہلی
5. مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن، نئی دہلی
6. مولانا ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر، نئی دہلی
7. مولانا آزاد عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک، راجستھان
8. مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو، علی گڑھ
9. مولانا آزاد کالج (سائنس میں) کولکاتا، مغربی بنگال

15.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- وزیر تعلیم کی حثیت سے مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ قوم نئی قدروں سے روشناس ہو اور نئی سمتوں کی جانب سرگرم سفر ہو اور اس کے لیے بلاشبہ تعلیم کا حصول ایک ضروری شئے ہے۔
- مولانا آزاد چاہتے تھے کہ تعلیم اخلاقی اور روحانی قدروں کو فروغ دے اور تمام عالمی مذاہب کی آگہی و احترام بھی سکھائے۔
- مولانا ابوالکلام آزاد کے تعلیمی نظریات کی بنیاد چار امور پر استوار ہے۔ ایک ذہنی بیداری، دوسرا اتحاد و ترقی، تیسرا مذہبی رواداری اور چوتھا عالمی اخوت۔
- مولانا آزاد کے خیال میں آزاد ہندوستان میں تعلیم کا سب سے اہم مقصد نئی نسل میں ذہنی بیداری پیدا کرنا چاہیے۔
- مولانا آزاد نے ہر موقع اور ہر فکر و عمل میں درمیان کی راہ اپنانے کی تلقین کی۔
- ان کے خیال میں آزاد ہندوستان کے لیے مغربی طرزِ تعلیم اور مشرقی طرزِ تعلیم کے درمیان کی راہ ہی مفید ہوگی اس لیے آئندہ ہمارا طریقۂ تعلیم ایسا ہو کہ دل و دماغ اور عقلیت و روحانیت میں توازن قائم رہے۔ نصاب اور طریقۂ تعلیم کے بارے میں بھی ان کی رائے بڑی معتدل اور معقول تھی۔
- مولانا آزاد کے نزدیک ہر فرد کو ایسی تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے، جو اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہو سکے اور

مکمل زندگی گزارنے کا اہل بنائے، ایسی تعلیم کو انھوں نے ہر شہری کا حق بتایا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ اس دنیا میں ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے۔

- مولانا آزاد کے تعلیمی نظریے کا ایک اور پہلو ''سیکولرازم اور قومی اتحاد'' تھا، جس کی شدید ضرورت آزادی کے بعد اور آج بھی ہندوستان کو ہے۔
- مولانا ابوالکلام آزاد اس سچائی پر یقین رکھتے تھے کہ تعلیم کے بغیر ہندوستان ترقی نہیں کر سکتا۔ تعلیم کے ذریعے ہی اس ملک کو ترقی یافتہ اور مہذب ملکوں کی فہرست میں لایا جاسکتا ہے۔
- مولانا آزاد کی کوشش رہی ہے کہ مشرق و مغرب کے تعلیمی فلسفوں کو ایک وسیع تر تصور میں جمع کر کے متوازن اور مکمل نظام تعلیم کی بنیاد ڈالی جائے اور ان کے مطابق تعلیم کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ایک صالح اور مربوط معاشرہ کے لیے ایسے افراد کی تربیت کرے جن کی شخصیت ہم آہنگ اور مربوط ہو۔
- انہوں نے تعلیم کے ہر پہلو پر کام کیا جیسے؛ ذریعہ تعلیم، اساتذہ، نصاب، تعلیم بالغان، عورتوں کی تعلیم وغیرہ۔
- مولانا آزاد نے تعلیم کے بارے میں پانچ پروگرام پیش کیے جو اس طرح تھے۔
  i. لازمی مفت تحتانوی تعلیم۔
  ii. ناخواندہ بالغوں کو سماجی تعلیم دی جائے۔
  iii. سیکنڈری اور اعلیٰ تعلیم کا معیار بلند ہو۔
  iv. قومی ضرورت کے لیے فنون اور سائنس تعلیم ہو۔
  v. فنون لطیفہ کو فروغ دیا جائے۔
- تعلیم کے اس ہمہ گیر تصور کے لیے انہوں نے ادارے قائم کیے۔ جیسے، انڈین کونسل آف ایگریکلچرل اینڈ سائنٹیفک ریسرچ کا قیام۔ انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ کا قیام۔ انڈین کونسل فار سائنٹیفک ریسرچ کا قیام۔ کھڑک پور انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹیکنالوجی کا قیام وغیرہ۔

15.6 کلیدی الفاظ

الفاظ	:	معنی
مستحکم	:	مظبوط، قائم رہنے والا

مفید	:	فائدہ مند
حصول تعلیم	:	تعلیم حاصل کرنا
UGC	:	یونیورسٹی گرانٹ کمیشن
متوازن	:	وزن میں برابر، متناسب
توسیع	:	وسعت، کشادگی، پھیلاؤ
مطلق	:	جو پابند نہ ہو، خود مختار
موردِ الزام	:	جس پر کوئی الزام لگایا گیا ہو، جسے ملزم قرار دیا گیا ہو۔
سائنٹفک	:	سائنسی طریقے سے
مشیت الٰہی	:	رب کائنات کی مرضی، خدا کی مرضی
وسیع النظر	:	بلند خیال کشادہ ذہن
ماڈرن تعلیم	:	نئی تعلیم، جدید تعلیم
خراج تحسین	:	کس کے ہنر یا کمال کی تعریف، شکر گزاری کے کلمات
ویرانی	:	اجاڑپن، غیر آبادی

15.7 نمونۂ امتحانی سوالات

15.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا ابوالکلام آزاد نے وزیر تعلیم کا عہدہ کب سنبھالا تھا؟
2. مولانا آزاد نے تعلیم کے لیے مخصوص بجٹ کو کتنے فیصد بڑھانے کی تجویز رکھی تھی؟
3. مولانا آزاد نے تعلیم کے بارے میں کون سے پانچ پروگرام پیش کیے تھے؟
4. مولانا آزاد کو بھارت رتن سے کب نوازا گیا؟
5. حکومت ہند نے 11/نومبر کو یوم تعلیم کے طور پر منانے کا اعلان کیا۔ یہ تاریخ کیوں اہم ہے؟
6. یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کا قیام کب عمل میں آیا؟
7. ساہتیہ اکادمی کا پرانا نام کیا تھا؟
8. للت کلا اکادمی کس نے قائم کیا؟
9. مولانا آزاد کو بھارت رن کے اعزاز سے کب نوازا گیا؟

10. مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کہاں قائم کی گئی ہے؟

15.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ہماری حکومت نے کیا کیا؟ لکھیے۔
2. یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قیام کب ہوا اور اس کے کیا کام تھے؟ بیان کیجیے۔
3. عورتوں کی تعلیم کے بارے میں مولانا آزاد کی کیا رائے تھی؟ واضح کیجیے۔
4. مولانا آزاد نے تعلیم کے کون کون سے پہلوؤں پر کام کیا؟ بیان کیجیے۔
5. مولانا آزاد کے خیال میں آزاد ہندوستان کے لیے کون سی راہ مفید ہو سکتی تھی؟ واضح کیجیے۔

15.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. "مولانا آزاد نے تعلیم کے ہر پہلو پر کام کیے"۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ اپنی رائے کی مثالوں کے ساتھ وضاحت کیجیے۔
2. مولانا آزاد کے تعلیمی نظریات پر بحث کیجیے۔
3. وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد کے کاموں کا جائزہ لیجیے۔

15.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. مولانا آزاد کی تقریریں	مرتب: انور عارف
2. ابوالکلام آزاد کا ذہنی سفر	ظ-انصاری
3. مولانا آزاد: ایک ہمہ جہت شخصیت	ڈاکٹر شجاعت علی راشد
4. خطباتِ آزاد	مرتبہ: مالک رام
5. مولانا ابوالکلام آزاد: فکر و فن کی چند جہتیں	ضیاء الحسن فاروقی
6. ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت	رشید الدین خان
7. مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ	ڈاکٹر بشریٰ رحمان

اکائی16: مولانا آزاد کے قائم کردہ ادارے

اکائی کے اجزا

16.0		تمہید
16.1		مقاصد
16.2		مولانا آزاد کے قائم کردہ ادارے
	16.2.1	یونیورسٹی گرانٹ کمیشن
	16.2.2	ساہتیہ اکادمی
	16.2.3	انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز
	16.2.4	آئی آئی ٹی، کھڑکپور
	16.2.5	للت کلا اکادمی
	16.2.6	سنگیت ناٹک اکادمی
	16.2.7	دہلی پبلک لائبریری
16.3		اکتسابی نتائج
16.4		کلیدی الفاظ
16.5		نمونۂ امتحانی سوالات
	20.5.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	16.5.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	16.5.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
16.6		تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید

کسی بھی ملک اور قوم کی ترقی میں اداروں خصوصاً سرکاری (حکومتی) اداروں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اسی لیے سرکاری سطح پر مختلف

قسم کے ادارے قائم کیے جاتے ہیں، جن کا مقصد انتظامی امور اور حکومتی کاموں کی انجام دہی ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ایسے ادارے بھی قائم کیے جاتے ہیں، جن کا تعلق عوام کی فلاح و بہبود سے ہوتا ہے۔ جیسے تعلیمی ادارے، عوام کی صحت و تندرستی سے متعلق ادارے، بلدی سہولتیں فراہم کرنے والے ادارے، زرعی ادارے، ثقافتی ادارے وغیرہ۔ ان میں تعلیمی اداروں کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ یہی ادارے بالآخر تمام اداروں کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ حکومت کے تمام ادارے کسی نہ کسی وزارت کے تحت ہوتے ہیں۔ مرکزی تعلیمی ادارے مرکزی وزارت تعلیم کے تحت کام کرتے ہیں۔ حصول آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد ملک کے پہلے وزیر تعلیم بنے۔ وہ بہت بڑے عالم اور دانشور تھے۔ انہیں نہ صرف تعلیم کی اہمیت کا ادراک تھا بلکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہندوستان تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہے جب کہ ملک کی ترقی کے لیے تعلیم ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ چناں چہ انہوں نے اپنے دورِ وزارت میں ابتدائی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، سائنسی تعلیم اور ٹکنالوجی کی تعلیم کے لیے متعدد ادارے قائم کیے۔

تعلیم کی طرح مولانا آزاد تہذیب و ثقافت کی اہمیت سے بھی خوب آگاہ تھے۔ ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عظمت اور ثروت مندی کی بقا کے لیے انہوں نے متعدد ثقافتی ادارے بھی قائم کیے، جو ان کی یادگار ہیں۔ اس اکائی میں ہم مولانا آزاد کے قائم کردہ اداروں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- ملک و قوم کی ترقی میں ادارے کی اہمیت کیا ہے؟ اس کو سمجھ سکیں۔
- مولانا آزاد کے قائم کردہ ادبی، علمی، سائنسی اور ثقافتی اداروں سے واقف ہو سکیں۔
- "یونیورسٹی گرانٹ کمیشن"(UGC) کی کارکردگی سے واقف ہو سکیں۔
- "ساہتیہ اکادمی" کی اہمیت اور قیام کے مقاصد بیان کر سکیں۔
- "انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز " سے واقف ہو سکیں۔
- "للت کلا اکادمی" اور "سنگیت ناٹک اکادمی" میں ہونے والے تہذیبی و ثقافتی پروگراموں سے واقف ہو سکیں۔
- "آئی آئی ٹی، کھڑکپور" کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔
- "دہلی پبلک لائبریری" سے واقف ہو سکیں۔

16.2 مولانا آزاد کے قائم کردہ ادارے

مولانا ابوالکلام آزاد، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ جمہوری اقدار کو فروغ دینے کے لیے تعلیم اشد ضروری ہے۔ مولانا آزاد ملک و قوم کی ترقی کے لیے نہ صرف تعلیم کو اہمیت دیتے تھے بلکہ ایک صحت مند معاشرے کے لیے تعلیم کے ساتھ

ساتھ فنون لطیفہ کو بھی انتہائی ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہد وزارت میں کئی ایسے ادارے قائم کیے، جن کا مقصد تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبی، علمی اور ثقافتی فنون کو فروغ دینا تھا۔

مولانا آزاد کی دور رس نگاہیں ہندوستان کی ترقی کے لیے ٹکنیکل تعلیم کو بہت ضروری سمجھتی تھیں۔ 6 فروری 1958 کو مولانا آزاد نے "سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن" کی آخری تقریر میں کہا تھا:

> جب میں نے 1947 میں وزارتِ تعلیمات کا چارج لیا تھا تو میں نے محسوس کیا تھا کہ ہماری تعلیمی مشکلات کا حل مرکز اور ریاستوں کے اشتراکِ باہم کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ حالاں کہ تعلیم کا محکمہ صوبوں میں صوبائی ذمہ داری ہے، لیکن جب تک ہم اپنی منزل کے نشانوں تک نہ پہنچ جائیں مرکز کو پوری مدد کرنی چاہیے۔"

چناں چہ جب مولانا آزاد نے اپنا عہدہ سنبھالا تو تعلیمات کا بجٹ صرف دو کروڑ روپیہ سالانہ تھا، جو بڑھا کر تیس کروڑ روپیہ کر دیا تھا۔ مولانا آزاد کا یہ کہنا تھا کہ ہمارے پنج سالہ پلان کا مقصد محض پیداوار، صنعت و حرفت، بجلی، ذرائع آمد و رفت اور دوسری مدوں میں ترقی کرنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اہل ملک کی بالعموم اور نئی نسل کی بالخصوص ذہنی تربیت صحیح طریقے پر ہو اور انہیں اچھا شہری بنایا جائے۔ کسی قسم کی ترقی کوئی فائدہ نہیں دے گی اگر ہماری تعلیم پیچھے رہ جائے گی۔

مولانا آزاد ہر میدان میں بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ملک میں سائنسی یا دوسری قسم کی استعداد کی کمی نہیں ہے، ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس کی تربیت کس طرح کی جائے۔ سائنسی اور ٹکنیکل تعلیم کی طرف تو ہر وقت ان کا دھیان رہتا تھا۔ 1950 میں مولانا آزاد نے "سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن" کی میٹنگ میں جو تقریر کی تھی اس سے ان کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا آزاد نے کہا کہ ٹکنیکل تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے ہمارا پروگرام یہ ہے کہ موجود درس گاہوں کی ترقی و توسیع کے علاوہ چار مزید اعلیٰ درجے کی ٹکنالوجیکل درس گاہیں قائم کی جائیں۔ کلکتے کے نزدیک قائم شدہ ٹکنالوجیکل درس گاہوں کی توسیع و ترقی کا کام ہم نے فی الفور ہاتھ میں لے لیا ہے۔ حالاں کہ ضروری عمارت بھی موجود نہیں، لیکن مجھے امید ہے اگلے تعلیمی سال ہی میں اساتذہ اور طلبا یہاں کام کرتے نظر آئیں گے۔

19 اکتوبر 1945 کو حکومت ہند نے سارجنٹ رپورٹ اصولاً تسلیم کر لی کہ ٹکنیکل ایجوکیشن کی ایک نیشنل کونسل قائم کی جائے تاکہ ٹکنیکل تعلیم کو فروغ دیا جا سکے۔ یہ کونسل ایک مشاورتی بورڈ کی حیثیت سے 30 نومبر 1945 کو وجود میں آئی اور این۔ آر۔ سرکار اس کے صدر مقرر ہوئے۔ 1953 میں اس کونسل کے دستور میں ترمیم کی گئی اور اس کا چیئرمین اس وقت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کو تجویز کیا گیا۔ 8 فروری 1955 کو مولانا آزد نے اس کونسل کی صدر کی حیثیت سے ایک تقریر کی، جس میں انہوں نے کہا:

> "مجھے کونسل کے کام سے دلچسپی رہی ہے اور اب میں اس سے قریب تر ہو جاؤں گا۔ گورنمنٹ نے بعض چھوٹی درس گاہوں کی ترقی کے لیے ڈیڑھ کروڑ روپیہ وقف کیا ہے۔ گورنمنٹ نے چار اونچے

ادارے قائم کرنے کی تجویز بھی منظور کر لی ہے اور ٹکنیکل کی درس گاہوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی منظور کیا ہے کہ صنعتی پرنٹنگ کی اسکیمیں بھی قائم کی جائیں۔"

مولانا آزاد ہر قسم کی امداد دینے کے لیے آمادہ رہتے تھے۔ خواہ وہ بلڈنگ کی توسیع کی شکل میں، خواہ مزید مشینیں منگوانے کی شکل میں۔ جدید تعلیم کے مسلح نئے استادوں کو بھی بھرتی کرنے سے انہوں نے گریز نہیں کیا اور مقامی صاحبانِ اقتدار کی ہر ممکن مدد کی۔ اس کے علاوہ مولانا آزاد کو فنون لطیفہ سے بھی کافی دلچسپی تھی۔ شعر و شاعری سے انہیں خاص شغف تھا۔ موسیقی سے بھی واقف تھے اور اس پر جان بھی دیتے تھے۔ اپنے عہد وزارت میں انہوں نے فنون لطیفہ سے متعلق تین اہم ادارے قائم کیے، جو ہیں تو حکومت کے قائم کردہ اور ان کے مصارف وازارتِ تعلیم برداشت کرتی ہے، لیکن ان کی کونسلیں الگ الگ بن گئیں۔ ساہتیہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی اور للت کلا اکادمی۔ یہ اکادمیاں اپنی عظمت و سطوت کی وجہ سے آج بھی ہندوستان کے اہم اداروں میں شامل ہیں۔ یہاں سے ملنے والے انعام واکرام کو سند سمجھا جاتا ہے۔ ان اداروں کے مقاصد خاص میں سے ایک اہم مقصد عوام کے مذاق کی تربیت اور فنون لطیفہ وادب کی ترویج واشاعت ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا تھا:

"اکادمی کا مقصد عوام کے ذوق کی تربیت اور ادب کا ارتقا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل اس صورت میں ہو سکتی ہے اگر ہم بلند ترین معیار برقرار رکھیں، جب معیار بلند ترین ہوگا تو ارباب قلم کا سارا زور ایسی تخلیقات پر صرف ہوگا، جو مستقبل میں انسانیت کی میراث یا نسل انسانیت کا ورثہ بن سکیں۔ میرا خیال ہے کہ فرانسیسی اکادمی کی مثال سے معیار کے مسئلہ کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ اکادمی کے آئین کی تشکیل کے وقت ہماری نظر ان اہم امور پر تھی۔ ہم نے سوچا کہ ہم اکادمی کی رکنیت کی اساس انہی اصولوں پر رکھیں، جو فرانسیسی اکادمی کے ساتھ مخصوص رہے ہیں تو پھر اس کے قیام میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ابھی ہندوستان نے ادبی ترقی میں وہ مقام حاصل نہیں کیا ہے۔"

یہ تینوں ادارے مولانا آزاد کی دوراندیشی ، انسان دوستی اور تعلیمی نظام سے خصوصی دلچسپی کے مظہر ہیں۔ ان اداروں کے ذریعے وہ ہندوستان کے تہذیبی و ثقافتی ورثے کی بقا چاہتے تھے، تا کہ آنے والی نسلیں اس سے مستفید ہو سکیں۔ مولانا آزاد نے آرٹ کے فروغ میں عوامی اور غیر سرکاری اداروں کے باہمی تعاون پر کافی زور دیا ہے ان اکادمیوں کے قیام کا مقصد ادب اور فنون لطیفہ کے معیار و میزان کو بلند کرنا تھا۔ مولانا آزاد کی قیادت اور دانش مندی سے ادب ، موسیقی ، فن تعمیر ، مصوری اور مجسمہ سازی وغیرہ کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ ان اکادمیوں کے قیام کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد حسن لکھتے ہیں:

"فنون لطیفہ اور ادبیات کے فروغ کے لیے مولانا آزاد نے اکادمیوں کی بنیادڈالی۔۔۔۔۔ ادب کے لیے ساہتیہ اکادمی ، رقص و موسیقی کے لیے سنگیت ناٹک اکادمی اور مصوری وغیرہ کے لیے للت کلا اکادمی۔ان تینوں اکادمیوں کے سربراہ مولانا آزاد ہی تھے اور ان اکادمیوں کا یہی کام نہیں تھا کہ وہ ملک کے مقتدر رفن کاروں کو انعام واکرام تقسیم کریں ، بلکہ یہ بھی تھا کہ وہ ملک کے مختلف علاقوں کے ادبی اور فنی میلانات کو سمو کر، انھیں قومی سطح پر ایک فنی وحدت اور فروغ عطا کریں۔"

ان اداروں کے علاوہ بھی مولانا آزادنے کئی ادبی اور تعلیمی ادارے قائم کیے۔ذیل میں مولانا آزاد کے قائم کردہ چند اہم اداروں کا تذکرہ کیاجارہاہے۔

16.2.1 یونیورسٹی گرانٹ کمیشن:

ہندوستان میں قومی نظام تعلیم کی تشکیل کی پہلی کوشش 1944 میں ہندوستان میں جنگ کے بعد کی تعلیمی ترقی پر سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی رپورٹ کے ساتھ ہوئی جسے سارجنٹ رپورٹ بھی کہا جاتا ہے۔اس نے یونیورسٹی گرانٹس کمیٹی کے قیام کی سفارش کی، جو کہ 1945 میں قائم کی گئی تھی تاکہ علی گڑھ، بنارس اور دہلی کی تین مرکزی یونیورسٹیوں کے کام کی نگرانی کی جا سکے۔1947 میں کمیٹی کو تمام موجودہ یونیورسٹیوں سے نمٹنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

آزادی کے فوراً بعدیونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن 1948 میں ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن کی سربراہی میں ہندوستانی یونیورسٹی کی تعلیم کے بارے میں رپورٹ کرنے اور ایسی اصلاحات اور توسیع تجویز کرنے کے لیے قائم کیا گیا جو ملک کی موجودہ اور مستقبل کی ضروریات اور خواہشات کے مطابق مطلوبہ ہوں۔. یہ ممکن ہے اس نے سفارش کی کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیٹی کو برطانیہ کے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے عمومی ماڈل پر دوبارہ منظم کیا جائے جس میں ایک کل وقتی چیئرمین اور ممتاز ماہرین تعلیم میں سے دیگر ممبران کا تقرر کیا جائے۔

مرکزی حکومت نے 1952 میں فیصلہ کیا کہ مرکزی یونیورسٹیوں اور دیگر یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں کو عوامی فنڈز سے گرانٹ ان ایڈ کی تقسیم سے متعلق تمام معاملات یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو بھیجے جا سکتے ہیں۔نتیجے کے طور پر، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا باقاعدہ افتتاح 28 دسمبر 1953 کو اس وقت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔

تاہم یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو باضابطہ طور پر حکومت ہند کے ایک قانونی ادارے کے طور پر نومبر 1956 میں پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے ہندوستان میں یونیورسٹی کی تعلیم کے معیارات کو مربوط کرنے، تعین کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔یو جی سی کے دفاتر دہلی میں تین مقامات پر واقع ہیں: بہادر شاہ ظفر مارگ، 35، نئی دہلی میں فیروز شاہ روڈ اور دہلی یونیورسٹی کا جنوبی کیمپس۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو ملک کی واحد گرانٹ دینے والی ایجنسی ہونے کا منفرد اعزاز حاصل ہے جس کو دو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں: فنڈز فراہم کرنا اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں ہم آہنگی اور معیار کا تعین برقرار رکھنا۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے مینڈیٹ میں درج ذیل باتیں شامل ہیں:

- یونیورسٹی کی تعلیم کو فروغ دینے اور مربوط کرنے کے لیے۔
- یونیورسٹیوں میں تدریس، امتحان اور تحقیق کے معیارات کا تعین اور اسے برقرار رکھنا۔
- تعلیم کے کم سے کم معیارات پر اصول بنانا۔
- کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے میدان میں پیش رفت کی نگرانی کرنا؛ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں گرانٹس کی تقسیم کرنا۔
- یونین اور ریاستی حکومتوں اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں کے درمیان ایک اہم لنک کے طور پر کام کرنا۔
- یونیورسٹی کی تعلیم کو بہتر بنانے کے لیے ضروری اقدامات کے بارے میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو مشورہ دینا۔

16.2.2 ساہتیہ اکادمی:

ہندوستان کی آزادی سے بہت پہلے، برطانوی حکومت کے پاس ہندوستان میں ایک قومی ادارہ برائے ادب کے قیام کی تجویز زیر رکھی تھی۔ 1944 میں حکومت ہند نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی تجویز کو اصولی طور پر قبول کر لیا کہ تمام علاقوں میں ثقافتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ایک قومی ثقافتی ٹرسٹ تشکیل دیا جائے۔ ساہتیہ اکادمی سمیت ٹرسٹ کے تحت تین اکیڈمیاں تھیں۔ آزادی کے بعد آزاد حکومت ہند کی طرف سے اس تجویز کی پیروی کرنے اور ایک تفصیلی خاکہ تیار کرنے کے لیے کئی میٹنگیں بلائی گئیں۔ متفقہ طور پر تین قومی اکیڈمیاں بنانے کا فیصلہ کیا گیا، ایک ادب کے لیے، دوسری بصری فنون کے لیے اور تیسری رقص، ڈرامہ اور موسیقی کے لیے۔ لیکن اس میں اختلاف تھا کہ آیا حکومت کو اکیڈمیوں کے قیام کے لیے ضروری اقدامات کرنے چاہئیں یا ان لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیے جن کے پاس اکیڈمیاں قائم کرنے کا اخلاقی اختیار ہو۔ مرکزی وزیر تعلیم ابوالکلام آزاد کا خیال تھا کہ "اگر ہم اکادمیوں کے بغیر ترقی کرنے کا انتظار کریں گے تو شاید کبھی بھی ترقی نہیں کر پائیں گے۔"

اس عمل میں حکومت نے جو کام کیا وہ پردے کو اٹھانے جیسا تھا۔ حکومت نے اکیڈمیاں قائم کیں، لیکن ایک بار قائم ہونے کے بعد وہ کسی کے کنٹرول میں نہیں رہیں اور انہیں خود مختار اداروں کے طور پر کام کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ حکومت ہند نے دسمبر 1952 میں ساہتیہ اکادمی کے نام سے ایک قومی ادبی سوسائٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ساہتیہ اکادمی کا باقاعدہ افتتاح حکومت ہند نے 12 مارچ 1954 کو کیا تھا۔ حکومت ہند کی تجویز جس میں اکادمی کا یہ آئین مرتب کیا گیا تھا، اکادمی کی یہ تعریف بیان کی ہے۔ ہندوستانی ادب کی فعال ترقی کے لیے کام کرنے والا ایک قومی ادارہ، جس کا مقصد اعلیٰ ادبی معیارات کو قائم کرنا ہے، اسے فروغ دینا ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں ادبی

سرگرمیوں کو ہم آہنگ کرنا اور پروان چڑھانا ہو گا اور ان کے ذریعے ملک کے ثقافتی اتحاد کو بہتر بنانا ہو گا۔ اگرچہ اکادمی حکومت کی طرف سے قائم کی گئی ہے، لیکن یہ ایک خود مختار ادارے کے طور پر کام کرتی ہے۔

ہندوستان کی "نیشنل اکیڈمی آف لیٹرز" ساہتیہ اکادمی ملک بھر میں ادبی مکالمے، اشاعت اور نشر و اشاعت کا مرکزی ادارہ ہے اور یہ واحد ادارہ ہے جو ہندوستان کی چوبیس زبانوں میں ادبی سرگرمیوں کو فروغ دیتا ہے، جس میں انگریزی بھی شامل ہے۔ اپنے متحرک وجود کے ذریعے، اس نے اپنی مسلسل کوششوں کے ذریعے خوبصورت ادب اور پڑھنے کی صحت مند عادات کو فروغ دیا ہے۔ اس نے مختلف لسانی اور ادبی شعبوں میں سیمینارز، لیکچرز، سمپوزیا، مباحثوں، پڑھنے اور پیشکشوں کے ذریعے گہرے مکالمے کو زندہ رکھا ہے۔ ورکشاپس اور انفرادی معاہدوں کے ذریعے باہمی تراجم کی رفتار کو تیز کیا گیا ہے۔ رسالوں، مونوگرافس، ہر صنف کے انفرادی تخلیقی کاموں کے مجموعوں، انسائیکلوپیڈیا، لغات، کتابیات، ہندوستانی مصنفین کی لغت اور ادبی تاریخ کی اشاعت کے ذریعے ایک سنجیدہ ادبی ثقافت تیار ہوئی ہے۔ اکادمی نے اب تک 6000 سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں، اکادمی ہر 19 گھنٹے میں ایک کتاب شائع کر رہی ہے۔ ہر سال اکیڈمی علاقائی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر کم از کم 50 سیمینار منعقد کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال منعقد ہونے والی ورکشاپس اور ادبی جلسوں کی تعداد 300 کے قریب ہے۔ یہ پروگرام میٹ دی رائٹر، سمواد، کاویسندھی، کتھاسندھی، لوک: ویودھ سوار، ویاکتی اور کریتی، میرے جھروکے سے، اسمیتا، انترال، اویشکر، ناری چیتنا، یووا ساہتیہ، بچوں کا ادب، پوروونتری اور ساہتیہ جیسی سیریز کے تحت ہیں۔

ہر سال اکادمی اپنی تسلیم شدہ چوبیس زبانوں میں ادبی کاموں کے لیے ایوارڈ دیتی ہے اور ان زبانوں میں باہمی ادبی تراجم کے لیے بھی ایوارڈز دیے جاتے ہیں۔ ان ایوارڈز کا اعلان ایک سال کی چھان بین، بحث اور انتخاب کے بعد کیا جاتا ہے۔ اکادمی ان زبانوں کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو 'بھاشا سمان' سے نوازتی ہے، جنہیں ساہتیہ اکادمی نے رسمی طور پر تسلیم نہیں کیا ہے۔ یہ اعزاز "کلاسیکی اور قرون وسطی کے ادب" میں شراکت کے لیے بھی دیا جاتا ہے۔ اکادمی نامور مصنفین کو مہاتر اراکین اور اعزازی مہاتر اراکین کے طور پر منتخب کر کے ان کو اعزاز دیتی ہے۔ آنند کمار سوامی اور پریم چند کے نام پر فیلوشپ بھی قائم کی گئی ہے۔ اکادمی نے بنگلورو، احمد آباد، کلکتہ اور دہلی میں ترجمے کے مراکز اور دہلی میں ایک ہندوستانی ادبی ذخیرہ قائم کیا ہے۔ شمال مشرقی ہل یونیورسٹی کیمپس، شیلانگ میں قبائلی اور زبانی ادب کے پروجیکٹ کے نفاذ کے لیے ایک پروجیکٹ آفس قائم کیا گیا تھا۔ فی الحال اس دفتر کو اگر تلہ منتقل کر دیا گیا ہے اور بہت سے تصوراتی منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی ثقافتی اور لسانی اختلافات کا علم رکھتی ہے اور معیارات اور رجحانات کو تباہ کر کے مصنوعی معیار سازی پر یقین نہیں رکھتی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گہرے بین الثقافتی، تاریخی اور تجرباتی دھاگوں سے بھی واقف ہے جو ہندوستانی ادب کے متنوع تاثرات کو یکجا کرتے ہیں۔ دنیا کے مختلف ممالک کے ساتھ یہ اتحاد اکیڈمی کے ثقافتی تبادلے کے پروگراموں کے ذریعے عالمی سطح پر ایک بین الاقوامی نسلی جہت کو تلاش کرتا ہے۔

اکادمی کی حتمی طاقت ننانوے رکنی کونسل (جنرل کونسل) کو حاصل ہے، جس کی تشکیل مندرجہ ذیل طریقے سے کی گئی ہے: چیئرمین، مالیاتی مشیر، حکومت ہند کے نامزد کردہ پانچ اراکین، اکادمی کے پینتیس نمائندے حکومت ہند کی ریاستیں اور مرکز کے زیر انتظام

علاقے، جن کا تقرر ساہتیہ اکادمی نے کیا ہے، تسلیم شدہ زبانوں کے 20 نمائندے، ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے 20 نمائندے، ادب کے میدان میں ان کی کارکردگی کے لیے آٹھ افراد منتخب کیے گئے ہیں اور سنگیت ناٹک اکادمی۔ للت کلا اکادمی، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، انڈین پبلشرز ایسوسی ایشن اور راجہ رام موہن رائے لائبریری فاؤنڈیشن کا ایک ایک نمائندہ۔

کونسل کی میعاد پانچ سال ہے۔ اکیڈمی کے قیام کے بعد موجودہ کونسل چودھویں ہے اور اس کا پہلا اجلاس 2018 میں ہوا تھا۔ اکیڈمی کے صدر، نائب صدر، زبانوں کی نمائندگی کرنے والے ایگزیکٹو بورڈ کے اراکین اور فنانس کمیٹی کے لیے جنرل کونسل کے نمائندے کا انتخاب کونسل کرتا ہے۔ مختلف زبانوں کے لیے مشاورتی بورڈ ایگزیکٹو بورڈ کے ذریعے مقرر کیے جاتے ہیں۔

ساہتیہ اکادمی کے پہلے صدر پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ 1963 میں وہ دوبارہ صدر منتخب ہوئے۔ مئی 1964 میں ان کی موت کے بعد جنرل کونسل نے ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن کو اس کا صدر منتخب کیا۔ فروری 1968 میں نئی تشکیل شدہ کونسل نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو ساہتیہ اکادمی کا صدر منتخب کیا۔ مئی 1969 میں ان کی موت کے بعد کونسل نے ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کو اپنا صدر منتخب کیا۔ فروری 1973 میں وہ دوبارہ کونسل کے صدر منتخب ہوئے۔ مئی 1977 میں ان کی وفات کے بعد نائب صدر پروفیسر کے۔ آر۔ سری نواس آئینگر کو ساہتیہ اکادمی کا کارگزار صدر بنایا گیا۔ فروری 1978 میں پروفیسر۔ اوماشنکر جوشی صدر منتخب ہوئے۔ فروری 1983 میں پروفیسر۔ وی کے گوکاک صدر منتخب ہوئے۔ فروری 1988 میں ڈاکٹر بیرندر کمار بھٹاچاریہ ساہتیہ اکادمی کے صدر منتخب ہوئے۔ 1993 میں پروفیسر این۔ آر۔ اننت مورتی صدر منتخب ہوئے۔ 1998 میں شری رماکانت رتھ صدر منتخب ہوئے۔ 2003 میں پروفیسر۔ گوپی چند نارنگ صدر منتخب ہوئے۔ جناب سنیل گنگوپادھیائے کو 2008-2012 کے لیے تشکیل نو جنرل کونسل نے اکیڈمی کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔ اکتوبر 2012 میں شری گنگوپادھیائے کی موت کے بعد، پروفیسر۔ وشوناتھ پرساد تیواری کو انچارج صدر مقرر کیا گیا۔ 18 فروری 2013 کو منعقدہ تنظیم نو جنرل کونسل کے ذریعے پروفیسر وشوناتھ پرساد تیواری 2013-2017 کے لیے اکادمی کے صدر منتخب ہوئے۔ 2018 میں منعقدہ تنظیم نو جنرل کونسل کے ذریعے پروفیسر چندر شیکھر کمبر 2018-2022 کے لیے اکیڈمی کے صدر منتخب ہوئے۔ ساہتیہ اکادمی کے موجودہ صدر "مادھو کوشک" ہیں۔

16.2.3 انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز:

ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کا ایک مقصد دنیا کے ممالک کے ساتھ ثقافتی تعلقات کو بحال کرنا اور مضبوط کرنا تھا۔ اس کی عکاسی 1946 میں نئی دہلی میں ہونے والی تاریخی ایشیائی تعلقات کانفرنس میں ہوئی تھی جس میں دیگر ایشیائی ممالک کے ساتھ قریبی ثقافتی تعلقات کو بحال کرنے اور اسے فروغ دینے کے لیے ہندوستان کی ثقافت کو "ہندوستانی ثقافتی تہذیب" کے ذریعے پیش کرنے کے لیے انڈین کونسل فار کلچرل کوآپریشن قائم کیا گیا تھا۔ تقریباً تین سال بعد انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا باقاعدہ افتتاح اپریل 1950 میں ہوا۔ تاہم اس کا دائرہ کار صرف ایشیائی خطے تک

محدود نہیں تھا۔وزیر اعظم جواہر لعل نہرو اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد (جو 1950 سے 1958 تک ICCR کے صدر تھے) نے باقی دنیا کے ساتھ قریبی ثقافتی تعلقات استوار کرنے کے کام کو شامل کرنے کے لیے اپنے دائرہ کار کو بڑھایا۔

اس کے مقاصد جیسا کہ میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں بیان کیا گیا ہے ان میں درج ذیل شامل ہیں:

- ہندوستان اور دوسرے ممالک کے درمیان ثقافتی تعلقات اور باہمی افہام و تفہیم کو قائم کرنا، بحال کرنا اور مضبوط کرنا۔
- دوسرے ممالک کے ساتھ ثقافتی تبادلے کو فروغ دینا۔
- اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے تمام ضروری اقدامات کو اپنانا۔

اپنے قیام سے لے کر 1958 تک، ICCR وزارت تعلیم کے انتظامی دائرہ اختیار میں تھا۔یہ انتظام 22 اپریل 1970 تک جاری رہا۔ کابینہ کمیٹی برائے امور خارجہ کے فیصلے کے بعد کونسل کا دائرہ اختیار وزارت خارجہ کو منتقل کر دیا گیا۔منتقلی کی تجویز 1967 میں شری ایم سی نے دی تھی۔اس کی شروعات چھاگلہ نے کی تھی۔یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ شری چھاگلا نے یہ فیصلہ وزیر تعلیم کے طور پر اپنے سابقہ چارج سے وزیر خارجہ کے طور پر تقرری کے بعد لیا تھا۔

کونسل کو ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا ایک مؤثر آلہ بنانے کے مقصد سے وزارت خارجہ نے 71-1970 میں کونسل کا انتظامی اور آپریشنل کنٹرول سنبھال لیا۔1978 میں، اشوک مہتا کمیٹی کی سفارشات کے پیش نظر، کونسل نے محکمہ ثقافت سے بیرون ملک جانے والے ثقافتی ٹولوں اور بیرون ملک سے ہندوستان آنے والی تمام ثقافتی سرگرمیوں اور ثقافتی تبادلے کے پروگراموں کے نفاذ سے متعلق کام سنبھال لیا۔

ابتدائی سالوں میں، ICCR کے دو طرح کے اہداف اور مقاصد تھے:

- ہندوستانی ثقافت اور ورثے کو بین الاقوامی ثقافتی نقشے پر پیش کرنا اور ہندوستان کو ہندوستانی نقطہ نظر سے پیش کرنا تاکہ نوآبادیاتی دور میں ہندوستان کے بارے میں پیدا ہونے والی مختلف تحریفات کو درست کیا جا سکے۔
- دوسرے ممالک، خاص طور پر نئے ابھرتے ہوئے ممالک کے ساتھ عوام کے درمیان رابطے پیدا کرنا۔

مجموعی طور پر، ICCR کی سرگرمیوں نے ان وسیع مقاصد کو حاصل کرنے میں مدد کی ہے۔

16.2.4 آئی آئی ٹی، کھڑکپور:

مولانا آزاد نے 18 اگست 1951 کو ایک ٹکنیکل ادارہ" آئی آئی ٹی، کھڑکپور "یعنی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، کھڑکپور کا افتتاح کیا اور اس کے افتتاحی تقریر میں مولانا آزاد نے کہا:

> "میں نے عہدہ سنبھالتے ہی پہلے پہل یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہمیں ٹکنیکل تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع اتنے اچھے بنا دینا چاہیے کہ اہم اپنی ضرورتیں پوری کر سکیں۔ ہمارے نوجوانوں کی بہت بڑی

تعداد اعلیٰ تعلیم کے لیے غیر ملکوں کو جاتی ہے، انہیں یہ ٹریننگ یہیں مل سکے۔ جب ہم ٹکنیکل تربیت اس اونچے معیار کی دے سکیں گے تو باہر کے لوگ یہاں آئیں گے۔"

کھڑکپور انسٹی ٹیوٹ مولانا آزاد کے کارناموں میں سے ایک عظیم کارنامہ ہے۔ ماہ جولائی 1955 میں سینکڑوں کامیاب طلبا کا پہلا دستہ جب یہاں سے پاس کر کے نکلا تو ہر کامیاب طالب علم کی جیب میں ملازمت کی دعوتیں تھی۔ اسے کہتے ہیں دور بیں اور دور رس رہنما کی رہنمائی۔ یہاں ہر طرح کی انجینئرنگ کی تعلیم اور تحقیق کے کام کو فروغ ملا۔ 1947 کے شروع میں ڈاکٹر سر شانتی سروپ بھٹناگر کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم ہوئے جس کا کام تھا کہ سائنسی کام کرنے کے قابل افراد کا اندازہ لگائے تاکہ اس کے زیر نظر اعلیٰ تعلیم کے لیے سہولتیں اور جدید درس گاہوں کی تعداد میں اضافے کا نتظام کیا جائے۔

اگست 1951 میں جب آئی آئی ٹی، کھڑکپور کا پہلا سیشن شروع ہوا تو اس میں 224 طالب علم اور 42 اساتذہ تھے۔ اس کی کلاسیز، تجربہ گاہ اور انتظامی دفاتر ،ہجلی جیل کیمپ کی تاریخی عمارت میں قائم کیے گئے۔ انسٹی ٹیوٹ نے اپنا تعلیمی پروگرام صرف دس محکموں کے ساتھ شروع کیا تھا۔ اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو نے مارچ 1952 کو آئی آئی ٹی کھڑکپور کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔

موجودہ کیمپس کی ترتیب اور عمارتوں کے ڈیزائن کو سوئس ماہر تعمیرات ڈاکٹر ورنر ایم موزر کی رہنمائی میں انجینئرز اور آرکیٹیکٹس کے ایک گروپ نے انجام دیا۔ وزارتِ صنعت نے متعدد مشینوں کی خریداری کے لیے مالی مدد میں ایک بڑی رقم فراہم کی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ ورکشاپ کو ملک کی بہترین ورکشاپوں میں سے ایک مانتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کافی خوش قسمت تھی کہ ڈاکٹر جی سی گھوش، جو ایک نامور سائنسدان تھے، اس کے پہلے ڈائریکٹر بنے، جن کی نگرانی میں انسٹی ٹیوٹ نے اپنے ابتدائی سالوں میں کافی ترقی کی۔ اس ادارے کے پہلے بورڈ آف گورنرز کے چیئرمین کے ڈاکٹر بی سی رائے اور جناب این آر سرکار، سر جہانگیر جے گاندھی، ڈاکٹر تاراچند، جناب کے آر کے مینن، جناب ٹی سیواشنکر، ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر، مسٹر ایچ کبیر اور ڈاکٹر جے سی گھوش اراکین تھے۔ یورپ کے بعض نامور اسکالرز بھی اس انسٹی ٹیوٹ کے ابتدائی سالوں میں اس سے جڑے۔ ان میں سے پہلے دو اسکالرز پروفیسر آر۔ اے۔ کراؤس اور پروفیسر ایچ۔ ٹیشنر تھے۔ پروفیسر ٹیشنر الیکٹرانکس اور ای سی ڈیپارٹمنٹ کے پہلے صدر بھی تھے۔

15 ستمبر 1956 کو ہندوستان کی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا، جسے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی (کھڑکپور) ایکٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس قانون میں اس انسٹی ٹیوٹ کو قومی اہمیت کا ادارہ قرار دیا گیا۔ انسٹی ٹیوٹ کو خود مختار یونیورسٹی کا درجہ بھی دیا گیا۔ 1951 میں اس چھوٹے آغاز سے اب تک آئی آئی ٹی، کھڑکپور نے کافی ترقی کی۔ یہ ہرا بھرا کیمپس 2100 ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے اور اپنے آپ ایک بستی کے مانند ہے، جس میں تقریباً 1500 افراد رہائش پذیر ہیں۔

16.2.5 للت کلا اکادمی:

للت کلا اکادمی (نیشنل اکیڈمی آف آرٹ)، نئی دہلی کا افتتاح 5 اگست 1954 کو اس وقت کے وزیر تعلیم مولانا

ابوالکلام آزاد نے کیا اور 11 مارچ 1957 کو سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ 1860 کے تحت رجسٹرڈ ہوا۔آئین میں متعین مقاصد کے حصول میں، تنظیم اپنی جنرل کونسل، ایگزیکٹو بورڈ اور دیگر کمیٹیوں کے ذریعے کام کرتی ہے۔للت کلا اکادمی حکومت کی طرف سے قائم کی گئی تین اکیڈمیوں میں سب سے چھوٹی ہے۔ہندوستان کا بصری فنون کے میدان میں اپنی توجہ مرکوز کرنے کے لیے قائم کرتا ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا تھا کہ ''اکادمی کو ماضی کی شاندار روایات کو برقرار رکھنے اور ہمارے جدید فنکاروں کے کام سے مالا مال کرنے کے لیے کام کرنا چاہیے''۔اکادمی نے ہندوستان میں عصری، جدید، لوک اور قبائلی فن کے متحرک، پیچیدگی اور کھلتے ہوئے نمونوں کی عکاسی کرنے والے اعلیٰ ترین ترتیب کے مستقل مجموعہ کو محفوظ اور دستاویز کیا ہے۔للت کلا اکادمی نئی دہلی اپنے علاقائی مراکز کے ساتھ چنئی، لکھنؤ، کولکتہ، بھونیشور، گڑھی (نئی دہلی) اور ذیلی مراکز شملہ، احمد آباد، اگرتلہ، پٹنہ میں نمائشی ورکشاپس، کیمپ لیکچرز، سابقہ شوز اور بہت سے دوسرے فن پارے پیش کرتی ہے۔۔مولانا آزاد نے 5اگست1954کو للت کلا اکادمی کا افتتاح کیا اور فرمایا:

> ''آرٹ کے میدان میں حکومت کا رول ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔بلا شبہ حکومت کو آرٹ کی ترقی کے کام میں دلچسپی لینی چاہیے، لیکن در حقیقت آرٹ صحیح معنوں میں اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا ، جب تک مضبوط غیر سرکاری ادارے اس کے لیے کوشاں نہ ہوں۔چنانچہ للت کلا اکادمی کے قیام کا بھی یہی خاص مقصد ہے۔''

16.2.6 سنگیت ناٹک اکادمی:

سنگیت ناٹک اکادمی پرفارمنگ آرٹس کے شعبے میں ملک کا اعلیٰ ادارہ ہے،جس کا قیام مولانا آزاد کے عہد وزارت میں1953 میں عمل میں آیا تھا۔اکیڈمی کے قیام کا مقصد ہندوستان کی متنوع ثقافت کے وسیع غیر محسوس ورثے کا تحفظ اور فروغ تھا جس کا اظہار موسیقی، رقص اور تھیٹر کی شکلوں میں ہوتا ہے۔اکیڈمی اس کی جنرل کونسل کے زیر انتظام ہے۔اکادمی کے صدر کو پانچ سال کی مدت کے لیے ہندوستان کے صدر کے ذریعے مقرر کیا جاتا ہے۔اکیڈمی کے کاموں کا تعین اکیڈمی کے میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں کیا گیا ہے جسے ستمبر 1961 میں بطور سوسائٹی رجسٹریشن کے وقت اپنایا گیا تھا۔اکیڈمی کا رجسٹرڈ دفتر رابندر بھون، فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ہے۔سنگیت ناٹک اکادمی دراصل وزارت ثقافت، حکومت ہند کا ایک خود مختار ادارہ ہے۔

سنگیت ناٹک اکادمی کے تین جزوی یونٹ ہیں، جن میں سے دو رقص سکھانے والے ادارے ہیں: امپھال میں جواہر لعل نہرو منی پور ڈانس اکیڈمی (جے این ایم ڈی اے)، اور دہلی میں کتھک سینٹر۔جواہر لعل نہرو منی پور ڈانس اکیڈمی حکومت ہند نے اپریل 1954 میں قائم کی تھی اور اس وقت اسے منی پور ڈانس کالج کے نام سے جانا جاتا تھا۔اپنے قیام کے بعد سے، اس کی مالی اعانت سنگیت ناٹک اکادمی نے کی، اور 1957 میں یہ اکادمی کی ایک جزوی اکائی بن گئی۔اسی طرح کتھک

مرکز کتھک رقص کے معروف تعلیمی اداروں میں سے ایک ہے۔یہ دہلی میں واقع ہے اور کتھک رقص اور موسیقی کے ساتھ ساتھ پخواج بجانے کے مختلف سطحوں پر کورسز کا انعقاد کرتا ہے۔تیسری جزوی اکائی رابندر رنگ شالہ ہے۔

جزوی اکائیوں کے علاوہ، اکیڈمی میں فی الحال پانچ مراکز ہیں:

1. کوٹیاٹم سینٹر، تروانت پورم کیرالہ کے قدیم سنسکرت تھیٹر کوٹیاٹم کے تحفظ اور فروغ کے لیے۔
2. ستریہ سنٹر، گوہاٹی آسام کی ستریا روایات کو فروغ دینے کے لیے۔
3. شمال مشرقی ہندوستان کے روایتی اور لوک پرفارمنگ آرٹس کی روایات کے تحفظ کے لیے شمال مشرقی مرکز، گوہاٹی۔
4. شمال مشرقی دستاویزی مرکز، شمال مشرق میں تہواروں اور فیلڈ دستاویزات کے لیے اگرتلہ۔
5. مشرقی ہندوستان میں چھاؤ رقص کے فروغ کے لیے چھاؤ مرکز، چندنکیاری۔

سنگیت ناٹک اکادمی ایوارڈ ان فنکاروں کو دیا جاتا ہے جنہوں نے پرفارمنگ آرٹس کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیں۔یہ فنکاروں کی اعلیٰ ترین قومی پہچان ہے۔اکادمی نامور فنکاروں اور موسیقی، رقص اور ڈرامے کے اسکالرز کو رتن کی رکنیت بھی دیتی ہے۔سال 2006 میں نوجوان فنکاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے استاد بسم اللہ خان یوتھ ایوارڈ کا قیام عمل میں آیا جو ہر سال فن کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان فنکاروں کو دیا جاتا ہے۔اکادمی کے اپنے آرکائیوز ہیں، جس میں آڈیو اور ویڈیو ٹیپ، تصویروں اور فلموں کا ایک بھرپور ذخیرہ موجود ہے۔یہ پرفارمنگ آرٹس پر مرکوز ملک کا سب سے بڑا اور جامع آرکائیوز ہے، جسے پرفارمنگ آرٹس پر تحقیق کرنے والے اسکالرز کی سہولت کے لیے تیار کیا گیا ہے۔

16.2.7 دہلی پبلک لائبریری:

دہلی پبلک لائبریری کو یونیسکو پروجیکٹ کے طور پر سنہ 1951 میں حکومت ہند نے مولانا آزاد کی وزارت میں شروع کیا تھا۔ پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن کے سامنے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم محترم پنڈت جواہر لعل نہرو نے لائبریری کا افتتاح ایک چھوٹی لائبریری کے طور پر کیا تھا۔ آج اس کی تقریبا 36 شاخیں ہیں۔ دہلی پبلک لائبریری وزارت سیاحت و ثقافت کے تحت ایک خود مختار تنظیم ہے، جسے دہلی لائبریری بورڈ کے زیر انتظام اور حکومت ہند کے ذریعہ مکمل طور پر مالی اعانت فراہم کی جاتی ہے۔ اس کے کتب خانہ میں 14 لاکھ سے زیادہ کتابوں کا ذخیرہ ہے جس میں ہندی، انگریزی، اردو، پنجابی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی کتابیں شامل ہیں۔ یہ لائبریری بچوں کو تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیاں بھی فراہم کرتی ہے، جیسے تقاریر، مباحثے، نمائشیں وغیرہ۔ دہلی پبلک لائبریری جنوبی مشرقی ایشیاء میں بھارت کی سب سے بڑی اور مصروف عوامی لائبریری ہے۔ دہلی پبلک لائبریری نے اپنی اردو کتابیں ریختہ کو پیش کی ہیں، ریختہ نے ان کتابوں کو ڈیجیٹلائز کر کے پڑھنے والوں کے لیے سہولت پیدا کر دی ہے، اب آپ دہلی پبلک لائبریری کی اہم اور نادر کتابوں سے گھر بیٹھے استفادہ کر سکتے ہیں، ان کتابوں میں مجنوں گورکھ پوری کی "نقوش و افکار"، شوکت تھانوی کی "نورتن، بلونت سنگھ کی "ہندوستان ہمارا، سعید لخت کی "ہی ہی! ہاہا،

خواجہ احمد فاروقی کی "یادیار مہرباں، مسعود مفتی کی "کھلونے، عرش ملسیانی کی "کلیات عرش ملسیانی، رئیس احمد جعفری کی 'کشکول، جوگندر پال کی "نئے کلاسیک، رضیہ بٹ کی "ممی، وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا آزاد نے ان اداراوں کے علاوہ بھی بہت سے ادارے قائم کیے، جن میں سنٹرل بورڈ آپ آرکیالوجی، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، سکنڈری ایجوکیشن کمیشن، نیشنل آرٹ ٹریژرس فنڈ، نئی دہلی، سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، روڑکی، کاؤنسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ، نئی دہلی، نیشنل انسٹی ٹیوٹ، پلانی، نیشنل اکادمی آپ لیٹرز، نئی دہلی، انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن، جے پور، انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن، میسور سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن، دہلی، کلکتہ، کٹک وغیرہ شامل ہیں۔ 8 جنوری 1954 کو یونیسکو کے نیشنل کمیشن فار کوآپریشن میں مطبوعہ ایڈریس میں مولانا آزاد نے اس بات پر زور دیا تھا کہ مشرق کے ممالک کو یہ شکایت ہے کہ یو۔ این۔ او۔ اور اس کے ادارے ان پر کم توجہ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد کی صاف گوئی اور بے باکی قابل ذکر ہے۔ ایک تقریر میں مولانا آزاد نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر دنیا میں امن و آشتی کی کرن کہیں سے پھوٹے گی تو وہ روشنی کا سرچشمہ یونیسکو ہی ہے۔

مولانا آزاد نے انڈین کونسل فار کلچر ریلیشنز قائم کی اس کا مقصد غیر ممالک سے ثقافتی اور روابط کا بڑھانا تھا۔ یہاں سے ایک سہ ماہی رسالہ "ثقافت الہند" شائع ہوتا تھا۔ اس کے پہلے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ اس رسالے سے مشرق وسطیٰ کے ممالک کو ہندوستان کی تہذیب اور کلچر سے روشناس کرانا تھا۔ دوسرا سہ ماہی رسالہ "انڈیا و ایشیا" انگریزی میں نکلتا تھا۔ اس کا بھی وہی مقصد تھا جو رسالہ ثقافت الہند کا تھا، لیکن یہ ان ایشیائی ملکوں میں زیادہ جاتا تھا، جہاں انگریزی سمجھی جاتی تھی۔ اس ادارے سے بہت سی کتابیں بھی غیر ملکوں کو بھیجی جاتی تھیں۔ کیوں کہ مولانا آزاد ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور ادب کو ان ملکوں میں روشناس کرانا چاہتے تھے۔

مولانا آزاد نے بہ حیثیت وزیر تعلیم ملک کی بہت خدمت کی۔ اس کے علاوہ ملک میں تعلیمی، ادبی اور ثقافتی ادارے قائم کر کے ملک کی ترقی میں بھی اہم رول ادا کیا۔ مولانا آزاد اپنی اس گراں قدر خدمات کی بنا پر ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

16.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مولانا ابوالکلام آزاد، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ جمہوری اقدار کو فروغ دینے کے لیے تعلیم اشد ضروری ہے۔
- مولانا آزاد ملک و قوم کی ترقی کے لیے نہ صرف تعلیم کو اہمیت دیتے تھے بلکہ ایک صحت مند معاشرے کے لیے تعلیم کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کو بھی انتہائی ضروری سمجھتے تھے۔
- مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے عہد وزارت میں کئی ایسے ادارے قائم کیے، جن کا مقصد تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبی، علمی اور ثقافتی فنون کو فروغ دینا بھی تھا۔
- مولانا آزاد کی دور رس نگاہیں ہندوستان کی ترقی کے لیے ٹکنیکل تعلیم کو بہت ضروری سمجھتی تھیں۔ 6 فروری 1958 کو مولانا آزاد

نے "سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن" کی بنیاد رکھی۔

- مرکزی حکومت نے 1952 میں فیصلہ کیا کہ مرکزی یونیورسٹیوں اور دیگر یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں کو عوامی فنڈز سے گرانٹ ان ایڈ کی تقسیم سے متعلق تمام معاملات یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو بھیجے جا سکتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا باقاعدہ افتتاح 28 دسمبر 1953 کو اس وقت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔
- حکومت ہند نے دسمبر 1952 میں ساہتیہ اکادمی کے نام سے ایک قومی ادبی سوسائٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ساہتیہ اکادمی کا باقاعدہ افتتاح حکومت ہند نے 12 مارچ 1954 کو کیا۔
- مولانا آزاد نے 18 اگست 1951 کو ایک ٹکنیکل ادارہ "آئی آئی ٹی، کھڑکپور" یعنی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنولوجی، کھڑکپور کا افتتاح کیا۔ کھڑکپور انسٹی ٹیوٹ مولانا آزاد کے کارناموں میں سے ایک عظیم کارنامہ ہے۔
- للت کلا اکادمی (نیشنل اکیڈمی آف آرٹ)، نئی دہلی کا افتتاح 5 اگست 1954 کو اس وقت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا اور 11 مارچ 1957 کو سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ 1860 کے تحت رجسٹرڈ ہوا۔
- سنگیت ناٹک اکادمی پرفارمنگ آرٹس کے شعبے میں ملک کا اعلیٰ ادارہ ہے، جس کا قیام مولانا آزاد کے عہد وزارت میں 1953 میں عمل میں آیا تھا۔ اکیڈمی کے قیام کا مقصد ہندوستان کی متنوع ثقافت کے وسیع غیر محسوس ورثے کا تحفظ اور فروغ تھا جس کا اظہار موسیقی، رقص اور تھیٹر کی شکلوں میں ہوتا ہے۔
- دہلی پبلک لائبریری کو یونیسکو پروجیکٹ کے طور پر سنہ 1951 میں حکومت ہند نے مولانا آزاد کی وزارت میں شروع کیا تھا۔ پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن کے سامنے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم محترم پنڈت جواہر لعل نہرو نے لائبریری کا افتتاح ایک چھوٹی لائبریری کے طور پر کیا تھا۔ آج اس کی تقریبا 36 شاخائیں ہیں۔
- مولانا ابوالکلام آزاد نے ان اداراوں کے علاوہ بھی بہت سے ادارے قائم کیے، جن میں سنٹرل بورڈ آپ آرکیالوجی، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، سکنڈری ایجوکیشن کمیشن، نیشنل آرٹ ٹریژرس فنڈ، نئی دہلی، سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، روڑکی، کاؤنسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ، نئی دہلی، نیشنل انسٹی ٹیوٹ، پلانی، نیشنل اکادمی آپ لیٹرز، نئی دہلی، انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن، جے پور، انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن، میسور سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن، دہلی، کلکتہ، کٹک وغیرہ شامل ہیں۔

16.4 کلیدی الفاظ

الفاظ : معنی

ضامن : ضمانت دینے والا

استعداد	:	صلاحیت، لیاقت
وسیع النظری	:	بلند خیالی
فی الفور	:	بروقت، فوراً
دور بیں	:	دوراندیش
افہام	:	فہم کی جمع، سمجھنا
اہداف	:	ہدف کی جمع، نشانہ
نوبت	:	حالت کیفیت
خود مختار	:	اپنے عمل پر قادر، بااختیار
متاخر	:	پیچھے آنے والے، آخر کے زمانے کا
مجتہد	:	کوشش کرنے والا
متمدن	:	تمدن سے واقف

16.5 نمونۂ امتحانی سوالات

16.5.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد نے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کا افتتاح کب کیا؟
2. یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو ایک باقاعدہ قانونی ادارہ کب تسلیم کیا گیا؟
3. ساہتیہ اکادمی کا باقاعدہ افتتاح کب عمل میں آیا؟
4. انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے صدر کون تھے؟
5. آئی آئی ٹی، کھڑکپور کا پہلا سیشن کس سنہ میں شروع ہوا؟
6. پنڈت جواہر لعل نہرو نے آئی آئی ٹی کھڑکپور کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد کب رکھا؟
7. للت کلا اکادمی کا قیام کب عمل میں آیا؟
8. سنگیت ناٹک اکادمی کس نے قائم کی؟
9. دہلی پبلک لائبریری کس کے عہد وزارت میں شروع کیا گیا تھا؟
10. دہلی پبلک لائبریری کا افتتاح کس نے کیا تھا؟

16.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. "للت کلا اکادمی" کے پروگراموں پر نوٹ لکھیے۔
2. "انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز" کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔
3. "انڈین اکیڈمی آف ڈانس، ڈراما، میوزک" کا تعارف پیش کیجیے۔
4. "آئی آئی ٹی، کھڑگ پور" کی خصوصیات بیان کیجیے۔
5. "آئی آئی ٹی، کھڑکپور" کے بارے میں مختصراً لکھیے۔

16.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مولانا آزاد کے قائم کردہ اداروں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے۔
2. یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کے جملہ کارکردگی پر نوٹ لکھیے۔
3. ساہتیہ اکادمی کے قیام اور اس کے مقاصد پر مضمون قلم بند کیجیے۔

16.6 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. جدید ہندوستان کے معمار: ابوالکلام آزاد	عرش ملسیانی
2. ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات	محمد عبدالرزاق فاروقی
3. آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی	عبدالرزق ملیح آبادی
4. آثار ابوالکلام آزاد	قاضی عبدالغفار
5. مولانا ابوالکلام آزاد فکر و فن	ملک زادہ منظور احمد

نمونۂ امتحانی پرچہ

نشانات:۷۰ Marks : 70 وقت:3 گھنٹے Time: 3hours

ہدایات:

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہیں۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں، جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ پُر کرنا / مختصر جواب والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہیں۔ (10x1=10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں آٹھ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال:1

(i) مولانا ابوالکلام آزاد کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

(a) 1888 (b) 1890 (c) 1892 (d) 1894

(ii) مولانا ابوالکلام آزاد کے والد کا کیا نام تھا؟

(a) شاہ محمد افضل (b) مولانا خیر الدین (c) شیخ جمال الدین (d) شیخ محمد

(iii) مولانا آزاد کی تصنیف کردہ کتاب "تذکرہ" کا موضوع کیا ہے؟

(a) فکشن (b) شاعری (c) خودنوشت سوانح (d) تاریخ

(iv) مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے؟

(a) نو (b) سات (c) پانچ (d) تین

(v) ساہتیہ اکادمی کا قیام کب عمل میں آیا؟

(a) 1954 (b) 1952 (c) 1950 (d) 1948

(vii) "الہلال" کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا؟

(a) 14 نومبر 1913 (b) 13 جولائی 1912 (c) 20 دسمبر 1915 (d) 18 جنوری 1916

(vii) "غبار خاطر" کیا ہے؟

(a) افسانوں کا مجموعہ (b) غزلوں کا مجموعہ (c) خطوط کا مجموعہ (d) مضامین کا مجموعہ

(viii) "کلیات آزاد" کو کس نے مرتب کیا؟

(a) مالک رام (b) رشید الدین خاں (c) خلیق انجم (d) ڈاکٹر ابو سلمان

(ix) مولانا آزاد کو بھارت رتن کے اعزاز سے کب نوازا گیا؟

(a) 1992 (b) 1986 (c) 1980 (d) 1958

(x) مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال کہاں ہوا؟

(a) لکھنؤ (b) دہلی (c) کلکتہ (d) ممبئی

حصہ دوم

2۔ مولانا آزاد کی ابتدائی زندگی پر روشنی ڈالیے۔

3۔ مولانا آزاد کے عہد کے ادبی ماحول کو اختصار سے لکھیے۔

4۔ مولانا آزاد کے تصور سیاست اور مذہب پر تبصرہ کیجیے۔

5۔ تفسیر ترجمان القرآن کی خصوصیات بیان کیجیے۔

6۔ فن مصوری کے بارے میں مولانا آزاد کا کیا خیال ہے؟ بیان کیجیے۔

7۔ غبارِ خاطر پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اسلوب کو واضح کیجیے۔

8۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی شاعری کے رنگ و آہنگ کی وضاحت کیجیے۔

9۔ قولِ فیصل پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

حصہ سوم

10۔ مولانا آزاد کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

11۔ مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات کی وضاحت کیجیے۔

12۔ الہلال کی صحافتی اہمیت پر نظر ڈالتے ہوئے ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔

13۔ مولانا آزاد کے متحدہ قومیت کے تصور پر اظہار خیال کیجیے۔

14۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا آزاد کے کاموں کا جائزہ لیجیے۔